(س)

۱۳۲- سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	./
۱۳۳- سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	./
۱۳۴- سلک گہر	سیّد احتشام حسین	./
۱۳۵- ساحل و سمندر	" "	/۵۰
۱۳۶- سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	علی عباس حسینی	۱/۵۰
۱۳۷- سرمایۂ زبان اردو	جلال لکھنوی	۳/۵۰
۱۳۸- سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	۵/۰
۱۳۹- سفر حجاز	عبد الماجد دریابادی	۵/۰
۱۴۰- سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۱۴۱- سیاحت زمین (ناول)	محمود اعظم فہمی	۱/۰
۱۴۲- سید سالار مسعود غازیؒ	چشتی محمود آبادی	۲/۵۰
۱۴۳- ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۲/۵۰
۱۴۴- سہرا حلقہ	" "	۰/۵۰
۱۴۵- سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴۶- سوشل اسٹڈی	احمد محسن کاکوروی	۰/۷۵

(ش)

۱۴۷- شعر نو (جدید تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۰
۱۴۸- شبلی نعمانی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴۹- شرح دیوان غالب (جدید اڈیشن)	نظم طباطبائی	۴/۵۰

۱۸۶	گلدستہ فارسی اول و دوم		۱/۵۶
۱۸۷	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید		۰/۳۷
۱۸۸	گلہائے ادب	عبدالاحد خان خلیل	۲/۰
۱۸۹	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰
	(ل)		
۱۹۰	لوائح جامی مع مقدمہ	عبدالاحد خان خلیل	۱/۲۵
۱۹۱	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۹/۰
۱۹۲	لب بام	عادل رشید	۵/۰
۱۹۳	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۲/۰
	(م)		
۱۹۴	مضامین فرحت (حصہ اول)	مرزا فرحت اللہ بیگ	۲/۷۵
۱۹۵	مضامین فرحت (حصہ دوم)	" " "	۳/۰
۱۹۶	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۲/۰
۱۹۷	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۳/۵۰
۱۹۸	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۶/۰
۱۹۹	مجبور (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۰۰	مرزا رسوا کے تنقیدی	ڈاکٹر محمد حسن	۳/۵۰
۲۰۱	مضامین جدیدہ	محمد ہادی	۱/۲۵
۲۰۲	مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۰
۲۰۳	مطالعۂ شبلی	ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی	۴/۰
۲۰۴	مطائبات شبلی	جالب مظاہری	۲/۵۰

۲۲۴	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۰
۲۲۵	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۳/۰
۲۲۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۲۷	نور و نار (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۲۸	نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ)	آل احمد سرور	۵/۰
۲۲۹	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
۲۳۰	نیلم	انتصار حسین	۳/۰
۲۳۱	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالصمد خان خلیل	۳/۰

(ھ)

۲۳۲	ہمارا گاؤں (افسانے)	علی عباس حسینی	۳/۰
۲۳۳	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۳۴	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰
۲۳۵	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۳۶	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	" "	۱/۵۰

(ی)

۲۳۷	یاقوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۳۸	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۳/۰

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۔ امین آباد پارک لکھنؤ

ہے ترجمانِ مقصد پہ شمس اعلان کر رہا ہے — ترجمانِ مودتِ فروغِ اردو کا ساز و سامان کر رہا ہے
طلسمِ ادب ظلمتیں قدم قدم پہ شعورِ فطرت — نقش نقش کو حیاتِ نو کا لطیف عنوان کر رہا ہے

ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ

فروری ۱۹۵۵ء

مدیرِ اعزازی

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ایم اے، پی ایچ ڈی، (ڈی لٹ)

معاونین

امیر حسن نورانی — حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے

شجاعت علی سندیلوی ایم اے (ریسرچ اسکالر)

مینیجر و نگراں

محمد حسین شمسی علوی قاسمی کاکوروی

چندہ

سالانہ دو روپے — فی پرچہ چار آنے

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ

ہندستان میں
امین آباد پارک
لکھنؤ

پاکستان میں
مبارک بک ڈپو بندر روڈ ...
کراچی

اپنی باتیں

ادارہ

کاروانِ اردو تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مخلص حامیانِ اردو ٹھوس تعمیری کاموں میں منہمک ہیں۔ پُرجوش کارکنوں کی مسلسل جدوجہد کے نتائج خوشگوار نظر آ رہے ہیں۔ ماضی کے حالات کے مقابلہ میں حال کی کیفیات سے ہم اپنی امیدوں کو مستقبل میں زیادہ روشن اور شاندار دیکھ رہے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ منزل ابھی دور ہے اور ہمیں اسی رفتار سے آگے بڑھنا ہے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم جلد منزلِ مقصود تک پہونچ جائیں گے۔

گذشتہ ماہ گوہاٹی (آسام) میں کل ہند کانگریس کا ۶۳واں سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ اس میں "مظلوم زبان اردو" کا ذکرِ خیر بھی ہوا۔ ہندوستان کے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کھلے الفاظ میں کیا کہ اتر پردیش میں اردو کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ پنڈت جی یہی بات کئی بار کہہ چکے ہیں مگر عجیب معاملہ ہے کہ "الفاظ و کردار" میں تضاد کیوں ہے۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ۱۴ نومبر کو پنڈت جی

ترتیب

اپنی باتیں — ادارہ — ۳

بہادر شاہ ظفر کی دلّی — صالحہ عابد حسین — ۱۴

اردو داستانوں میں مناظر کشی — ایم حبیب خاں — ۱۵

دربارۂ فروغ اردو — نمائندہ فروغ اردو — ۱۹

غالب کی ترکیب عجز و ری الاظہار — اختر تلہری — ۲۴

نثر اکبر الہ آبادی — عبد القوی دسنوی — ۳۱

محفل شعر و ادب — نمائندہ محفل شعر و ادب — ۴۰

اُف یہ رد عمل — آفتاب اختر — ۴۵

ادبی خبریں — اقبال صدیقی — ٥٠

سید افتخار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو امین آباد لکھنؤ سے شائع کیا

اردو داستانوں میں مناظر کشی

ایم حبیب خاں

داستان گوئی دل بہلانے اور وقت کاٹنے کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے اس میں
حقیقت نگاری کم لفاظی زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم بقول غالب ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

فن اردو ادب میں بہت سی خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اردو داستانیں
قیمتی سرمایہ ہے۔ ان میں رنگینی۔ ظرافت اور دلچسپی کی جو چاشنی ہے وہ
کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ دلچسپی اور ظرافت خود ایک بہت بڑا فن ہے
فنی کارنامے میں دلچسپی کا وجود نہ ہو تو اس کا فقدان ادب میں بہت بڑا عیب
جاتا ہے۔

داستان گوئی اور غزل گوئی میں ذرا ہی ر ہے۔ وہی عشق و عاشقی کے
ے، قتل وغارت اور رقیبوں کی عداوتیں داستان میں ایک بڑے
نے پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح غزل گوئی میں منظر کشی اور نیچر کیطرف
توجہی برتی گئی وہ بدرجہ اتم داستانوں میں بھی موجود ہے۔ صبح کے متعلق
لوں میں زیادہ سے زیادہ صبح گاتی چلتی ہے یا وصال کی شب تاریکی ہجر کو دور
والی مرغ کی آذان۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی حال داستانوں میں ہے
طرح وہ کسی چیز کو بیان کرتے ہیں اس میں منظر کشی اور تکرار حد سے زیادہ

کی سالگرہ "یوم اطفال" کے نام سے منائی گئی تھی اور اس دن شب میں بچوں کے لیے ملک کی علاقائی زبانوں کی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئیں اور خود پنڈت جی کے مکان پر بھی یہ اجتماع ہوا تھا اس میں سب زبانوں کی ایک ایک کہانی سنائی گئی مگر اردو کو اس سے محروم رکھا گیا اور جب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو ہندی کے مشہور شاعر بچن صاحب نے جو بچوں کے پروگرام کے ذمہ دار تھے جواب دیا کہ "اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے" پنڈت جی سے ہماری مودبانہ التماس ہے کہ چراغ تلے اندھیرا کیوں ہے؟ گوہاٹی کے اجلاس میں مشرقی پنجاب کے واحد مسلمان ممبر اسمبلی عبد الغفار خاں نے جس بیباکی اور صفائی کے ساتھ اردو کی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھائی وہ قابل فخر ہے اور ہم ان کی حق گوئی پر ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ماہ رواں کی ۵ تا ۷ تاریخ کو انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام دہلی میں ایک عظیم الشان کل ہند کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں سارے ہندوستان کے حامیان اردو کے نمائندے جمع ہوں گے یہ ایک اہم اور تاریخی کانفرنس ہوگی۔ اس میں اب تک جو کچھ ہو چکا اس کا جائزہ لے کر آئندہ کے لئے لائحہ عمل بنایا جائے گا۔ ادارہ فروغ اردو کی نیک خواہشات اس کانفرنس کے ساتھ ہیں۔ اور کارکنان ادارہ انجمن کے ذمہ داروں کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔

فلک زرجدی چرخ زرجدی دنیلوفری سے نیچے قدم نہیں رکھتا۔ سورج کو ہمیشہ شہنشاہ یا پہلوان سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کے باوجود چند خوبیاں موجود ہیں۔ لیلی شب نے برقع سیاہ چہرے پر ڈالا۔ تشبیہ کو بخوبی ادا کرنے کی وجہ سے کچھ گھن لگ گیا ہے۔ اسی طرح "ساحر شب گرد ماہتاب" حسین استعارہ ہے مگر قلعہ مغرب نے سارے مطلب کو خبط کر دیا۔ جہاں تک بقیہ منظر کشی کا تعلق ہے وہ بے کار ہے۔ قتل کی صبح ہے تو سورج جلاد ہے جس شخص کو سورج نکلنے پر موت کا حکم ہوا ہے سورج اور جلاد میں کم فرق محسوس ہوگا۔ مگر اس چیز کو بیان کرنے کا انداز ہوتا ہے یہ نہیں کہ جلاد فلک تیغ حمائل کر کے افق پر آ کودا۔ اس قسم کی تشبیہیں بہت ہی فراواں اور آسان ہیں ان کو ہر شخص لکھ سکتا ہے۔ عیار کی آمد ہے تو صبح کو لکھا کہ عیار زریں پوش کمند ہائے شعاع سے کر میدان زرجدی میں آیا یا نقابدار زریں نے اسپ شعاع میدان جنگ میں مینر کیا یا ساحر زریں پوش نے سحر نورانی کیا۔ اس میں کوئی تخیلی کارنامہ نہیں۔

یہ سب مثالیں احمد حسین قمر کی داستان "طلسم تاریخ" میں سے لی گئی ہیں۔ جنھوں نے "ہوشربا" کے شروع کے چار حصے تصنیف کئے وہ ندرت زبان میں مدرجہ کمال رکھتے ہیں۔ ان کے منظر جا ہے وہ کسی چیز کے متعلق کیوں نہ ہوں زیادہ شگفتہ اور موزوں ہیں۔

اور تحریر بالکل بے اثر ہوتی ہے۔ یہاں پر میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

"ناگاہ جلاد زریں پوش تیغہ مہر ہاتھ میں لے کر میدان چرخ زبرجدی پر آیا" (قتل کی صبح)

"پہلوان زریں پوش نے سلاح جنگ ذات پر آراستہ کر کے نیزہ خطوط شعاعی ہاتھ میں لیا اور تیغہ مہر کو حائل کر کے اکھاڑے میں چرخ زبرجدی کے آیا" (صبح کشتی سے پہلے)

"پہلوان زریں پوش اکھاڑے میں مغرب کے گیا۔ اور شہنشاہ ماہ تاباں مع فوج ثوابت و سیارگان سپہر نیلگوں پر آ کے جلوہ فرما ہوا" (شام کشتی کے بعد)

"سپیدی سحری چمکا اور شہنشاہ انجم سیاہ خلوت سرائے مغرب میں گیا اور آفتاب تاباں فلک زبرجدی پر آیا۔"

"ساحر شب گرد ماہتاب گردش کر کے داخل قلعہ مغرب ہوا۔ اور شہنشاہ زریں پوش مع فوج ضیا و شعاع چرخ زبرجدی پر آیا"

"لیلی شب نے برقع سیاہ چہرے پر ڈالا"

"قیدی زندان مغرب زنجیر ہائے شعاع میں جکڑا ہوا فلک نیلوفری پر آیا"

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ مصنف کو صبح سے کوئی غرض نہیں وہ اس کا کوئی حقیقی منظر کھینچنا نہیں چاہتا اسے صرف اتنا کہنا ہے کہ چاند غروب ہوا اور سورج طلوع ہوا یا سورج غروب ہوا اور چاند مع تاروں کے طلوع ہوا۔ اس تکرار مسلسل پر حسن بیان کا پردہ ڈالا جاتا ہے وہ ناقص ہی سہی مگر پردہ ضرور ہے آسمان کو آسمان یا آکاش لکھنا آسان پسندی تھی یا نشان شکست تھا۔ چنانچہ داستان گو

۔ربارفروغ اردو

ـــ ملک کے مشہور انقلابی شاعر حضرت انور صابری صاحب
نے اپنے لکھنؤ کے دورِ قیام میں ادارۂ فروغ اردو کا جائزہ لینے کے
بد ایک نظم کہی جو ہدیہ ناظرین ہے۔

ہے۔ شمسِ عمل دکارِ فروغِ اردو — لکھنؤ مطلعِ انوارِ فروغ اردو
نبضِ نورالحسن ہاشمی سے چار طرف — نظر آنے لگے آثارِ فروغ اردو
خانِ محبوب کے دل میں ہو شجاعت کا وہ رنگ — فتح ہو جائے گی یلغارِ فروغ اردو
رخِ عرفان ہے نورانی خورشیدِ ادب — با ہمہ جلوۂ دیدارِ فروغ اردو
عرشِ احساس پہ ہے نیرِ اقبالِ رضی — دیکھیے منزلِ افکارِ فروغ اردو
غم کم منفعتِ عام کا جذبہ زاید — ہے یہی خوبیٔ کردارِ فروغ اردو

مجھکو اردو کی بقا کی نہیں اب فکر کوئی
عام ہے حلقۂ دربارِ فروغ اردو

۔ محمد حسین شمس علوی۔ ۲۔ مولوی انوار الحسن صاحب مرحوم ۳۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۔ خان محبوب طرزی۔ ۵۔ شجاعت علی سندیلوی۔ ۶۔ عرفان لکھنوی۔
۔ امیر حسن نورانی۔ ۸۔ اقبال صدیقی۔ ۹۔ رضی احمد۔

اس غزل کے بعد مولانا نے کئی غزلیں سنائیں جن کے منتخب اشعار ہدیہ ناظرین ہیں ۔

اللہ رے وہ سجدہ مجبور محبت   اب تک در و دیوار حرم جھوم رہے ہیں

خلش غم فغاں تک آ پہونچی   بات دل کی زباں تک آ پہونچی
اہل گلشن سے تنگ آ کے بہار   انتظار خزاں تک آ پہونچی

اے بے خبران رنگ چمن تزئین گلستاں کی خاطر
شاخوں کا گلوں کی ذکر ہی کیا کانٹوں کو سجانا پڑتا ہے

فیضان چمن کے جلوؤں کو تا حد نظر محدود نہ کر
خوشبوئے چمن کو گلشن سے باہر بھی نکلنا پڑتا ہے

جمہور کے خدمتگاروں کو یہ راز حقیقت سمجھا دو
پروانے کے جلنے سے پہلے خود شمع کو جلنا پڑتا ہے

محبت کے بغیر انسان یہ ایں تصویر پاکیزہ
فرشتہ ہو تو سکتا ہے مگر انساں نہیں ہوتا

نکر گلشن سے ہیں خود صاحب گلشن بیزار
اور کس چیز کو کہتے ہیں خزاں اے ساقی

اپنے مٹنے کی ہمیں کچھ نہیں پرواہ لیکن!
تو نے سوچا بھی ہے کچھ اپنا بھی زیاں اے ساقی

ایک دلنواز ادبی نشست

اقبال صدیقی

یکم جنوری کو ادارہ فروغ اردو میں سال نو کی رسم آغاز ایک خوشگوار ادبی نشست سے ہوئی جس میں حاضرین با اعتبار تعداد مخصوص تھے۔ چائے کے لطیف دور کے بعد میزبان کی دعوت پر حضرت انور صابری۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور عبداللہ خاطر نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اس موقع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لکچرار جناب نسیم قریشی خان محبوب طرزی۔ شفاعت علی۔ شجاعت علی سندیلوی۔ ناظر کاکوروی اور چودھری نفیس احمد وکیل۔ مولوی محمد حسین شمس علوی منیجنگ ڈائرکٹر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سامعین بھی قابل ذکر ہیں۔

شمس صاحب نے علامہ انور صابری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کہئے صابری صاحب سال نو پر کیا خیال ہے؟" اس پر علامہ انور صابری نے جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

زندگی کے حسین بہانے سے
موت الجھی رہی زمانے سے

ذہنوں پر ابھی "موت الجھی رہی زمانہ سے" کا مصرعہ اپنا اثر محفوظ کر رہا تھا کہ دوسرے شعر پر بھی واہ واہ کی گونج اٹھی

رشک جنت چمن نہیں بنتا — چند کلیوں کے مسکرانے سے

تیری پندار کہ ناز سے یکتائے جمال — جو بھی گزرا ہے وہ بے نام و نشاں گزرا
اپنے مرکز پہ جب آئی ہے مری مستیٔ شوق — بچ کے نظروں سے میری پیر مغاں گزرا ہے

نئی بہارِ چمن جو نہ بن سکی مرہم ! — حیات آج بھی ہے زخم سینۂ آدم
مزاجِ گردشِ سفر بھی نہ پا سکا اب تک — وہ کارواں جو ہے خضر کا مریضِ ستم
پلائے ہیں وہ رندوں کو بادۂ عصیاں — عطا ہوئی جنھیں تقدیر کوثر و زمزم
سمجھنے لگا ہے برہمن کی تب فروشی کا — حرم میں بھی نظر آتے ہیں تاجرانِ حرم

بنے تھے راہ محبت میں ہمسفر لاکھوں — تری تلاش میں تجھ تک فقط ہمیں پہونچے

مولانا انور صابری کی فرمائش پر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے بھی ایک غزل کے دو شعر سنائے۔

ہے انسانیت کی رسائی کہاں تک ! — اگر آدمی ہو تو جانے !

عبدالاحد خاں خلیل نے زندگی کی تصویر کشی کس نئے انداز میں کی ملاحظہ ہو

کسی صورت سے ساقی کی طرف مائل نہیں ہوتی
میری تشنہ لبی تسکین کی قائل نہیں ہوتی

حاضرین کی فرمائش پر پھر انور صابری نے دو شعر سنائے۔

کفن بدوش ملا ہی نہیں کوئی اب تک — زمینِ عشق کو کب سے ہے انتظارِ شہید
غمِ حسین بجا یہ سوال پھر بھی ہے — کریگا کون جوابِ حسین کی تائید

ل صحیح ہے کیونکہ لفظ ضروری عربی ہے اسے ہندیتا تا زبردستی کی بات
ہے۔

یہ سچ ہے کہ صراح وقاموس میں "لفظ ضروری" اس شکل وصورت میں
ید نہیں ہے "ضرورت" حاجت کے معنی میں ضرور درج ہے مگر صراح اور
دس میں "ضروری" کے درج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ "ضروری" سے
ی زبان روشناس ہی نہ ہو۔ عربی کی منطق اور فلسفہ کی کتابوں میں اس لفظ کا
ال خاصا موجود ہے۔

چند مثالیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

علامہ تفتازانی علوم عربیہ کے مشہور ومستند عالم تھے۔ مختصر معانی
مطول علم معانی وبیان وبدیع میں ان کی معرکۃ آرا مشہور نصابی کتابیں
ں انھوں نے منطق کے رسالۂ شمسیہ کی شرح "سعدیہ" کے نام سے
ی ہے اس میں لفظ "ضروری" مختلف مقامات پر نظروں کے سامنے آتا ہے
ب جگہ فرماتے ہیں "یکفی فی مجرد بیان الحاجۃ تقسیم العلم الی الضروری
لنظری" دوسری جگہ چند جملوں میں "ضروری" کا استعمال بار بار کیا گیا
ے "یرادفہ الضروری و قد یراد بہ ما لا یحتاج بعد توجہ العقل الی شئی
ملا فیکون اخص من الضروری وتفسیر الضروری والنظری بما ذکرت"
د جملوں کے بعد یہ جملہ ملتا ہے "فسر المتاخرون التصدیق الضروری الخ"
و تین صفحوں کے بعد پھر ایک مقام پر لفظ ضروری کو چار پانچ مرتبہ
ستعمال کیا گیا ہے۔

غالب کی ترکیب "ضروری الاظہار"

سید اختر علی تلہری

غالب کا ایک قطعہ ہے جس کا آغاز یوں ہوا ہے

اے شہنشاہ آسماں اورنگ !
اے جہاندار آفتاب آثار !

اس قطعہ میں ایک شعر یہ بھی ملتا ہے۔

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

جناب نظم طباطبائی مرحوم نے "ضروری الاظہار" کی ترکیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ اظہار فرمایا ہے۔

"لفظ "ضروری" ان معنی پر عربی میں ہی نہیں۔ ایسے الفاظ جہلا پر ہونے کا حکم ہے اور ترکیب عربی میں لا تا ضع ہے اور اہل ادب احتراز کرتے ہیں۔

صاحب نور اللغات نے بھی اس ترکیب کو غلط قرار دیا ہے۔ غالباً ان کا بھی یہی خیال ہے کہ لفظ ضروری عربی لفظ نہیں ہے آج کل کے بہت سے ادیب بھی "ضروری" کو ہند سمجھتے ہیں اور اس لئے "ضروری الاظہار" کی ترکیب کو غلط قرار دیتے ہیں لیکن جہاں تک میں کہتا ہوں "ضروری الاظہار" کی ترکیب

اما ابتداً اذ ولزمنا ادعاً لزوماً ضروریاً ۔ شاید کہا جائے کہ ان تمام مقامات پر ضروری اصطلاحی معنے میں استعمال کیا گیا ہے اس کے وہ معنی نہیں ہیں جس میں ہم استعمال کرتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کیونکہ ان اصطلاحات کی حیثیت منقول اصطلاحی کی ہے اس لئے ان الفاظ کو عربی زبان ہی سے معنوی مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے منطق و فلسفہ و کلام میں اصطلاحی طور سے نقل کر لیا گیا ہے۔ لیکن صورت حال تو یہ ہے کہ لفظ "ضروری" کا استعمال اصطلاحی استعمال سے ہٹ کر اس معنی میں بھی ہوا ہے جس میں اردو والے استعمال کرتے ہیں یہ اسی شرح مواقف میں ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے: ان اسناد الجائز الی الواجب امرٌ ضروری ۔ محقق عبد اللہ یزدی کی شرح تہذیب منطق میں مشہور درسی کتاب ہے اس میں "ضروری" کا استعمال خاصی تعداد میں موجود ہے۔ اس لفظ کے اصطلاحی استعمال کی مثالیں ترک کرتے ہوئے دو تین مثالیں اور درج کی جا رہی ہیں۔ اسی شرح تہذیب میں یہ عبارت ملتی ہے:

"اذا الحکم فی القضیۃ بان خلاف النسبۃ المذکورۃ فیہا لیس ضروریاً نحو قولنا زیدٌ کاتبٌ بالامکان العام یعنی ان الکتابۃ غیر مستحیلۃ لہ یعنی ان سلبہا عنہ لیس بضروری سمیت القضیۃ ممکنۃ" دوسری جگہ اسی کتاب میں یہ عبارت ہے۔

"اما فی الضروریۃ فلان المحمول اذا کان ضروریاً للذات

محب اللہ محقق بہاری منطق کے مشہور متن سلم العلوم میں ایک جگہ

"۔۔ التعقل النظری یستفاد من البعض الضروری بطریق ضروری من غیر احتیاج۔ الی قانون آخر۔ لا یقال البعض الضروری مع الطریق الضروری اذا کان کافیاً فی اکتساب البعض النظری کان کافیاً فی اکتساب سائر النظریات لعدم الفرق وحینئذ یلزم الاستغناء عن المنطق۔ الذی ہو جمیع طرق الاکتساب لانا نقول ان ارید بکونہ کافیاً فی سائر النظریات انما تکتسب بمجردہ فہو لیس بلازم بجواز ان یکون بعضہا وارداً علی غیر الطریق الضروری وان ارید بذلک ان ما کان وارداً علی البعض الضروری الخ۔"

علامہ تفتازانی نے اس کے علاوہ بھی بیشتر مقامات پر بلا تکلف لفظ "ضروری" استعمال فرمایا ہے۔

علامہ تفتازانی کے جلیل القدر معاصر سید شریف نے قطبی کے حاشیے میں لفظ ضروری اسی بے تکلفی سے استعمال فرمایا ہے۔ ایک مثال کافی ہے۔

"فلو لم یقسم العلم اولاً الی التصور والتصدیق ولم یبین ان فی کل منہا ضروریاً ونظریاً یمکن اکتسابہ من الضروری لجاز ان یکون التصورات مثلاً باسرہا ضروریۃ۔" شرح مواقف سید شریف کی ایک مشہور ومتداول کتاب علم کلام میں ہے اس میں بھی لفظ ضروری بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ ایک مقام کی عبارت درج کی جا رہی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ سید شریف سے بہت پہلے بھی یہ لفظ مستعمل تھا جبھی تو امام رازی سے متبحر عالم نے اسے استعمال کیا ہے۔

" قال الامام الرازی فی المحصل العلوم کلہا ضروریۃ لانہا اما ضروریۃ

محل نظر قرار دیا تو اور زیادہ محل حیرت ہے۔

بدیہی الانتاج۔ جدید الفکر۔ صائب الرائے۔ طویل الباع وغیرہ مرکبات اضافی کثرت سے رائج ہیں۔ یہی صورت ضروری الاظہار کی ہے۔

اس قدر لکھنے کے بعد عربی کے مشہور و متداول لغت المنجد دیکھنے کا موقع مل گیا اس میں لفظ "ضروری" مندرج ہے اس کے معنی یہ لکھے ہیں

" الضروری ما تدعو الیہ الحاجۃ دعاً قویاً ـــ ما کرہ علیہ الانسان۔ ماسلب فیہ الاختیار للفعل و الترک۔

جس چیز کی احتیاج بہت شدید اور قوی ہو۔

جس چیز پر انسان مجبور کیا جائے جس میں فعل اور ترک کا اختیار سلب کر لیا جائے۔

منجد کی سند کے بعد تو اس لفظ کے عربی ہونے میں کسی خفیف شک کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ فقط

لکھتے ہیں۔" ولو تحقق بثبوت الذاتیات فانہ ضروری للذات " دوسری جگہ اسی
کتاب میں یہ عبارت ہے۔

" ان احد النقیضین اذا کان ممتنعاً کان النقیض الآخر ضروریاً " منطق
کی مشہور درسی کتاب حمد اللہ میں " ضروری " کا استعمال اردو کے مروجہ معنی میں
متعدد مقامات پر موجود ہے مثال کی طور پر چند عبارتیں درج کی جارہی ہیں۔

(۱) " و کون المتعلق بھذا التعلق امراً مستقلاً لیس ضروریاً ولا مبرھنا
علیہ "

(۲) " والمقدمۃ الاولیٰ اعنی ان النسبۃ لاتتصور الا بین اثنین وان
کان ضروریاً "

(۳) قال الفاضل السہوری ان توجہ الاشکال ہو ان زیداً لیصدق
علیہ الوجود بالامکان الخاص المنطقی اذ لیس الوجود ضروری الثبوت "

(۴) لو سلم ان الانتقاء من الجانبین ضروری "

مندرجہ بالا مثالوں سے اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ لفظ
" ضروری " عربی کی کتابوں میں وہ منطق وغیرہ ہی کی سہی خاصی کثرت سے استعمال
ہوا ہے تو پھر اس کے عربی لفظ ہونے میں شک کی گنجائش ہی کیا رہتی ہے ایسی
صورت میں غالب نے مدعائے ضروری الاظہار استعمال کر دیا تو کسی قاعدے
کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ضروری بھی عربی اور اظہار بھی عربی۔ مضاف الیہ
پر الف لام کا اضافہ بھی نحوی نقطۂ نظر سے صحیح اور درست ہے۔

دونوں لفظوں کو عربی لفظ مان لینے کے بعد بھی اضافت کو شکوک اور

ذکر اکبرؒ الہ آبادی

حکیم عبدالقوی دریابادی بی، اے

جون ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں اپنے دانتوں کے درد کا ذکر اس دلچسپ نقرہ
یہ فرماتے ہیں :-

"سخن سازی سے قطع نظر، منجن بازی کر رہا ہوں"

کے معاً بعد اپنی اصل دل کی اور عقیدہ کی بات کہہ ڈالی :-

"اللہ اس عقیدہ کو خوش رکھے کہ تکلیف سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ میری جمع پونجی تو یہی ہے"

توحید پر استقامت اور شرک کے ادنیٰ شبہ سے احتراز اور احتیاط، اکبر کی ... میں داخل تھا، خطوط میں بھی اس کے نمونے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"آپ کا ساتھ اگر ہو تو مجھ کو دنیا میں جو راحت ممکن ہے انشاء اللہ وہ مل جائے۔ دلی انتشار میں بہت کمی ہو، زیادہ دعا اس ڈر سے نہیں کرتا کہ شرک نہ متصور ہو، لہٰذا صرف اللہ ہی اللہ ہے"

سچے مسلمان اور مردم شماری کے مسلمانوں کا فرق، حضرت اکبر نے اپنے خط میں ایک شعر کے دو مصرعوں میں ظاہر کر دیا ہے ؎

مسلماں تو وہ ہے جو ہے مسلماں علم باری میں
کروڑوں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں

... جگہ اپنی حالت کا سچا نقشہ کھینچتے ہیں :-

"دل شکستہ ہوں، صرف آخرت کا امیدوار ہوں، عبرت اور

خان محبوب طرزی

کا تازہ ترین معاشرتی ناول

امین آباد لکھنؤ

دورِ حاضرہ کے سماج پر ایک دلچسپ طنز اور امین آباد لکھنؤ کی رنگینیوں اور چہل پہل کا ایک ایسا خاکہ ہے جو صاحبِ ذوق سے خراج تحسین حاصل کرے گا

امین آباد

ایک تعلیم یافتہ جفاکش نوجوان کی دلچسپ رومانی داستان زبان کے چٹخارے نے ناول میں چار چاند لگا دیے ہیں

قیمت فی جلد ہے

شائع کردہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

باگ اپنے ہاتھ میں ہوگی لیکن اب تو شاید شکست بدست ہوں،
زیادہ صحیح ہو۔"

اکبر پیشہ ور شعراء کی طرح ہرگز اس کے عادی نہ تھے کہ خواہ مخواہ ہر مخاطب
ا اپنے اشعار وقت ہو یا نہ ہو سنانے لگیں۔ لیکن ساتھ ہی طبیعت میں بخل نہ تھا۔
بسے اہل قدرداں سمجھتے تھے بلا اس کی فرمائش کے اس کے انداز طبع کا خیال کرکے
پنے نتائج فکر سے بکمال بے تکلفی اسے آگاہ کردیتے۔ خطوط میں ایسی مثالیں متعدد ہیں
یک جگہ فرماتے ہیں:۔

"کل دوپہر کو میں نے چند شعر کہے۔ کہے کیا بے اختیار ذہن میں
داخل ہو کر زبان پر آگئے ؎

صبح کو کہتا ہوں، دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن
شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ
عرصۂ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

یک اور مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

دامن گل پھیل کر اس باغ سے کیا لے گئے
ہو گئے نذر خزاں اور داغ حسرت دے گئے

یک اور خط میں رقمطراز ہیں ؎

"میں نے حال ہی میں ایک غزل کہی ہے۔
دو شعر یہ ہیں" ؎

فنا کی باتیں پسند ہیں۔ تکلیفوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ عیش و نمود کا طلبگار نہیں ہوں۔ ایسا آدمی نئی اصطلاحوں اور عقائد کی رُو سے دشمن ملک و قوم ہے ؎

نظروں سے گر گئے سب جو کل تھے پیر جائی
اندھیر کر رہے ہیں، روشن ضمیر بھائی"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی پر اس دور میں (یہ خط فروری ۱۹۱۶ء کا ہے) فلسفیت کا غلبہ تھا اور ان کے خلاف دکن کے بعض اخبارات نے فتویٰ شائع کئے تھے۔ حضرت اکبر ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ماجد میاں کے باب میں آپ کے خیال سے مجھ کو اتفاق ہے ماجد کے اس کہنے پر کہ میں خدا کو نہیں جانتا اتنا غصہ نہیں آتا جتنا غیر ماجد کے کہنے پر غصہ آتا ہے کہ میں آپ سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ میں خدا کو جانتا ہوں لیکن مانتا نہیں، ادھر بھولا پن ہے، ادھر خیرہ سری"

ایک خط میں یہ شعر قابل ملاحظہ ہے:۔

اجل آ پہنچی قبل اس کے کہ سمجھیں راز ہستی کا
بگاڑا موت نے اور یہ نہیں سمجھے بنے کیوں تھے

ایک جگہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محاورہ کی تبدیلی کا شکوہ کس دلچسپ انداز میں دیا ہے:۔

"پا بہ رکاب ہوں کیا پیارا محاورہ ہے۔ ابھی گھوڑے پر سوار ہوتے

ایذا کا مجھے حس ہی نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت تہ خنجر جا نکلا آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے

انتقال سے کئی سال قبل ۱۹۱۶ء میں دنیا سے اس قدر متنفر اور بے تعلق ہو گئے تھے کہ ایک خط میں فرماتے ہیں :-

"میرا حال یہ ہے کہ جہاں تک دنیاوی زندگی کا تعلق ہے :-

جان مردہ ہے بدن افسردہ ہے مانند خاک
میں رہا ہوں گا کبھی لیکن اب اپنی قبر ہوں

داد اور تعریف کے موقع پر بھی نصیحت کو نہیں بھولتے اور نصیحت میں خدا کی یاد دلانے والے کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں :-

"آپ کی تقریروں کی دھوم ہے۔ مبارک ہو ..... ہاں تحریر کا بانکپن یہ ندوے یا یونی ورسٹی سے نہیں آیا۔ مسجد سے بھی نہیں۔ دل سے نکلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اردو زبان آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کو اللہ میاں آتے ہیں، وہی پر تو ہے بہرحال اسی سے لو لگائے رکھیے دنیا کے دن اور اس کی قیدیں کے دن

۱۹۱۷ء کے ایک خط میں ذیل کے اشعار اکبر صاحب کے مرقوم ملتے ہیں :-

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب وہی بحث رنج و راحت کی — یہ فقط وقت کا گزرنا ہے
سب سے بدتر تو لالچ ہے امید — سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے

(باقی آئندہ)

صورت فانی سے آخر کیوں یہ پہچانے گئے
مجھکو حیرت ہے کہ یہ بت کیوں خدا مانے گئے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہمکو لوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے

لکھنؤ پہنچکر اور وہاں کے بارونق بازار امین آباد میں قیام فرماکر ایک بار یہ شعر برجستہ زبان پہ آیا فوراً خط میں تحریر فرما دیا:

امین آباد میں کھولی کمر لیکن زباں چپ ہے
سفر کا بار دوش اترا ہے، بار دل نہیں اترا

حضرت اکبر سوسائٹی سے آخر زمانہ میں بیزار ہو گئے تھے۔ وجہ کی تصریح ان کے ایک مکتوب میں یہ موجود ہے۔

"بہت لوگ ایسے ملتے ہیں کہ بڑا دعویٰ عرفان الٰہی اور عشق حقیقی کا لیکن بعد تجربہ کے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف دنیا طلبی اور پالیٹکس کا مذاق رکھتے ہیں ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

بظاہر تھا براق راہ عرفاں
چو دم برداشتم لیڈر بر آمد

ایک خط میں حضرت اکبر نے اپنے یہ دو معرکہ آرا اشعار تحریر فرمائے ہیں۔

دنیا کے تغیر کا نہیں حسن شیدائے جمال باری کو
پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگ محفل سے

محفلِ شعر و ادب

بزمِ شعراء کا بارہواں کامیاب مشاعرہ اس ماہ پنڈت آنند نرائن مُلّا کے دولت کدہ پر ۱۲ر جنوری ۱۹۵۸ء کو ۱۲ بجے دن میں منعقد ہوا۔

شعراء کی طبع آزمائی کے لیے ذیل کی دو طرحیں تھیں۔

۱. وہ جوئے خوں جسے جانِ بہار کر نہ سکے

۲. اتنی ارزاں مئے گلفام نہ تھی۔

بیشتر شعراء نے پہلی طرح میں غزلیں پڑھیں، مجموعی طور پر یہ بزم مشاعرہ کامیاب رہی۔ خصوصیت کے ساتھ۔ ایس۔ این۔ سنہا، عمر انصاری، سروش طباطبائی، اثر لکھنوی اور آنند نرائن مُلّا کی طرحی غزلیں نہایت کامیاب رہیں۔

مشاعرے کا انتخاب درج ذیل ہے۔

نمائندہ شعر و ادب

اثر لکھنوی

تری خوشی دلِ حسرت شعار کر نہ سکے — شکستِ رنگ سے پیدا بہار کر نہ سکے
ترا خیال بھی تیری ہی طرح روٹھ گیا — انیس خلوتِ شبہائے تار کر نہ سکے
ستم ظریف نے اب یہ قرار دی ہے خطا — بقیدِ صبر و قرار انتظار کر نہ سکے
اچانک اٹھ گئی تیری طرف وہ شوخ نگاہ — دلِ نگار تجھے ہوشیار کر نہ سکے

۔۔بلڈپو دہلی اور دیگر اداروں کی تمام ناولیں ہم سے طلب فرمائیے

۔۔ت بھارتی

۔۔بہارا :- چار روپے
۔۔اہی :- دو روپے
۔۔کھ :- تین روپیہ آٹھ آنے
۔۔ٹ :- تین بارہ آنے (۱)
" :- تین آٹھ آنے (۲)
۔۔شاہ :- دو روپیہ چار آنہ

شوکت تھانوی

۔۔بقراط :- دو روپے
۔۔ولانا :- تین روپے
۔۔داماد :- دو روپیہ آٹھ آنہ
۔۔کتیا :- تین روپیہ آٹھ آنہ
۔۔سسرال :- دو روپے
۔۔بیگم صاحبہ :- تین روپیہ ۹۵ نئے پیسے
۔۔رخاطر :- چار روپے

کرشن چندر

۔۔ادن پتے :- پانچ روپیہ ۹۵ نئے پیسے

گدھے کی سرگزشت :- تین روپیہ ۹۵ نئے پیسے
دل کی وادیاں سو گئیں :- تین روپے
شکست :- "

نسیم حجازی

محمد بن قاسم :- پانچ روپے
شاہین :- چھ روپیہ آٹھ آنہ
داستان مجاہد :- چار روپے
معظم علی :- سات روپے
آخری چٹان :- چھ روپے

رئیس احمد جعفری

روسیاہ :- چار روپے
شکاری :- تین روپے
عورت :- چار روپے آٹھ آنہ
غدر :- چار روپیہ چار آنہ
عشق :- چھ روپے

اے، آر، خاتون

تصویر :- چار روپیہ آٹھ آنہ
شمع :- پانچ روپے
افشاں :- سات روپے
آسیہ :- پانچ روپیہ آٹھ آنے

عادل رشید

دو پھول :- تین روپیہ ۹۵ نئے پیسے
برباد آشیانے :- پانچ روپے
ڈوبتے سائے :- تین روپے
ساحل :- عشرت رحمانی ۵ نئے پیسے
بے غیرت :- مظفر ہاشمی ۵ نئے پیسے
پہلی لڑکی :- رازداں ۶
ہزار راتیں :- شمس مظفر [illegible]
اندھیری راتیں :- رام سروپ ۹۵
تنہا جو بکھ گئی :- شوکت ہاشمی ۶
کرنیں ۔۔۔ ۳
ناظمہ کی آپ بیتی :- ایم اسلم ۳
ایک پیار ایک دھوکہ :- رام سروپ ۳
چھایا :- جیسا داس اختر ۳

ا نگاہ کا مارا کچھ اس طرح سویا — ہزار حشر اٹھے ہوشیار کر نہ سکے

انصاری

ار دیدۂ خونبار تیری عمر دراز — وہ کام کر کہ جو فصل بہار کر نہ سکے
نے سکی تمنا کے خواب کیا ہوں گے — سحر بھی آ کے جسے ہوشیار کر نہ سکے
تنی تیز بھی رفتار کاروان حیات — کہیں ٹھہر کے ترا انتظار کر نہ سکے

نواب افسر

نگاہ جو شعلہ ہے پھول بن جاتی — یہ اور بات کہ ہم انتظار کر نہ سکے
ل کو سلیقہ نہیں تھا کیا کیجئے — ستم کیا ستم خوشگوار کر نہ سکے
کچھ ایسے فریب خرد نے الجھا دے — جنوں کی راہ بھی ہم اختیار کر نہ سکے

عباس نقوی

ا میں صحن چمن لالہ زار کر نہ سکے — کہ خون دل سے بھی پیدا بہار کر نہ سکے
ے وعدۂ فردا کا تھا یقیں لیکن — وہ کل بھی آئے گا یہ اعتبار کر نہ سکے
نے رشتۂ خزاں دیدہ کا نہی غازہ — وہ جوئے خوں جسے جان بہار کر نہ سکے

ابن سنہا

و شامل رنگ بہار کر نہ سکے — تلافی ستم روزگار کر نہ سکے
ا کاش اسی منزل پہ رک گئی ہوتی — نگاہ لطف تو وہ بار بار کر نہ سکے
آں لب لعلین عبادت نہ تاب — نہ تھی مشیت پروردگار کر نہ سکے

احمد خاں خلیل

خودی میں خودی اختیار کر نہ سکے — ہم ان کو اہل جنوں میں شمار کر نہ سکے

سراج لکھنوی

چمن سنوار تو سکتے ہیں اے لہو کی ارزانی
مگر ہم اپنی خزاں کو بہار کر نہ سکے

چھلک نہ جائے کہیں نہ ہر شگوفے کے رگ رگ میں
وہ دل کا خون جسے صرف بہار کر نہ سکے

سراج شمع تمنا نے لو تو دی تھی !
بقدر شوق ہمیں انتظار کر نہ سکے

جسٹس آنند نرائن ملا

وہ چارۂ ستم روزگار کر نہ سکے
جو زندگی کو غم خوشگوار کر نہ سکے

نہ بڑھ کے چھین لیں مینا تو کیا کریں ساقی
جو تشنہ کام ترے انتظار کر نہ سکے

بشر ہے بندۂ الفت غلام جبر نہیں
جو اہل دل نے کیا تاجدار کر نہ سکے

شمس لکھنوی

نئی بہار کے خالق بھی ہائے ناکامی
جنہیں خار سے پیدا بہار کر نہ سکے

سکون نواز مجھے وہ سکون نہیں درکار
جسے قبول دل بے قرار کر نہ سکے

بلائیں تھیں سر مژگان خزاں میں جو شمعیں
ہم ان کو شامل جشن بہار کر نہ سکے

سید صدیق حسن

یہ آج بھی ہیں دیکھو راحتیں قرباں
وہ عہد جو کبھی تم استوار کر نہ سکے

لیے اشک بھی ہیں دامن ندامت میں
تمھارے قدموں پہ جن کو نثار کر نہ سکے

یا وہ غنچۂ دل گلفروش نصرت سے
بہار لوٹے جسے ہم کنار کر نہ سکے

سالک لکھنوی

چمن کے پھول قفس لالہ زار کر نہ سکے
خزاں نصیب فراہم بہار کر نہ سکے

تھا آپ کا وعدہ بہ اعتبار خیال
درست ہو کہ ہمیں انتظار کر نہ سکے

اسیر ہو گئی تمیزِ خار و گل میں نگاہ — کچھ احترام جمالِ بہار کر نہ سکے

امتیاز ادیب

کہاں پہنچ گئے وحشی مگر اہلِ خرد — ہنوز فیصلہ رہ گذار کر نہ سکے
نگاہِ ناز کا عالم ارے معاذ اللہ — شکایتِ ستم روزگار کر نہ سکے
جنوں کی ان کو ضرورت ہوئی محبت میں — بقدرِ ہوش جو سب کچھ نثار کر نہ سکے

معراج لکھنوی

حیاتِ غم میری ناپائدار کر نہ سکے — بیدِ خزاں تھی جسے ہم بہار کر نہ سکے
جہانِ امن میں ایک یادگار بن کے رہے — وہ زورِ دست جو دشمن پہ وار کر نہ سکے
حسین ہی سہی آسانیوں کی زیست مگر — وہ عشق کیا جو تمنائے دار کر نہ سکے

صائم صیدن پوری

ترے بغیر یقیں بہار کر نہ سکے — یہ جبر تھا جسے ہم اختیار کر نہ سکے
تارے ڈوب گئے پھر بھی دل یہ کہتا ہے — بقدرِ شوق ترا انتظار کر نہ سکے
حریفِ خندہ تو شبنم تو پھول کیا ہوتے — ترے لبوں سے ہنسی مستعار کر نہ سکے

مصور لکھنوی

صبح جب معتقدِ شام نہ تھی — مائلِ گردشِ ایام نہ تھی
زندگی تیرے غموں سے پہلے — اتنی شائستۂ آرام نہ تھی
مل گیا نقشِ قدم تو لیکن — جستجو لائقِ انجام نہ تھی

ہزار لکھنوی

ہے دھوپ چھاؤں زمانہ میں کفر و ایماں کی — بہت سے کام عبادت گذار کر نہ سکے

مآلِ سوزِ دروں ضبطِ گریۂ پیہم — جگر کا خون مگر آبدار کر نہ سکے
وہ نظم و ضبط سکھایا جو ہم نے عالم کو — کمال ہے کہ ہمیں اختیار کر نہ سکے

سروش عسکری طباطبائی

رخنہ زن گردشِ ایام نہ تھی — غم میں قیدِ سحر و شام نہ تھی
جام کا دور میں آنا تھا کہ بس — دور تھا گردشِ ایام نہ تھی
نگہِ ہوش ربا کے ہوتے — بے خودی موردِ الزام نہ تھی

سروش انادی

یہ اور شے ہے مشیت نہ ساتھ دے ورنہ — وہ کیا ہے جو نہ یہ مشتِ غبار کر نہ سکے
سلوک ایسے خزاں نے بھی کچھ کئے ہیں سروش — تمام عمر جو فصلِ بہار کر نہ سکے

سید حامد

ہو کو دل کے جو صرفِ بہار کر نہ سکے — علاجِ گردشِ لیل و نہار کر نہ سکے
خدا نہ کردہ گرے کوئی اپنی نظروں سے — نہ ہو کہ اپنا کوئی اعتبار کر نہ سکے
وہ حسرتیں ہوں کہ تارے ہوں جھلملاتے ہوئے — شبِ حیات کٹی اور شمار کر نہ سکے

شعور بریلوی

غمِ حیات کو سمجھا کئے امانتِ دوست — شکایتِ ستمِ روزگار کر نہ سکے
وہی ہے صاحبِ دل جو رہِ محبت میں — خودی کو وقفِ غمِ روزگار کر نہ سکے

مولانا عرشی لکھنوی

نظر سے دورِ خزاں کا غبار کر نہ سکے — بہار آئی تو سیرِ بہار کر نہ سکے
نہ اٹھ سکا غمِ جاناں کا بار بھی ان سے — جو کچھ علاجِ غمِ روزگار کر نہ سکے

کہاں ہم اور حریم جمالِ یار کہاں — نظر کو محرم نقش و نگار کر نہ سکے

امین سلونوی

علاج دردِ دلِ بیقرار کر نہ سکے — سلوک یہ بھی مرے غمگسار کر نہ سکے
امید وعدۂ فردا پہ اور ابھی جیتے — خود اپنے آپ پہ ہم اعتبار کر نہ سکے
مذاق اہل چمن نے قفس کو پھونک دیا — زباں سے اف بھی اسیر بہار کر نہ سکے

محسن عثمانی :-

یہ لطف اور کہاں کاروبار دل کے سوا — کہ بیقرار رہے بیقرار کر نہ سکے
وہ اس ادائے محبت کے ساتھ ملتے ہیں — جو ہم کہیں تو کوئی اعتبار کر نہ سکے
یہ کیا کہ بارش گل ہی انھیں کے دامن پر — جو ایک تار بھی نذر بہار کر نہ سکے

عرفان لکھنوی

بہا کے اشک ترا انتظار کر نہ سکے — یہ پھول بھی ترے غم پر نثار کر نہ سکے
سنا بس اتنا کہ وعدہ کیا تھا تو نے کبھی — پھر اس کے بعد ترا انتظار کر نہ سکے
یہ بزم بادہ گساراں ہے لاج رکھ ساقی — اس آرزو کی جو ہم بادہ خوار کر نہ سکے

ساحر لکھنوی

وہ دل کو نکتہ شناس بہار کر نہ سکے — گلوں میں رہ کے جو کانٹوں سے پیار کر نہ سکے
امین لذت غم ہے مرا دل بیتاب — خدا کرے یہ سکوں اختیار کر نہ سکے
چھپا لیا ترے جلووں کو پردۂ دل میں — نگاہ شوق کا ہم اعتبار کر نہ سکے

اُف یہ روحیں (طنزیہ مزاحیہ)

آفتاب اختر

"بابوجی کاہے مجاک کرت ہو"

یہ تھی وہ آواز جو مابدولت کو ایک دن اس اولڈ فیشن کی کوٹھی میں سنائی دی جس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑی ہوئی تھیں۔ کہ اس کوٹھی پر "بدروحوں" کا قبضہ ہے۔ جب وہ ناچتی ہیں تو جن گاتے ہیں اور بھوت "تالیاں بجاتے ہیں" مگر مابدولت ذرا بہادر قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں جب اپنی ہمت پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس کوٹھی میں اقامت گزیں ہوئے تو انھیں کئی روز تک تو اس خوف سے نیند نہیں آئی کہ کہیں خم ٹھوک کر نبرد آزما نہ ہونا پڑے۔ وائے قسمت کہ ان بہادروں کو کسی کے بھی درشن نہ ہوئے صرف رات کو ۹ بجے کے قریب دودھ والی ہی کو چڑیل سمجھ کر لاٹھی ہاتھ میں لے خدا کا نام لے کر زور سے لپکے۔ چارپائی کا پایہ چڑسے بولا اور وہی "بابوجی کاہے مجاک کرت ہو" کی آواز سنائی دی۔

مابدولت نے "لاحول" میں اپنی شرمندگی کو پناہ دینے کی کوشش کی لیکن دودھ والی ہنستی ہی رہی۔ اور مابدولت واقعی پانی پانی ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک کوئی مچھر نہ بھنکا۔ ٹھیک دوسرے ہفتہ کی جمعرات کو رات کے تقریباً بارہ بجے پھلواری میں کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی

قبرستان کے کہیں سر چھپانے کو جگہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ موجودہ زمانہ میں مکانوں کا جتنا قحط ہے اُسے تو ان بیماروں سے پوچھئے جن کا تبادلہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا ہو جاتا ہے اور وہ بدنصیب نذرانے اور کچھ مہینوں کا پیشگی کرایہ ادا کرنے کے بعد بھی ان "لال سوداگروں" کا پیٹ نہیں بھر پاتے جن کا بس چلے تو کھال تک اتار لیں۔

یہی خاص وجہ تھی کہ ما بدولت نے وہیں رہنا مناسب سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی وقت مقررہ پر پہلواڑی میں کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ گھنگرو بجے اور ایک دم وہیں پانچ چھ حسینائیں رقص کرنے لگیں۔ اور رقص کے ساتھ ایک عجیب چونکا دینے والا "کورس" بھی شروع ہو گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گانے کے بول "چوں، چی، چوں، چک، چا" تھے۔

بہرحال ما بدولت کے کان کھڑے ہو گئے۔ قینچی کی طرح چلنے والی زبان ے ہو گئی اور ان "روحوں" نے "چک چا" پر پیر روک کر ناچ کو پھیلا دیا۔ ن کی مہارت کا واضح ثبوت تھا۔

پہلے گانے پر تو ما بدولت نے اپنے یقین کو اس شبہ میں بدل دیا کہ ہو نہ ہو دی پڑوس کی لڑکیاں ہیں لیکن اس دن تو وہ شک پھر یقین میں بدل گیا۔ نکہ اب پانچ دوشیزائیں "چک چا" ڈانس کر رہی تھیں۔ وہ بالی وڈ رقاصاؤں کی طرح نیم عریاں لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھیں۔ ان کی ںصورتی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اگر یہ تشبیہ بہت پرانی نہ ہو گئی ہو تو آسانی ے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا جسم گندھے ہوئے میدے سے بھی زیادہ سفید تھا۔

اور کان کھڑے ہو گئے سوچا کچھ ضرور دال میں کالا ہے۔ بس فوراً ہی چھن چھن کی آوازیں آنے لگیں۔ اور گانے کی آواز سے ما بدولت بھی جنھیں اپنی بہادری پر پورا پورا ناز تھا کچھ چونکنے ہوئے کیونکہ ان کی آواز بالکل ویسی ہی تھی جیسی لوگوں نے یہاں آنے سے قبل بتائی تھی۔

اس لئے لاٹھی کاندھے پر رکھی اور پلنگ سے نیچے اتر کر دبے پاؤں اس طرف بڑھے۔ گھنگرو اور زور سے بجنے لگے۔ گانا بھی تیز ہو گیا۔ مگر لاکھ کوشش کے بعد بھی ما بدولت گانے کو نہ سمجھ سکے۔ کیونکہ اس کے بول بھی "الم غلم" جیسے تھے۔ البتہ گانے والیوں کی آواز بڑی ہی مدھر تھی اور اگر وہ اس میں گالیاں بھی دینا شروع کر دیتیں تو ما بدولت کی طبع حزیں پر گراں نہیں ہوتیں اور گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہیں ہوتے کیونکہ ان کی آواز نے محو کر لیا تھا۔ ذرا کچھ ہوش آیا تو بوٹے بوٹے کی تلاشی لے لی۔ لیکن وہاں بھی کسی کا پتہ نہ پایا آخر کار مایوس ہو کر واپس آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور جب طبیعت کچھ سکون پر ہوئی تو یہ قصہ محلے کے بزرگوں کو سنایا۔ انھوں نے فوراً مشورہ دیا کہ کوٹھی کو چھوڑ دیا جائے نہیں تو برا انجام ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ سوتے میں ما بدولت کی چارپائی کو اوندھا کر دیا جائے یا اٹھا کر کہیں پھلواری میں ڈال دیا جائے۔ یہ روحیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اُسے نہیں چھوڑا۔ ایک تو اس کے چھوڑنے سے ما بدولت کی بہادری پر حرف آتا۔ دوسرے اگر وہ چھوڑ بھی دی جاتی تو سوائے

نہ طرح نہ تو اپنی انگلی میں خلگان دیا اور نہ اس میں نمک ہی بھرا۔ جن کا ذکر اب بھی بڑی بوڑھیاں "اپنی ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ" قسم کی کہانیوں میں کیا کرتی ہیں :

ٹھیک بارہ بجے رات کو پھلواری میں سرسراہٹ محسوس ہوئی اور گھنگھروں کی چھنچھناہٹ پر "اپلم چپلم" جیسے سمجھ میں نہ آنے والے "حک جا" گانے پر ایک رقص ہونے لگا۔ وہی پہلے والی حسینائیں بڑے ہی وارفتگی کے عالم میں رقص کر رہی تھی اور ساری کائنات کو نچا رہی تھیں۔ کائنات کے ساتھ جب مابدولت کا ننھا سا دل ناچتے ناچتے تھک گیا تو مابدولت نے ایک نعرہ مارا :

"ٹھہرو۔ آج نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے خوب پریشان کیا ہے"

یہ کہنا تھا کہ فضا پر سناٹا چھا گیا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب سمٹ رہی ہیں۔ مابدولت ہڑبڑا کر ان پر باز کی طرح جھپٹے کہ وہ بھاگنے نہ پائیں۔ مگر وہ سب بھاگ گئیں اور ان میں کی وہی بدنصیب سفیا پیچھے رہ گئی جو اپنی خوش قسمتی سے اس دن بال بال بچ گئی تھی۔ مابدولت نے جھٹ اسے جا دبوچا۔ اس کے منہ سے ایک بڑی ہی میٹھی چیخ نکلی۔

"کھا جاؤں گی"

اس دھمکی کا تھوڑا سا اثر مابدولت پر تو ضرور ہوا مگر فوراً ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ چاہے وہ کھا ہی جائے اس کو چھوڑیں گے نہیں :

وہ بہت کسمسائی منمائی لیکن اسے چھوڑا نہیں۔ اور اس کی رہائی کی صورت ایک شرط پیش کی وہ یہ کہ اگر وہ اس اسکیم کا پول کھول دے تو اسے پرکانوا ہ

ان کے حسن میں کہکشاں کی چمک تھی، چاندنی کا نکھار تھا۔ گلاب کی تازگی تھی باہیں بڑی ہی گداز تھیں۔ گھٹا کی طرح لہراتی ہوئی اور چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی زلفوں میں ہمالہ کی طرح نشیب و فراز تھے۔ ان کو دیکھ کر اسیر ہونے کو تو دل نہیں چاہتا تھا البتہ ان کی مہک چمک اور دمک کے زیر سایہ کچھ دیر آرام کرنے کو ضرور دل مچلتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بیماری کے تو کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے اور نہ کوئی "نیم بسمل" ہی ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے ان پیالوں میں شراب ابل رہی ہے۔ اگر چال دیکھنے کا موقع مل جاتا تو گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں صبا کی مستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی۔ لیکن ماہدولت کو ان کی دوڑ ہی دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور جہاں تک اس دوڑ کا تعلق ہے اس میں آندھی کی روانی ضرور تھی اور تمام خوبیوں نے ایک ساتھ مل کر انھیں حسن کی متحرک تصویریں بنا دیا تھا۔ قابل رشک، قابل دید اور پر شباب۔

ماہدولت جن کی آنکھیں "کالا حسن" ہی دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ بھلا اس "سفید حسن" کی تاب کہاں سے لاتے۔ دل کو بہت سنبھالا بے حد ہمت کی تب جا کر کہیں تھوڑا آگے کھسکا۔ چاہا کہ ان میں کی ایک سفید حسینہ کا ہاتھ پکڑ کر سرکاری گواہ بنا لیں مگر وہ سب کی سب کسی چھلاوے سے کم نہ تھیں قہقہے لگاتی ہوئی وہیں کہیں پھلواری میں غائب ہو گئیں۔

دوسرے دن ماہدولت بے حد بے چینی کے عالم میں ان کا انتظار کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ مگر جاگنے کے لیے ان پرانے شہزادوں کی

کسی کو اپنے جسم پر انگلی بھی رکھنے دیتے۔ جھٹ راہ فرار اختیار کرتے اور وہ بے چاریاں اپنے ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھتی رہتیں۔ اور اُف نہ کرتیں۔

جی اس زمانے سے جب مابدولت ایک گڈّا تھے اور اب تک ماشاء اللہ جن کے چہرے پر خدائی دین کے سب آثار ہوتے ہوئے بھی نانی کے اُسترے کی "آب" پر قربان ہو چکے ہیں۔ کچھ تغیر نہیں ہوا۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ پہلے جیسے حسین نہیں رہے ہیں کہ جو دیکھے انھیں گود میں لینے کی چاہ کرے کیونکہ ان کے حسن کو تو ان کنواریوں یا بیاہیوں کی نظر جب ہی سے لگ گئی تھی اور "مرتج" کی دھونی لینے کے بعد بھی وہ حسن محفوظ نہ رہ سکا۔ اسے تو ان لڑکیوں کی آہوں نے جھلسا کر رکھ دیا۔ مگر رسی کی اینٹھ اتنا جل جانے پر بھی نہیں گئی۔ مابدولت اب بھی کسی کی طرف نظر اٹھانا جرم سمجھتے ہیں اور کوئی لاکھ لاکھ جتن کرے۔ اپنی نظر کے لاکھوں تیر چلائے۔ اپنی زلف گرہ گیر کے سیکڑوں جال پھینکے مابدولت ہیں کہ پھنستے ہی نہیں۔ کوئی کتنے ہی ابروؤں کی کمانیں چلائے دل و جگر ویسے ہی سلامت رہتے ہیں۔ حسن ہوشربا کے کتنے ہی جادو کئے جائیں مگر مابدولت کے سر پر چڑھ کر لوہ بولتے ہی نہیں۔ مابدولت پر ٹھنڈے گرم کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

اسی لیے صنف مخالف نے انتقاماً "بدھو" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ اور عاشق مزاج "اہیوں" نے "گھگو" سمجھ کر پروانہ معافی عطا کر دیا ہے۔ اور اگر مابدولت جان بوجھ کر بھی کسی صنف نازک کے برابر سے گزر جائیں

بنا کر محلے کی چوہدریوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ مگر وہ کسی نکتہ پر جمتی ہی نہ تھی خیر خدا خدا کر کے قسمت نے یاوری کی اور اس نے بتایا

وہ سب پڑوس کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے گھر میں ایک زمین دوز کھڑکی کوٹھی میں آنے کی تھی۔ کھڑکی پھلواڑی میں کھلتی تھی اور اس کا پتہ سوائے ان لڑکیوں اور گھر والوں کے کسی اور کو نہیں تھا۔

اسی کے ساتھ اس نے ایک دوسرے سولہ آنے چونکا دینے والے راز کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسے مابدولت سے محبت ہو گئی تھی۔ جہاں تک محبت کا علم ہے اسے بیان کرنے میں مابدولت کچھ شرم محسوس کر رہے ہیں کیونکہ محبت اور صنف نازک دونوں سے مابدولت کو بچپن سے بیر رہا۔ اُس زمانہ سے ہی جب مابدولت اوندھے منہ دودھ ڈالنے کی حد سے آگے نکلکر زمین پر تیراکی کرنے والے "حسین گدھے" کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ چڑھ سی رہی تھی۔ اور اس کا ثبوت اکثر ان لڑکیوں کو ملتا رہتا تھا جن کی شادی ہونے والی ہو اور وہ اپنے ہونے والے "اُن" کے تصور میں گم ہو کر کام کاج سے جی چرانے لگیں اور اس کے عوض میں انھیں ماؤں کی جھڑکیاں سننا پڑیں۔ یا وہ شادی شدہ لڑکیاں جو اپنے آنے والے بچوں کے لیے دن گنا کرتی ہوں۔ یا وہ لڑکیاں جن کی گودیاں شادی ہو جانے کے بعد پانچ چھ سال تک خالی رہیں۔ تو یہ لڑکیاں اگر مابدولت کو اس وقت دیکھ کر بڑی ہی محبت سے گود میں لے کر منہ چومنے کی چاہ کرتیں اور اس لیے طرح طرح کے بہانے کر کے پھانسنے کی کوششیں کرتیں تو انھیں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ کیا مجال جو ماضی کے "گدھے میاں"

نہیں کی جس سے ما بدولت اپنے "انگلوں" کے پیرو کہلاتے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگل کی خاک چھاننے۔ ران کا گوشت کاٹنے۔ جوئے شیر نکالنے اور دریا میں چھلانگ لگانے کا موقع نہ مل سکا۔ ما بدولت نے غالب کی آرزو کو کئی بار پورا کرنے کی کوشش کی کہ گرمی میں نہانے کے بہانے میں ہی سہی دریا میں کود پڑیں مگر اس ترکیب کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کہیں اس عشق میں ناکام ہو کر مرنا پڑے تو قبر کی جھنجھٹ میں نہ پھنس کر کسی قریبی دریا میں چھلانگ لگائیں کہ نہ ملے لاش اور نہ بنے مزار کہ لوگ انگلیاں اٹھائیں۔

اس روح کو جھنجھوڑ دینے والے انکشافات کے بعد ما بدولت کا ابھی ایک عدد انکشاف بار خاطر کرنے کی زحمت اٹھائیے چونکہ ما بدولت کا عشق بالکل ماڈرن تھا اور اس عشق میں کسی عشق کے مارے ہوئے کا گیت گانا بہت ضروری ہوتا ہے مگر ما بدولت کوئی بھی اس طرح کا گیت تو کیا گاتے کسی غزل کے کسی شعر کو گنگنانے کی بھی جسارت نہ کر سکے۔ لوگ کہیں گے کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا تو ما بدولت کیا کرتے مجبور تھے۔ "گلا" دل کا ساتھ ہی نہیں دیتا تھا۔ نہ جانے گلے کو کیا عداوت پڑ گئی تھی۔ ما بدولت تان سین کی قبر پر جا کر بارہا گڑگڑائے ان کے مزار پر لگی ہوئی پیڑ کی بچی ہوئی پتیوں کو بھی زہر مار کیا۔ کہ شاید اسی بہانے کبھی ان کی نظر ہو جائے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ ما بدولت کی ایک نہ سنی گئی۔

خیر صدمے برداشت کرتے کرتے اب ما بدولت اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ انھوں نے صدمات کے ذخیرے میں ایک اور صدمہ کا اضافہ کر کے اس خوشی سے دل کو بہلا لیا کہ چلو شاعر بہلتے اس صدافت کا سہرا تو اپنے

تو ان کو شبہ نہیں ہوتا۔ اور مابدولت کو رقیب کا درجہ نہیں ملنے پاتا اور ایک فائدہ یہ ہے کہ عاشقوں کی گالیوں سے منہ کا مزا بھی کرکرا نہیں ہونے پاتا۔

مابدولت پریشان ہیں تو صرف لیلیٰ کی بیٹیوں سے کسی پہلو قرار نہیں۔ اگر لفٹ نہ دیں تو مغرور اور بدھو کہلائیں۔ اور اگر بھولے سے بھی کسی کو لفٹ دیدیں تو دوسری جل کر کباب ہو جائیں اور مابدولت کو مینڈکی بنا کر زکام میں مبتلا کر دیں۔

اب جب کسی کے بارے میں ایسی چونکا دینے والی ہوائیاں اڑی ہوئی ہوں، وہ عشق کی دنیا میں اتنا بدنام نہیں ہوا اور جسے محبت کرنے کا سلیقہ ہی نہ آتا ہو تو ایسی حالت میں اس پتھر دل سے کسی کا عشق کرنے لگنا۔ اس کے انتظار میں راتوں کی نیندیں حرام کرکے تارے گنتے رہنا کیا کسی انکشاف سے کم ہو سکتا ہے۔؟

بہرحال اسی انکشاف کا بھرم رکھنے کے لیے مابدولت نے اپنے اوپر جبر کرکے ڈرتے ہوئے "کیوپڈ" صاحب کو پتھر دل کے اوپر تلوار چلانے کے بجائے تیر چلانے کی اجازت دے دی کہ دیکھیں وہ کون سا تیر مارتے ہیں؟ اور مابدولت بے فکر ہو کر بیٹھ گئے کیونکہ کیوپڈ کے بازوؤں کو تو وہ بارہا آزما ہی چکے تھے۔

مگر کیوپڈ کے تیر نے ہانڈی میں نمک کے برابر دل پر اثر کر ہی دیا اور مابدولت کے لیے محبت جیسا "شجر ممنوعہ" سوکھنے کے بجائے پھلتا ہی گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نشو ونما کے دوران کوئی ایسی حرکت

سربند رہتا گیا کہ " روحوں اور چڑیلوں" کے لیے کالا کلوٹا ہونا ۔ ناک کا بیٹھا بیٹھا اور اس بیٹھی ہوئی ناک سے " منمنانا" ۔ "نجوں کا پیچھے پڑا ہونا بالکل ضروری نہیں ہے ۔ اس دنیا میں فضا کو زعفران زار بنانے والی حسینائیں بھی جن کی مست خرامی سے ہزاروں دل کھل جاتے ہیں ۔ جن کی رفتار کی مستی دریا کی مستانہ روی کو بھی مات کر دیتی ہے اکثر "روحیں" بن کر "نابدولت" جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کی نیندیں چرا لیتی ہیں ۔

ادبی خبریں

اقبال صدیقی

کانپور کے ارباب ذوق نے اردو اکیڈمی کے نام سے ایک خالص ادبی ادارہ قائم کیا ہے جو اردو کی معیاری کتابوں کو شائع کریگا۔ اور سستی قیمت پر فروخت کریگا۔

ملک کے مشہور انشاء پرداز اور انجمن ترقی اردو ہند کے سابق اسسٹنٹ سکریٹری مولانا خیر بہوروی آجکل صوبہ کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر رہے ہیں۔ اور ہر مقام پر محبان اردو سے اردو کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کر کے اردو کے تحفظ و بقا کے لیے ایک منظم تحریک شروع کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ آپ نے ایک ملاقات میں کہا ہے کہ اردو عوامی زبان ہے اس کا تحفظ عوام کا خلوص اور ان کی عملی جد و جہد ہی سے ہو سکتا ہے۔ سرکاری ادارے اردو کا تحفظ نہیں کر سکتے اور نہ صدر جمہوریہ یا پنڈت جی کی تقریر دل سے اردو کا کام آگے بڑھ سکتا ہے۔

شاعر انقلاب علامہ انور صابری نے لکھنؤ کی جن ادبی نشستوں میں شرکت کی ان کی تعداد ۲۱ سے زیادہ ہے کئی سال کے بعد صابری صاحب ایک ماہ سے زیادہ یہاں مقیم رہے۔

فروغ اردو کے نمائندے شعر و ادب عرفان لکھنوی کی گذشتہ ماہ شادی خانہ آبادی کی تقریب شاندار طریقے پر منائی گئی اس میں مقامی شعراء ادبا صحافی اور معززین شریک تھے

بچوں میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ کھیل کود کا سامان خریدنے کے لیے ۲۰ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔

ممتاز اسکول کلکتہ کے درجہ نہم ادبی انجمن کے زیر اہتمام ۱۲ر جنوری ۱۹۵۸ء کو جو لطیفہ گوئی کا پروگرام ہوا اس میں مندرجہ ذیل طلبا نے انعامات پائے وسیم احمد۔ ابراہیم علوی

نیر صاحب کی تحریک پر کانپور کی ہندوستانی برادری نے یوم غالب منانے کا فیصلہ لیا ہے اس سلسلے میں ملک کے مشہور اخبار، ریڈیو، ادیبوں اور شاعروں کے خیر مقدمی بیانات بھی آرہے ہیں۔ یوم غالب کانپور میں ۱۵ر فروری کو منایا جائے گا۔

یونیسکو نے جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ کو نوخواندہ افراد کے لیے کتابیں شائع کرنے میں مدد دینے کی اسکیم کے تحت بھارت سرکار کو دو ماہ کے لیے مسٹر تھامسن بان کستو کی خدمات مہیا کی ہیں۔ مسٹر تھامسن سویڈن کے آرٹسٹ ہیں اور انھیں کتابوں کے لیے تصاویر بنانے میں مہارت حاصل ہے بھارت میں وہ آرٹسٹوں مصوروں اور ایسی کتابیں چھاپنے اور تیار کرنے والوں کو صلاح مشورہ اور تربیت دیں گے۔

لہٰذا بھارت سرکار نے تجربہ کار آرٹسٹوں کو کتابوں کے لیے تصاویر بنانے کے جدید ترین تربیت دینے کے لیے مسٹر تھامسن کے زیر رہنمائی دو آرٹ کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا ہے ان میں سے پہلے کیمپ کا افتتاح حکومت ہند کے مشیر تعلیم شری کے۔ جی سیدین ۹ر جنوری ۱۹۵۸ء کو دہلی پولی ٹیکنک میں کیا۔ یہاں ۱۵ افراد

★ سنا جاتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے اردو کے سلسلے میں ایک خاص فیچر پروگرام شروع کرنے والا ہے۔

★ گورکھپور میں دائرہ ادب کے زیر اہتمام جو کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا اس میں مانی جائسی، انور صابری اور دوسرے مشہور شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت کے فرائض جناب مصطفیٰ حسین پارلیمنٹری سکریٹری نے انجام دیے۔

★ معلوم ہوا ہے کہ حکومت اتر پردیش نے ڈسٹرکٹ گزیٹیروں پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا ہے۔ ان گزیٹیروں پر ۱۹۱۱ء سے نظر ثانی نہیں کی گئی تھی۔ اب ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۷ ابواب پر مشتمل ہوگا جس میں تفصیلی اور صحیح معلومات درج ہوں گی۔ (ی۔ پ۔ ن۔ س)

★ زیر نظر سال میں سماجی تعلیم کے لانے کے لیے گشتی تربیتی دستے قائم کئے گئے ہیں اور ۹ ضلع لائبریریوں کی تعمیر مکمل ہوئی جن میں تمام علوم کی کتابیں مہیا کی جا رہی ہیں۔

★ اتر پردیش میں ۱۹۵۷ء میں ڈگری کالجوں کی تعداد ۴۸ ہو گئی جبکہ گذشتہ سال ان کی تعداد ۴۲ تھی۔ (ی۔ پ۔ ن۔ س)

★ اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ممالک کو جانے والے مستحق طلباء کی امداد کے لئے ۵۷-۱۹۵۶ء کے بجٹ میں ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

★ آئندہ ماہ سرکاری افسروں کے یہاں منعقد ہونے والا تیرہواں مشاعرہ سید علی ظہیر صاحب کی قیام گاہ پر ہوگا۔

★ موتی لال نہرو پارک لکھنؤ میں بچوں کا صحت عجائب گھر اور لائبریری قائم کی گئی ہے۔

کا معیار بہتر بنانے میں مدد مل سکے۔

(۶) ابتدائی تعلیم کی ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینا اور مناسب سفارشات پیش کرنا

(۷) ابتدائی تعلیم کے مسائل کے بارے میں تفاصیل اکٹھا کرنا خصوصی تحقیقات کے لیے آسان سروے کرنا اور دیگر ضروری تحقیقات کرنا۔

(۸) ابتدائی تعلیم کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں موزوں رہنمائی قیادت اور تال میل قائم رکھنے کے لیے تمام اہم مسائل پر مشورہ دینا۔

اس کونسل کو نہ صرف ان تجاویز پر غور و خوض کا اختیار ہوگا جو اس کو مرکزی یا ریاستی حکومتوں کی طرف سے پیش کی جائیں گی۔ بلکہ یہ خود بھی ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لیے تجاویز پیش کر سکیں گی۔

اس کے علاوہ کونسل کو خصوصی مسائل پر کمیٹیاں مقرر کرنے کا اختیار بھی ہوگا۔

کو ایک ماہ تک تربیت دی جائے گی۔

دوسرا کیمپ فروری ۱۹۵۹ء کے دوسرے ہفتے میں بمبئی کے سرجے جے اسکول آف آرٹس میں منعقد کیا جائے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ ان دونوں کیمپوں کے انعقاد سے ملک میں کتابوں کے لیے تصاویر بنانے کے موجودہ معیار کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ (دی)

★ حکومت ہند نے ملک میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کی رفتار تیز کرنے اور آئین کے ۴۵ ویں آرٹیکل میں مندرجہ ذیل ہدایت کی تعمیل کی غرض سے ابتدائی تعلیم کی ایک کل ہند کونسل بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کونسل صدر کے علاوہ ۲۱ ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ اس کے صدر حکومت ہند کے مشیر تعلیم خواجہ غلام السیدین ہوں گے۔ وزارت تعلیم و سائنسی تحقیق کے نائب مشیر تعلیم ڈاکٹر پی ڈی سی شکلا کونسل کے سکریٹری کے فرائض انجام دیں گے۔ کونسل کے فرائض حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) بھارت سرکار ریاستی حکومتوں اور مقامی انتظامیہ اداروں کو ابتدائی تعلیم سے متعلقہ تمام امور پر مشورہ دینا۔

(۲) آئین پر ۴۵ ویں آرٹیکل پر سریع عملدرآمد کے لیے پروگرام تیار کرنا۔

(۳) ہر ریاست میں ابتدائی تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے مفصل پروگرام تیار کرنا یا کروانا۔

(۴) ابتدائی تعلیم کے انتظامیہ مالی اور دیگر مسائل کے بارے میں تحقیق کرنا ایسی تحقیق میں مدد دینا اور اس کے نتائج شائع کرنا۔

(۵) ایسا لٹریچر شائع کرنا جس سے شعبۂ تعلیم کے افسران اور اساتذہ کو ابتدائی تع

ہندستان میں ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں
مندرجہ ذیل جگہوں سے مل سکتی ہیں

بمبئی :- منیجر علوی بک ڈپو ۔ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳ (۲) مکتبہ جامعہ پرنسس بل
(۳) رانٹرس امپوریم لمیٹڈ فیروز شاہ مہتا روڈ (۴) عثمانیہ کتب خانہ بمبئی

احمد آباد :- (۱) کلیم بک ڈپو خاص بازار (۲) رفیق بکڈپو (۳) عزیز بکڈ

مالیگاؤں :- الرضا بک اسٹال

حیدر آباد دکن (۱) نعمت بک ہاؤس کریم نگر (۲) رحمانیہ بکڈپو روبرو گھڑیال

بنگلور (۱) سنٹرل بکڈپو (۲) فیروز بک ڈپو نیو مارکیٹ

پونا :- اسلم بکڈپو

دہلی :- مکتبہ شاہراہ ۔ مکتبہ جامعہ
علمی کتب خانہ ۔ پنجابی پستک بھنڈار ۔ مکتبہ ہم خیال

پٹنہ (۱) کتاب منزل سبزی باغ (۲) اقبال بکڈپو

بھاگلپور :- کمالیہ بک ڈپو

گیا :- (۱) ظفر بکڈپو کچہری روڈ (۲) کتاب منزل باری روڈ

کلکتہ :- عثمانیہ بکڈپو ۔ ویلسلی پور روڈ
ایم شبیر حسین ویلسلی پور روڈ ۔ انوار بکڈپو ۔ دارالاشاعت قرآن

مدراس (۱) خورشید بکڈپو ٹرپلیکین (۲) مدینہ بک ہاؤس

سرینگر :- غلام محمد نور محمد بک سیلر (۲) شیخ غلام محمد قرآن منزل

بھوپال :- اسٹوڈنٹ اسٹورس

الہ آباد :- کتابستان بک سیلر کملا نہرو روڈ

خان محبوب طرزی کے شاہکار ناول

ثریا :- سوشل ناول ۲ مصنوعی چاند :- سائنٹیفک ناول ۱۲
فریدہ :- جاسوسی " ۳ دوشیزۂ قاف :- اسلامی تاریخی " ۴
آغاز سحر :- جنگ آزادی پر ناول ۲ ایک جان تین قالب :- سائنٹفک " ۱۲
یاقوتی :- سماجی ناول ۲ قیامت صغریٰ :- " ۲
امین آباد :- لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں عمدہ ناول ۲ نیا راستہ :- سماجی ناول ۲
نغمۂ کوہسار جدید ۱۲

مائل ملیح آبادی کے مشہور ناول

معمار :- اسلامی تاریخی ناول ۱۲ سفر :- اسلامی تاریخی ناول ۲
فلسفی ابن رشد :- فلسفیانہ سماجی ناول ۲ غزنی دروازہ ۱۲
پاگل خانہ :- سماجی ناول ۳ لال قلعہ :- جنگ آزادی کی مکمل تاریخ ۱

وحشی محمود آبادی کے قابل دید ناول

زینب ساحرہ :- اسلامی تاریخی ناول ۲
سید سالار مسعود غازیؒ :- سید صاحب کے مجاہدانہ کارنامے ۲

ڈاکٹر طاہر دریا آبادی کا بہترین ناول پیغام نے

ان ناولوں کے علاوہ شمع بکڈپو کی جملہ کتب کی خریداری کے وقت یہ پتہ یاد رکھئے :-
ادارہ فروغ اردو ۳۳ امین آباد پارک لکھنؤ

ادب اور نظریہ: پروفیسر آل احمد سرور کا چوتھا جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جسے گوہر بن خواہ اردو نے سراہا ہے اور اپنی لائبریریوں کی زینت بنایا ہے آپ بھی اس کو جلد خرید یے۔ قیمت ۴ روپے

تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدید) آل احمد سرور ہمارے ممتاز نقادوں میں سے ہیں ان کی تنقید تخلیقی رہی ہے اس لیے علم و ادب کے شیدائی ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ آپ بھی تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدید) جلد طلب فرمائیے جو کہ تیار ہو گئی ہے اور یو پی کے محکمۂ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کورس میں بھی شامل کر لی ہے قیمت صرف ۳ روپے

پیسہ اور پرچھائیں: ڈاکٹر محمد حسن کے نو ڈراموں کا مجموعہ جس پر ہند گورنمنٹ نے مجموعی طور پر ۵۰۰ روپیہ بطور انعام دیے ہیں۔ قیمت ۴ روپے

قدر و نظر: پروفیسر احتشام رضوی صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس کا آپ کو بے چینی سے انتظار تھا وہ اب تیار ہو گیا ہے جلد طلب فرمائیے۔ ۴ روپے

نکہت گلفروش غلام احمد فرقت کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو اپنی مثال آپ ہے۔ جلد از جلد طلب فرمائیے۔ قیمت ۳ روپے

ستاروں سے آگے شوکت تھانوی کے شیش محل کی طرح نہایت دلچسپ کتاب ہے جلد طلب فرمائیے قیمت ۴ روپے

انعام: ڈاکٹر طاہر دریابادی کا اصلاحی سماجی ناول ۳ روپے

مصنوعی چاند روس کے دو مصنوعی چاندوں کے بعد خان محبوب طرزی کا سائنٹفک ناول۔ قیمت ۱۲ آنے

ایک جان تین قالب: خان محبوب طرزی کا حیرت انگیز ناول میڈیکل سرجری

تیسرا اڈیشن ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ جلد سے جلد طلب فرمایئے
قیمت ۳ ر

سخنہائے گفتنی پروفیسر کلیم الدین احمد کے جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو کہ اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔
قیمت صرف للعہ ر

ادب کا مقصد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کے مضامین کا گرانقدر مجموعہ۔
قیمت ۴ ر

جوئے رواں:- حامد اللہ افسر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ جلد از جلد طلب فرمائیے قیمت ۴ ر

حکیم بانا:- سید علی عباس حسینی کا تازہ ترین ناول

زمینوں کا بادشاہ قدیم زندگی کی ایک جھلک۔ زمینوں کے ساتھ ضلع جگتی۔ دلچسپ ہنسانے والا ناول۔ قیمت ۳ ر

ادبی خطوط غالب:- مرزا عسکری بی، اے کے ایسے خطوں کا مجموعہ جس میں مرزا غالب کے نکات ادبیہ حل کئے ہیں اور اشعار کے معنی سمجھائے اور شعراء کے متعلق رائے زنی کی ہے۔ قیمت صرف ۳ ر

ذوق ادب اور شعور:- پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے معرکۃ الآرا جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جن کے متعلق ہند و پاک کے ادبی رسالوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے قیمت ۳ ر

روایت اور بغاوت (مع اضافہ جدیدہ) پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کی معرکۃ الآرا کتاب جلد از جلد طلب فرمایئے
قیمت ۳ ر

لال قلعہ ۔ غدر ۱۸۵۷ء کی مفصل تاریخ قیمت [illegible]

زینب ساحرہ :۔ مغرب اقصیٰ کی وہ اولوالعزم حسینہ جس نے اپنے شوہر کو جام شراب کے بجائے تلوار پیش کر کے افریقہ و اسپین کا فاتح بن تاشفین بنادیا۔ وحشی محمود آبادی کا تازہ ترین تاریخی ناول پڑھئے اور لطف اٹھائیے قیمت صرف [illegible]

سید سالار مسعود غازیؒ ناول کے انداز میں مکمل سوانح حیات کو کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔ وحشی محمود آبادی کا بہترین ناول، قیمت صرف [illegible]

محبوبۂ کربلا :۔ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے مشہور ناول غادۂ کربلا کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی۔ مشاقین کے اصرار پر اس کا جدید اڈیشن شائع کیا ہے لہذا جلد آرڈر دیجئے۔ قیمت [illegible]

حجاج بن یوسف جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے مشہور ناول غادۂ کربلا کا اردو ترجمہ جو کہ تقریباً پچیس برس سے نایاب تھا۔ اب تیار ہو گیا ہے آج ہی آرڈر دیجئے۔ قیمت [illegible]

جادو کی آنکھ :۔ ڈاکٹر اکبر بلگرامی کا جاسوسی ناول قیمت [illegible]

شکست کی آواز :۔ قاضی عبدالستار کا بہترین ناول قیمت [illegible]

ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے سید علی عباس حسینی کا تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ جس کے ایک افسانے پر گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپے انعام بھی دیا ہے۔ قیمت فی جلد [illegible]

پاگل خانہ :۔ مائل ملیح آبادی کا سماجی ناول قیمت [illegible]

ایک عجیب وغریب کارنامہ۔ دلچسپ رومان جس کے متعلق مصنف کا دعویٰ ہے کہ آج تک ایسا عجیب وغریب ناول میرے قلم سے نہیں نکلا۔ پڑھیے اور لطف اٹھائیے
قیمت للعہ ر

دوشیزۂ قاف خان محبوب طرزی کا معرکۃ الآرا جدید تاریخی اسلامی ناول جو کہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے
قیمت صرف صہ ر

دلرُبا — خان محبوب طرزی کا سماجی ناول قیمت ے ر

قیامت صغریٰ " سائنٹفک " " ے ر

فریدہ " جاسوسی " ۶ ر

آغاز سحر " غدر ۱۸۵۷ء پیسر حاصل تبصرہ ناول کے روپ میں ۸ ر

یاقوتی " عشق ومحبت سے بھرپور سماجی ناول۔ ۸ ر

نیا راستہ " سماجی ناول قیمت ۸ ر

معمار ۔ کہنہ مشق اور کامیاب ترین ناول نگار مائل ملیح آبادی کا شمالی افریقہ کے پس منظر پر ایک رزمیہ تاریخی ناول۔ مغرب کے معماروں کی ایک زندہ جاوید تصویر
قیمت صرف للعہ ر

غزنی دروازہ مائل ملیح آبادی کا جدید ترین معرکۃ الآرا تاریخی ناول۔ جلد سے جلد خریدیے۔ قیمت للعہ ر

سلفر مائل ملیح آبادی کا جدید ترین اسلامی تاریخی ناول۔ حضرت آدمؑ سے اس وقت تک کے اکابرین اسلام کی سوانح عمری اور کارنامے۔ قیمت ۳ ر

فلسفی ابن رشد ناول کے انداز میں فلسفی ابن رشد کی مفصل کہانی کا ایک تاریخی ورق۔ قیمت ۸ ر

ادبی کتابیں

- ازاج بلی یعنی خلاصہ سیر کوہسار — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۶ر
- دلی کے خطوط — مجنوں گورکھپوری — ۱۲ر
- نگارانیں جدید اڈیشن — امیر احمد علوی — سے
- دو شاعری " — عہ
- رونے آنکھے: ناظر کاکوروی — سے
- شہر احاقہ " — ۸ر
- ایک نادر روز نامچہ — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۶ر
- بی خطوط غالب مرزا عسکری — سے
- شرح دیوان غالب طباطبائی — سے
- رابع زبان اردو۔ جلال لکھنوی — ۷ر
- ادب اور ان کا کلام: رضا انصاری — عہ
- بلی کا یادگار مشاعرہ " — ۱۲ر
- ہندی کے مسلمان شعراء۔ امیر حسن نورانی — ۱۲ر

شبلی کی تصانیف

- ۱۔ کلیات … — عہ
- ۲۔ دستۂ گل، فارسی کلام منظوم — ۶ر
- ۳۔ برگ گل " — ۶ر
- ۴۔ شعرالعجم کامل — ۔

خلاصہ

- ۱۔ خلاصہ روح تنقید — ۱۲ر
- ۲۔ خلاصہ حیات جاوید — عہ
- ۳۔ خلاصہ قواعد اردو — عہ
- ۴۔ اردو عروض یعنی خلاصہ جواہر العروض — عہ

ناولیں

- ۱۔ پیام۔ ڈاکٹر طاہر دیا لپوری — سے
- ۲۔ قطرے سے گہر ہونے تک اصلاحی سماجی ناول۔ صالحہ عابد حسین — سے
- ۳۔ ایک جان تین قالب۔ علی خان محبوب طرزی — للعہ
- ۴۔ دوشیزۂ قازان " — صہ
- ۵۔ امین آباد " — سے
- ۶۔ مصنوعی چاند " — للعہ
- ۷۔ دل ربا " — سے
- ۸۔ زبیدہ (جاسوسی ناول) " — ۶ر
- ۹۔ آغاز سحر۔ غدر کے مکمل واقعات صوبہ اودھ کی تاریخ — سے
- ۱۰۔ نیلا ستہ۔ خان محبوب طرزی — سے

۱۔ جوئے رواں حامد اللہ افسر ۱۲ر

۲۔ اچھی نظمیں اخگر مشتاق ۵ر

۳۔ مرثیہ غالب ۲ر

۴۔ مسٹر ملا کی نوک جھوک

(پردہ نسواں کے متعلق منظوم مناظرہ) ۱۲ر

ڈرامے

۱۔ پیسہ اور پرچھائیں۔ ڈاکٹر محمد حسن ۸ر

۲۔ راکھی۔ شجاعت علی سندیلوی ۶ر

تاریخ

۱۔ شاہان مالوہ۔ امیر احمد علوی بی اے ۱۲ر

سیر و سیاحت

۱۔ ساحل اور سمندر۔ سید احتشام حسین

۲۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں

عبد الماجد دریا بادی

متفرق

۱۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی

عبد الماجد دریا بادی

۲۔ گاندھی جی کے ساتھ۔

حامد اللہ افسر

۳۔ حکایات صحابہ۔ مولانا محمد زکریا

۴۔ اپنی پہچان۔ یعنی سال میں پیدا ہونے

والے لوگوں کی قسمت کی معلومات

اعجاز فاروقی

۵۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے

غلام الثقلین ۴ر

۶۔ بانی اسلام

علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا

اردو ترجمہ ۱۲ر

۷۔ تیسیر القرآن ۹ر

۸۔ بہشتی ثمر اول دوم یعنی خلاصہ

بہشتی زیور۔ مکمل

۹۔ زکوٰۃ الحلی ۵ر

۱۰۔ ہمارا جھنڈا

حامد اللہ افسر

۱۱۔ یاقوتی۔ خاں محبوب طرزی عہ/
۱۲۔ زینب ساحرہ۔ وحشی محمودآبادی ہے/
۱۳۔ سید سالار مسعود غازیؒ " ہے/
۱۴۔ پاگل خانہ مائل ملیح آبادی عہ/
۱۵۔ معمار (اسلامی تاریخی ناول) " للعہ/
۱۶۔ سفر " " ہے/
۱۷۔ عزلی دروازہ " " للعہ/
۱۸۔ فلسفی ابن رشد " ہے/
۱۹۔ لال قلعہ (غدر ۵۷ء کی مکمل تاریخ)
مائل ملیح آبادی ہے/
۲۰۔ رخسار سحر۔ النصر کریم قدوائی عہ/
۲۱۔ عجوبہ کربلا جرجی زیدان ہے/
۲۲۔ حجاج بن یوسف " للعہ/
۲۳۔ اسپین کی شہزادی۔ صادق حسین سردھنوی للعہ/
۲۴۔ سیاحت زمین۔ محمود اعظم فہمی عہ/
۲۵۔ معرکہ روم و یونان۔ صادق حسین سردھنوی ہے/
۲۶۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)
ڈاکٹر اثر بلگرامی ہے/
۲۷۔ شکست کی آواز۔ قاضی عبدالستار ہے/
۲۸۔ طبیلی۔ محمد علی واحد عہ تعارف نامہ
شوکت تھانوی عہ/

افسانے

۱۔ ٹھیکرے کی مانگ (افسانوں کا مجموعہ)
صدیقہ بیگم سیوہاروی ع/
۲۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے
علی عباس حسینی ہے/
۳۔ چوتھی ابن مسیح الحسن رضوی عہ/
۴۔ جگ ہنسائی قیصر تمکین عہ/
۵۔ ابوالخیر۔ مجنوں گورکھپوری ۶
۶۔ سہرا حلقہ ناظر کاکوروی ۸

مزاحیہ

۱۔ زنٹیوں کا بادشاہ۔ حکیم (ناول)
سید علی عباس حسینی ہے/
۲۔ اپنی موج میں آوارہ عہ/
۳۔ کف گلفروش (غلام احمد فرقت) ہے/
۴۔ صید و ہدف " عہ/
۵۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (کامل
دو جلدیں) عہ/

منظومات

۱۔ ذوق جنوں۔ پروفیسر آل احمد سرور ہے/
۲۔ شمع حبیب نعتیہ کلام کا مجموعہ
بہزاد لکھنوی عہ/



رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰

اردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کا علمبردار

با فیض زبان اردو پہ خاص احسان کر رہا ہے
فروغ اردو فروغ اردو کا ساز و سامان کر رہا ہے
طرز نظر سے ادب نمایاں قدم قدم پہ شعور فطرت
نفس نفس کو حیات نو کا لطیف عنوان کر رہا ہے

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

اپریل ۶۵ء

مدیر اعزازی

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

معاونین

سید امیر حسن نورانی — حکیم عبد القوی دریابادی بی اے

شجاعت علی سندیلوی ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر)

منیجر و نگراں

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

چندہ

فی پرچہ چار آنے — سالانہ دو روپے

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ

ہندوستان میں
۳۶ - امین آباد پارک لکھنؤ

پاکستان میں
مبارک بک ڈپو نیو اردو بازار بالمقابل نیشنل بینک کراچی

اپنی باتیں

ادارہ

حکومت ہند نے نیوز پرنٹ کے حصول کے سلسلہ میں جو پابندیاں عائد کی ہیں
مدرز گنت طلب ہیں کہ چھوٹے اخبارات کا زندہ رہنا محال نظر آنے لگا
ن دور نہیں جب ہندوستان میں صرف برلا اور ڈالمیا ہی کے سرمایہ
نے والے اخبارات رہ جائیں گے۔ باقی اخبارات خود ہی یکے بعد دیگرے
بائیں گے۔

ابتدا میں حکومت نے جب لائسنس جاری کئے تو ہر اخبار کو بغیر کسی دقت
رامدی لائسنس مل گئے لیکن اس کے بعد ہر بار ایک نئی پیچ نکلتی گئی اور چھوٹے
ات کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہو گیا اور اب حالت یہ ہے کہ ہر چھوٹا ادارہ
ان ہے اور اس کے منتظمین اس پہلو پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہے ہیں
اپنے اخبار کو جاری رکھنے کے لئے کیا صورت اختیار کریں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں بھی نیوز پرنٹ پر کنٹرول ہو گیا تھا مگر
قت طریقہ کار یہ تھا کہ ہر اخبار کی ضرورت کا اندازہ لگا کر اس کو پرمٹ دیدیا
ا اور اسی پرمٹ پر اخبار و رسائل ہر جیبرڈ یلر سے کاغذ حاصل کر لیتے تھے
ے لئے نہ تو اخبارات کے منتظمین کو خط و کتابت کرنا پڑتی تھی اور نہ کاغذ
کا ریکارڈ تیار کرنا پڑتا تھا مگر ہماری قومی حکومت نے کاغذ کے حصول

شمارہ نمبر ۱۲ | اپریل سنہ ۱۹۵۸ء | جلد نمبر ۴

ترتیب

اپنی باتیں	ادارہ	۳
سرشار کا لکھنؤ	پروفیسر سید احتشام حسین	۶
طلوع فکر	سید اختر تلہری	۱۷
محفل شعر و ادب	نمائندہ محفل شعر و ادب	۲۰
پاداش ناکردہ (افسانہ)	الطاف حسین راہی	۲۶

سید نصا حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ ادب نعمت اللہ روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

چیرمین تھے۔ خدا آپ کی مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے ۴ر مارچ کی شب کو آپ کی حرکت قلب بند ہو گئی اور ایک جید عالم اس دنیا سے اٹھ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

قطعہ تاریخ رحلت

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

لقب تھا اس کا زمانے میں افضل العلماء ۔۔۔ ضیائے علم سے روشن تھا نام عبدالحق
تھی اسکے خلق میں خلق محمدی کی جھلک ۔۔۔ تھا نرم و دلکش و شیریں کلام عبدالحق
صفا و صدق و محبت پیام تھا اس کا ۔۔۔ دلوں میں گونج رہا ہے پیام عبدالحق
ہمیشہ خلق کی خدمت میں صرف ہوتی تھی ۔۔۔ رضائے رب کے لئے صبح و شام عبدالحق

ہے سید ھی یہی یہ تاریخ اس کی رحلت کی
جوار رحمت حق ہے مقام عبدالحق

۱۳۷۷ھ

(ڈاکٹر سید عابد حسین)

میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں کہ چھوٹے اخباری ادارے پریشان ہو گئے ہیں

امرت بازار پتریکا، لیڈر، پائنیر اور نیشنل ہیرالڈ جیسے اخبارات کے پاس معقول فنڈ ہے اور ان کے وسائل ایسے ہیں کہ وہ ہر حالت میں اور ہر قیمت پر کاغذ حاصل کر سکتے ہیں اور وقت ضرورت قانونی سقم کو دور کرنے کے لئے عدالت میں چارہ جوئی بھی کر سکتے ہیں اور اسمبلی میں ان کی طرف سے سوالات بھی ہو سکتے ہیں لیکن چھوٹے اخبارات کچھ نہیں کر سکتے اور اگر کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہی کہ اپنے اخبارات کی اشاعت ملتوی کر دیں۔

ان حالات کے پیش نظر ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ چھوٹے اخبارات کے لئے ایسی سہولتیں پیدا کرے کہ سرمایہ دار اخبارات کے ساتھ ہی وہ بھی زندہ رہ سکیں اور ہندوستان کی جمہوریت پر حرف نہ آنے پائے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا سانحہ ارتحال

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے انتقال کے بعد ہندوستان کے لئے دوسرا سانحہ عظیم ڈاکٹر عبدالحق کا سانحہ ارتحال ہے۔ آپ نہ صرف ایک مشہور عالم دین تھے بلکہ مغربی علوم پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔ آپ نے جنوبی ہند اور خصوصاً مدراس میں دو ڈھائی سو سے زیادہ کالج اسکول اور مدرسے قائم کرائے اور دور حاضرہ کے علوم کے حصول کے لئے متعدد سائنسی اور فنی ادارے آپ ہی کی کوششوں سے منصۂ شہود پر آئے

مرحوم مثالی انسان اور عالم باعمل تھے۔ آپ کے انتقال سے قوم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ شاید برسوں نہ پر ہو سکے گی۔ آپ پبلک سروس کمیشن کے

سلطان عالم واجد علی شاہ جنھوں نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنایا تھا۔ زندگی سے برسوں کی راہ دور چلے گئے ہیں۔ لیکن اس کے ماحول میں انھیں کا رنگ بنا رہا۔ اس کے امام باڑے، قیصر باغ، رومی دروازہ، چوک اور پل، اس کے محلے، گلیاں، بازار، بٹیروں کی پالیاں، رئیسوں کے دربار ان کے مصاحب، خوشامدی، نوکر چاکر، یہاں کے بانکے، شہدے اور پشہ ور، یہاں کے میلے، محرم، ہولی اور بسنت، یہاں کے شادی بیاہ کی رسوم، مشاعرے، صحبتیں، محفلیں اور مجلسیں سب اسی روایت اور فضا کی پابند ہیں جن کا زمانہ تقریباً گذر چکا تھا۔ اس طرح فسانہ آزاد کا سب سے اہم کردار لکھنؤ بن جاتا ہے جس کے سینکڑوں پہلو اس کے صفحات پر زندہ اور متحرک تصویروں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ کی فضا اس ناول پر اس طرح مسلط ہے کہ جب اس کا ہیرو آزاد، اپنی محبوبہ حسن آرا کے اشارہ پر ترکی اور روم جا کر اسلامی جنگوں میں شرکت کرتا ہے تو لکھنؤ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ترکی کے شہر لکھنؤ اور وہاں کی زندگی لکھنؤ کی زندگی بن جاتی ہے کیونکہ اول تو سرشار نے ان غیر ملکی شہروں کی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھا اور انھیں واقعات میں کوئی خاص جگہ نہیں دی دوسرے اگر کہیں ان کا ذکر ہے بھی تو وہ اس سے بالکل مختلف ہیں جیسے وہ واقعی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ لکھنؤ ہی اس افسانہ کا سب سے اہم کردار اور سرشار کا سب سے پسندیدہ موضوع ہے آزاد اور خوجی کے کرداروں میں کچھ یکسانیت سی پیدا ہو جاتی ہے اور کئی ہزار صفحات کے مطالعہ میں اس یکسانیت سے بعض اوقات

اوراقِ مصوّر

سرشار کا لکھنؤ

سید احتشام حسین رضوی
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

سرشار نے فسانۂ آزاد میں لکھنؤ کی جو جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے وہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے کیونکہ ان کا یہ شاہکار پلاٹ اور قصہ کے لحاظ سے ڈھیلا ڈھالا اور بے ربط ہے، اس کے کردار حقیقتوں کے سائے ہیں اور واقعات بعض جگہ بالکل مصنوعی نظر آتے ہیں لیکن ان تمام چیزوں کے یکجا ہونے اور انداز بیان کی سحر کاری نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جو ہر نقص کی تلافی ہی نہیں کرتی، سب کے لئے مناسب جگہ نکال لیتی ہے فضا حقیقی ہو تو غیر حقیقی پہلو بھی اپنا انوکھا پن اور اجنبیت کھو کر اس دنیا کا جز بن جاتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ فسانۂ آزاد کے کردار جیسے نیم غنودگی یا نشہ کی حالت میں چلتے پھرتے ہیں یعنی اعتدال سے ذرا ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ وہ فضا ہی کس قدر غیر معتدل ہے جس میں ان کا ناول جنم لیتا ہے! غیر معتدل اس لئے ہے کہ حالات بدل جانے کے بعد بھی لکھنؤ نہیں بدلا۔ آصف الدولہ، غازی الدین حیدر، محمد علی شاہ،

کھینچکر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں، لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم کے وقت میں دیکھتا تو آرتی گوٹے تو گوٹے ادنیٰ طور بھی عشق کرجاتا۔ بانکوں کی تیغ دیکھیے جب دیکھو دو انگل میاں سے باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انھوں نے کھٹ سے سر دی کا ملا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بغداد کھل گیا، وہ دھکم دھکا، بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی کہ واہی واہ۔ انتظام کرنا خارجی کا کام نہ تھا۔ ادنیٰ سا ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذرِ حسین نہیں نکالتا۔ اب انیس ہیں نہ دبیر۔ مونس ہیں، نہ مشیر، ضمیر ہیں نہ دلگیر۔ لیکن ہاتھی لئے گا بھی تو کہاں تک اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ دیکھئے یہ آغا باقر کا امام باڑہ ہے۔ ادھر ہو، ادھر ہو، خدا کی قدرت کا مجسم نظر آتا ہے، واہ میاں باقر کیوں نہ ہو، نام کر گئے گلی تنگ تماشائیوں کی ٹھل ٹھمک، مگر خلقت گھسن بیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے۔ آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہونچے سبحان اللہ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضوان، الٰہی یہ مکان ہے یا باغِ جناں پھر وہ دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرام گاہ کا نام روشن ہے۔

لکھنؤ کے محرم اور چہلم نے ایک تہذیبی اہمیت اختیار کر لی تھی کیونکہ اس میں عقیدے، علم، فنونِ لطیفہ، شاعری، صناعی اور علم مجلس کا امتزاج تھا۔ سرشار نے اس کا لحاظ کیا ہے۔ اور محرم کے سلسلے میں لکھنؤ کی کمالِ فن کے ان پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔ یہی حال بسنت اور ہولی کی بہاروں اور آٹھوں کے

جن پیدا ہو جاتی ہے لیکن لکھنؤ اپنے ہر روپ میں نیا اور ہر رنگ میں انوکھا ہے۔ آپ اسے جس پہلو سے دیکھیں، جس عالم میں دیکھیں وہ دل کو کھینچتا ہے۔

کل سے لکھنؤ میں محرم کا مہینہ اپنی پوری سوگواری کے ساتھ شروع ہو رہا ہے شاہانِ اودھ کے زمانہ میں محرم محض مسلمانوں کے ایک گروہ کا غمناک تیوہار نہیں تھا، یہاں کی مکمل زندگی تھا۔ اس سے ہر چھوٹے بڑے، امیر و غریب، ہندو مسلمان اور عورت مرد کا کسی نہ کسی شکل میں تعلق تھا۔ سرشار نے فسانہ آزاد کی ابتداء ہی میں اپنے ہیرو آزاد کو لکھنؤ کا محرم دیکھنے کا موقع دیا ہے سرشار کے الفاظ میں آپ یہ بھی منظر دیکھئے ـــ

"میاں آزاد" چل کھڑے ہوئے کہ چل کے لکھنؤ کا محرم دیکھ لیں ـــ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین، گھر گھر بکا و بین ہیں۔ گریہ و زاری، اشکباری، جم غفیر، مجمع کثیر، ایک جلے تن بول اٹھے کیوں نہ ہو۔ مجالس عزا کی دھوم دھام ہے لکھنؤ کا محرم الحرام ہے، لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی یش بیانی، لکھنؤ کی عزا داری، لکھنؤ کی سوگواری از شام تا روم مشہور در و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم دھام ہے امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے۔ ان کے ساتھ ایک دوست بھی ہو لئے تھے ان کی بیقراری کا حال کچھ نہ پوچھئے، وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے لوٹے جاتے تھے کہ شہید کربلا کا واسطہ آل مصطفےٰ کا صدقہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے ایک شخص نے ایک آہ سرد

بھٹیارن :- اس دم میں بندی نہ آنے گی ایسی باتوں میں نہ آنے کی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے اسامی ہو تو ایک گنڈا چھکے سے نکال دو نہ! اے واہ میاں بڑا گھراپن دکھاتے ہیں، یہاں اس ۱۹ برس کی عمر میں ہزاروں ہی چرا ڈالے ہوں گے۔

شاعر - یہ مرطرچڑی ہے یا بھٹیارن۔ عورت ہے یا ڈائن، اڑی مُوا ڑی، صاحب للہ اس سے پیچھا چھڑاؤ ورنہ ریش مبارک پر ہاتھ ڈالا ہی چاہتی ہے بھئی ایسی بھٹیارن دیکھی نہ سُنی۔

بھٹیارن - میاں کچھ بید مے تو نہیں ہوئے ہو۔ یا بّلی نانگھ کر گھر سے چلے تھے۔ یہ لام کاف ذری زبان سے نہ نکالو ــــ ہوں چھوٹی تو کیا ہوا پر بس کی گانٹھ ہوں ــــ میرے کاٹے کا منتر نہیں۔ تم لوگ غل کیوں کرتے ہو، میاں میں اپنے دو پیسے سے درگزری۔ بلی بخشے، چوہا لنڈورا ہی جئے گا۔ تم نے تو غل مچا مچا کر میرا کلیجہ پکا دیا۔ ناکوں دم آگیا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا سمیت دفاں ہوں تو میں خوش میرا اللہ خوش۔ یہ بات، وہ بات، ٹکا لے میرے ہاتھ، اے واہ دیکھی تیری کالپی اور باون پوٹے اجاڑ، میاں ہوں تو ابھی چھ چھ سات آٹھ دن کی ۔ مجھے تو نگوڑی گنتی بھی نہیں آتی۔ کل ناک پر تو مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ ایک بگڑے رئیس جنھیں بٹیر بازی سے دلچسپی ہے اپنے سیتوں اور مصاحبوں میں وقت گزار رہے ہیں۔ خوجی کو بھی بلا لیا گیا ہے کہ لطف صحبت دوبالا ہو۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ سب بٹیر اڑ گئے۔

میلان کا ہے۔ رئیسوں کے صدہا بانکوں کے زور شور اور شہر کے ہنگاموں سے مرقعے نہ جانے کتنے رسالے بنتے گئے ہیں۔ ایک خاص زندگی کا یہ رنگین البم مبالغہ اور خیال آرائی کے باوجود متحیر کر دینے والی دلکشی کا حامل ہے۔

ہوٹلوں اور مہمان خانوں کے دور سے پہلے ہندوستان اور یورپ میں سرائیں اس کمی کی تلافی کرتی تھیں ہندوستان میں بھٹیاریاں سراؤں کی نگراں ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کی ایک ایسی ہی سرائے میں بی اللہ رکھی بھٹیارن ہیں۔ مگر شکل وصورت، رفتار گفتار اور جلت پھرت میں دوسری بھٹیارنوں سے ممتاز ہیں فسانہ آزاد ان کے کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک سطر سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ زمانہ وہ ہے جب گلی گلی مشاعرے ہوتے تھے اور چار شاعر کہیں اکٹھا ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ چند شاعر اللہ رکھی کی سرائے کے ہاٹے میں جمع ہیں اپنے اپنے کلام کی خوبی کے لئے لڑ رہے ہیں اور طے ہوتا ہے کہ کسی اور کے پاس چل کر فیصلہ کرائیں کہ کون بہتر ہے جب یہ لوگ چلنے لگتے ہیں تو بھٹیارن اتنی دیر کا کرایہ دو پیسے طلب کرتی ہے۔

بھٹیارن۔ میاں! یہ چتّے کسی اور کو بتانا۔ ہم بھی ہم بھی اس شہر میں اتنے بڑے ہوئے ہیں، ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر مل سیکڑوں ہی موؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوڑی کوڑی بائیں ہاتھ سے رکھ جایئے۔ پھر تشریف کھسکایئے۔

شاعر۔ نیک بخت ہم شریف بھلے مانس ہیں، دو پیسے کے واسطے کہیں بان بیچا کرتے ہیں، چلو دامن چھوڑو، ابھی دم کے دم میں آئے۔

[illegible]
نقرا مرکی؛

مصاحب۔ حضور کو یاد ہوگا رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دانہ تک نہیں چھوا، حضور سمجھے تھے کہ بوندا ہوگیا مگر میں تاڑ گیا کہ یہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔

خوجی۔ جل جلالہٗ، جل جلالہٗ، کیا خان کبریائی ہے، خداوند اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی مگر واللہ باللہ ثم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ ہاں انکھڑیوں میں لال لال ڈورے آ پڑ گئے تھے۔

مصاحب۔ پیر و مرشد یقین جانئے پچھلے پہر سے صبح کاذب تک حق حق کی آواز کا بک سے آیا کرتی تھی۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ صف شکن یادِ خدا میں مصروف ہیں۔

خوجی۔ جل جلالہٗ، جل جلالہٗ، واہ میاں صف شکن علی شاہ۔

اب خوجی کا ذکر آ گیا ہے تو آپ کا تعارف کرائے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہے خواجہ بدیع الزماں اپنی صورت و سیرت سے مجسم شیطان بھی ہیں اور حماقت کے پتلے بھی۔ ان کے بغیر فسانہ آزاد ایک بے جان افسانہ رہ جائے گا۔ ان کی ذات پر مبالغہ اور بے راہ روی کو جائز بنا دیتی ہے اور وہ لکھنؤ کے عہد زوال پر ایک لطیف مگر موثر طنز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کی بزدلی اور ڈینگ، ہوشیاری اور حماقت، افیم اور چانڈو، قرولی اور گھڑی، پانی سے خوف اور مٹھائی سے رغبت سب یادگار ہیں۔ وہ جہاں آتے ہیں کوئی

نواب ـــ سب بازے سب اڑ گئے، ہائے میر اصف شکن؟ اسے جو ڈھونڈھ لاتے ہزار نقد گنوائے۔ اس وقت میں جیتے جی مرمٹا۔ اجی ابے بھئی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنچ کوسی دورہ کریں جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

مصاحب۔ خداوند سمجھانا کیسا؟ وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جو ذرا لکھ پڑھے پھر جنور ہے۔

نواب۔ ہے کوئی؟ دو مرشد اجی حضور

رفقا ـــ حاضر، پیر و مرشد، جی حضور۔

نواب۔ ان پر جوتے پڑیں، لو صاحب ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں، یہ بات کا تماشا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقا ـــ حق ہے، اے حضور وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے

(۱) خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔

(۲) قسم ہے پنجتن پاک کی، میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا

(۳) ایک دن ہنس رہا تھا۔

(۴) اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔

نواب۔ ہائے میر اصف شکن، پیارا صف شکن، یارو وہ کیسی چونچ وہ بتیاں سے کاکن چگنا۔ تھپکی کھائی اور ڈٹ گیا بسنگڑ دن معرکوں میں لڑایا گر کورا آیا۔ وہ دو چونچیں ہوئیں اور بٹیر دم دبا کر بھاگا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی تھرا اٹھتی تھی ...... صورت بٹیر کی مگر سیرت

[illegible]

نفرا رکی :

مصاحب ۔ حضور کو یاد ہوگا رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دانہ تک نہیں چھوا، حضور سمجھے تھے کہ بوندا ہوگیا مگر میں تاڑ گیا کہ یہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے ۔

خوجی ۔ جل جلالہ، جل جلالہ، کیا خان کبریائی ہے، خداوند اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی مگر ماشاءاللہ باللہ تم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو ۔ ہاں انکھڑیوں میں لال ڈورے تو پڑ گئے تھے ۔

مصاحب ۔ پیر و مرشد یقین جانئے پچھلے پہر سے صبح کاذب تک حق حق کی آواز کا بک سے آیا کرتی تھی ۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ صف شکن یاد خدا میں مصروف ہیں ۔

خوجی ۔ جل جلالہ، جل جلالہ، واہ میاں صف شکن علی شاہ ۔

اب خوجی کا ذکر آ گیا ہے تو آپ کا تعارف کرائے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہے خواجہ بدیع الزماں اپنی صورت و سیرت سے مجسم شیطان بھی ہیں اور حماقت کے پتلے بھی ۔ ان کے بغیر فسانہ آزاد ایک بے جان افسانہ رہ جائے گا ۔ ان کی ذات بہر مبالغہ اور بے راہ روی کو جائز بنا دیتی ہے اور وہ لکھنؤ کے عہد زوال پر ایک لطیف مگر موثر طنز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ان کی بزدلی اور ڈینگ ہوشیاری اور حماقت، افیم اور چانڈو، قرولی اور گھوڑی، پانی سے خوف اور حسینوں سے رغبت سب یادگار ہیں ۔ وہ جہاں آتے ہیں کوئی

نواب۔ سب! اف سب اڑ گئے، ہائے میر صف شکن! ایسے جو ڈھونڈھ لائے ہزار نقد گنوائے۔ اس وقت میں جیتے جی مر مٹا، اُف اُف ابھی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنج کوسی دورہ کریں جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

مصاحب۔ خداوند سمجھانا کیسا، وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جو رلالکھ پڑھے پھر جنور ہے۔

نواب۔ ہے کوئی؟ پیر و مرشد! جی حضور

رفقاء۔ حاضر، پیر و مرشد، جی حضور۔

نواب۔ ان پر جوتے پڑیں، لو صاحب ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں، یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقاء۔ حق ہے، اے حضور وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے

(۱) خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔

(۲) قسم ہے پنجتن پاک کی، میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا

(۳) ایک دن ہنس رہا تھا۔

(۴) اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے

نواب۔ ہائے میر صف شکن، پیارا صف شکن، یارو وہ کیسی چونچ وہ بیتابی سے کاٹ کر چگتا۔ جھکی کھائی اور ڈٹ گیا۔ بسنیکڑوں معرکوں میں لڑا با گر کورا آیا۔ وہ دو چونچیں ہوئیں اور بشیر دم دبا کر بھاگا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پانی بھرا اٹھتی تھی ..... صورت بشیر کی مگر سیرت

صورت ہی بدلتی ہے تو یہ کتنی بڑی بات ہے۔

آزاد۔ کل ہم روم جانے والے ہیں چلتے ہو ساتھ۔

خوجی۔ نہ چلے تو اس پر بھی لعنت، چلے اس پر بھی، ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

آزاد۔ مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا اتنا یاد رکھئے گا۔

خوجی۔ اجی افیم ملے گی کہ وہ بھی نہ ملے گی، بس تو پھر ہم اپنے چانڈو بنالیں گے۔

ہزاروں مناظر میں سے یہ چند مناظر ہیں جن میں اس زندگی کی خوبیوں اور خرابیوں کا واضح عکس ہے جیسے ایک صدی کے اندر لکھنؤ نے جنم دیا تھا۔ جس کے حسن میں حسن بہار کی کیفیت اور جس کی بہاریں خزاں کی وہ بے رونقی پوشیدہ تھی جو پھولوں، پتیوں کے ڈھیر مرجھائی ہوئی شکل میں چھوڑ جاتی ہے۔ فن کار کی حیثیت سے سرشار نے اسے زندگی بخش دی ہے۔ اب یہ پھول کبھی نہ مرجھائیں گے۔

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

نہ کوئی گل کھلاتے ہیں۔ آزاد سے انھیں اور آزاد کو ان سے جو محبت ہے وہ ان دونوں کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ موقع وہ ہے کہ حسن آرا نے آزاد کو ترکی جانے کا حکم دیا ہے۔ سفر کی تیاری ہو رہی ہے دربان نے ٹوک دیا ہے کہ صورت شریفوں کی سی نہیں ہے۔ خوجی آزاد کے پاس آتے ہیں۔

خوجی ـــ ابی اک ذرا آئینہ تو بھیجدینا۔ آئینہ بھیجئے گا ذری۔

آزاد ـــ یا وحشت! یہ آئینہ کیا ہوگا۔ بندگی نہ سلام، نہ مزاج پرسی، نہ بات چیت آتے ہی آئینہ یاد آیا۔ بندہ کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دے گا۔

خوجی ـــ اجی بھیجئے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جھوٹ ہو گئی ہے اس بد تمیز مردود کا کہنا ہے کہ تمہاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں، اب کوئی اس گیدی خر سے پوچھے تو پھر کیا جلاد کی سی ہے یا پاجی کی سی۔ ذرا آئینہ بھیجئے۔ میں دیکھوں تو مجھے خود شک ہو گیا۔

ـــ بھئی اگر سچ پوچھتے ہو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمہاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے خدا چاہے باجی بنائے مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔

مگر اس کا کیا علاج۔

خوجی ـــ واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس۔ ڈاکٹروں نے مردے تک جلا لینے کا بندوبست کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں

طلوعِ فکر

اختر علی تلہری

جوش ملیح آبادی کا ہندوستان سے پاکستان ہجرت فرما جانا ماضی قریب کا یقیناً بڑا ہی غیر متوقع افسوسناک سانحہ ہے۔ ان کی اس غیر دانشمندانہ روش کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی لیکن جہاں تک ان کی فنی عظمت کا تعلق ہے وہ اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

مختلف کمزوریوں کے باوجود جوش ملیح آبادی کا فن شاعرانہ رفعتوں کا امین ہے تخیلی ندرتوں کا خزانہ ہے۔ پاکیزہ تشبیہوں اور لطیف استعاروں کے حسن استعمال نے ان کے سخنہائے دل پذیر میں سحر و اعجاز کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ فطری مناظر اور دوسرے محسوسات کی حسین تصویریں کھینچنے میں انھیں غیر معمولی کمال حاصل ہے دنیوی عشق و عاشقی کے بطن سے پیدا ہونے والے جذبات اور رندی و سرمستی کے سایہ میں ابھرنے والے احساسات کے جو دلکش مرقعے جوش نے ہمیں دیئے ہیں ان کے خدوخال کے تیکھے پن کا انکار کرنا ذوقی بصارت اور تنقیدی بصیرت دونوں ہی کے آئین کے منافی ہے۔

جوش کے سرمایہ سخن میں صرف مادی ذوق ہی کو تسکین دینے والی چیزیں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے باطن کے نہ دبنے والے رجحانات کے دباؤ کے

بیان متعلق "ماہنامہ فروغ اردو"

فارم ۴

۱۔ شائع ہونے کی جگہ :۔
نعمت اللہ روڈ لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت :۔
ماہ نامہ

۳۔ پرنٹر کا نام :۔
سید انصار حسین

۴۔ قومیت :۔
مسلمان

۵۔ پتہ :۔
مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ

۶۔ پبلشر کا نام
سید انصار حسین

۷۔ قومیت :۔
مسلمان۔

۸۔ پتہ :۔
مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ

۹۔ ایڈیٹر کا نام
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

قومیت :۔
مسلمان

پتہ :۔
نصیر منزل کوچۂ میرجان لکھنؤ

ان افراد کے نام اور پتے جو اخبار کے مالک ہوں اور ان حصہ داروں یا ساجھے داروں کے جن کے پاس مجموعی سرمایہ کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصے ہوں۔
محمد حسین علوی

میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ جہاں تک میری اطلاع و علم ہے متذکرہ بالا حقائق بالکل صحیح ہیں۔
پبلشر و پرنٹر کے دستخط :۔ سید انصار حسین یکم اپریل ۵۵ء

جسے کراچی کے ایک مطبع نے حسن کتابت اور حسن طباعت اور دیدہ زیبی کے تمام لوازم ملحوظ رکھتے ہوئے شائع کیا ہے۔

اس نغز دل آویز نظم کا آغاز اس بند سے ہوا ہے ؎

جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب
کانپے نجوم، زرد ہوا روئے ماہتاب
کھنکے فلک کے جام کھلے سرخیوں کے باب
اڑنے لگا عبیر برسنے لگی شراب
رنگوں کی آب و تاب چھلانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

قادر الکلام شاعر نے تشبیہات و استعارات کی اسی شاعرانہ دھوم دھام سے سورج کے طلوع کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے نمودار ہونے کے ان دلکش اثرات کو دکھلایا ہے جن کا ظہور زمین اور اس کے متعلقات پر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کے کہیں کہیں سے تین چار بند اور سنئے۔

ہلتی سی ٹہنیوں میں زر افشاں سے برگ و بار
اٹھتی سی چلمنوں سے جھلکتا سا روئے یار
جنباں سی تیرگی میں سلونے سے مرغزار
رقصاں سی روشنی میں سہانا سا روزگار
دن ہے کہ رات ایک تزلزل سا رائے میں
طفلی کا اضطراب جوانی کے سائے میں

تحت ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن سے مذہبی تفکر کو کچھ نہ کچھ صالح غذا ملتی ہے۔ ا
ان سے دینی عقیدت کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ان کی ان مذ
نظموں سے ہے جن میں اتنک گھلائے سرسید کی حیثیت" ذاکر سے خطاب
اور حسین و انقلاب" کو حاصل تھی۔

۱۹۳۵ء سے "اشتراکی ادب" کو ہندوستان میں فروغ حاصل ہونے
لگا تھا اور اس سلسلے میں غیر صالح ادب کا ہر طرف خاصا زور وشور ہو گیا تھا
جوش بھی اس رو میں بہہ گئے۔ ان کی اشتراکیت کا راستہ جذباتی تھا چنانچہ اس
اثر کے تحت ان کی فکر کے تلے بہت سی قابل اعتراض تحریریں ٹپکتی رہیں۔ اسلا
صالح اور صحت مند تنقیدوں نے الحادی اور عریاں ادب کا وہ زور وشور ادور کر
ختم کر دیا ہے اب ان کی تازہ نظمیں دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے
اشتراکی عقیدے میں بھی اضمحلال رونما ہو گیا ہے۔

یوں تو حضرت علیؑ اور اہلبیت اطہارؑ سے انھیں ہمیشہ ہی عقیدت رہا
ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے اپنے تاریک ترین دور میں بھی اپنی
اس خوش عقیدگی میں فرق نہیں آنے دیا ہے لیکن حال میں صد سالہ جشن یادگار
مرتضویؑ کے موقع پر جو انھوں نے تازہ بتازہ فکر انگیز مسدس "طلوع فکر"
کے نام سے پیش کیا ہے اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اب ان کی
خوش عقیدگی کے اس بلند ایوان کے اساس میں صائب الیاتی تفکر بھی شدت
سے شامل ہوتا جا رہا ہے۔

"طلوع فکر" مسدس کی شکل میں جوش صاحب کی تازہ طولانی نظم ہے

اُمنڈی ہوا کی موج پہ گلزار نے ملا
کنگنا کلائی میں جو بندھا کھل گئی فضا
کلیوں کو دھوپ چھاؤں کا جوڑا عطا ہوا
بدھی پڑی گلے میں تو گلزار جھوم اٹھا

اترا گلاب و قند جاد و نبات پر
سہرا بندھا جبینِ عروسِ حیات پر

یہ زورِ تخیل اور ندرتِ بیان پر مشتمل تمہید تیس بندوں میں ختم ہوئی ہے اور پھر شاعر اپنے اصلی مقصود جناب امیرؑ منقبت کی طرف متوجہ ہوا ہے گریز بھی نہایت پر لطف ہے تین بند اس سلسلے کے درج کئے جا رہے ہیں:-

لو نہیں فرازِ روح پر ابھرا اک آفتاب
دیں کا نشاں خرد کا علم آگہی کا باب
حق ساز و حق نواز و حق آواز و حق مآب
مقصودِ عرش مورثِ افلاک بوتراب

عرفانِ زندگی کا علم کھولتا ہوا
بندِ قبائے لوح و قلم کھولتا ہوا

پیدا ہوا سرودِ ازل سلسبیل میں
تری شعاع سینۂ فکرِ جمیل میں
روشن ہوئے چراغ دیارِ خلیل میں
جنبش ہوئی دوبارہ پرِ جبرئیل میں

اعضا کے پیچ و تاب میں خواب گراں کی رو
انفاس مشکبار میں سوز نہاں کی رو
رنگیں لبوں پہ آتش آب مغاں کی رو
آنکھوں کی سطح سرخ پہ اک داستاں کی رو

غلطیدہ فصل گل کی گھٹا چشم ناز میں
روداد شب تموج زلف دراز میں

انگڑائیاں جو آئیں تو آنکھیں چھلک گئیں
رگ رگ میں ولولوں کی کمانیں کڑک گئیں
رخسار پر شباب کی کلیاں چٹک گئیں
چوڑیاں خموش پڑی تھیں کھنک گئیں

موباف میں اسیر شب تار ہو گئی
جوڑا بندھا تو صبح نمودار ہو گئی

گھر سے چلے تو گھر گئے کرنوں میں سیم تن
سونا ہوا شباب کی چاندی پہ ضو فگن
می سے بڑھ گئی لب و رخسار کی پھبن
ہیرے کی تختیوں پہ مچلنے لگی کرن

چہروں کی آب و تاب جنوں خیز روپ میں
یا چاندنی کھلی ہوئی نو عمر دھوپ میں

کالیں جو خاک کے ارماں ہیں مضمحل　　سینے میں اس زمیں کے دھڑکتا نہیں ہو دل

ڈوبی ہوئی ہے نبضِ جہانِ علیل کی

پیدا کر اس جمود میں روِ سلسبیل کی

خاتم پیمبر آفاق کے نگیں　　اے کارسازِ نورو کلاہِ سرِ یقیں

بات کو زمیں پہ کوئی جانتا نہیں　　یعنی خدا سی چیز بھی موجود ہے کہیں

کوئی زمیں پہ تو ہے نہ ہو آسمان پر

بنیاد اعتقاد رکھ اپنی زبان پر

شمع ذات خیمۂ الفاظ میں جلا　　لیلائے حق کو محملِ تقریر میں بٹھا

ن بشر کو چشمِ حقیقت نگر بنا　　کانوں سے لوگ دیکھ سکیں جلوۂ خدا

تیرے بیاں پہ غلغلہ اٹھے درود کا

یوں پیش کر ثبوت خدا کے وجود کا

تجھ کا تیری فکر سے ہر گوشۂ جمال　　لائیگا تو خیال کے موسم میں اعتدال

ن کے ذہن میں ہیں جو اشکال و خیال　　اک تو ہی لا سکے گا ان اشکال پر زوال

یہ تو کہے گا جلوہ بجز واہمہ نہیں

جو دیکھنے میں آئے وہ بت ہے خدا نہیں

یا کو تو بتائے گا یہ نکتۂ جمیل　　یعنی ازل سے ایک توانائی جلیل

ہ کی کوئی نظیر نہ جس کا کوئی عدیل　　اس کارگاہ وقت گریزاں کی ہو کفیل

اضلال و انجذاب نہ وہ انعکاس ہے

دنیا سے دور ہی نہ وہ دنیا کے پاس ہے

چھننے لگی شعاع تفکر کے بابا سے
پھوٹی کرن جبین رسالت مآب سے

نکھرا ادب خیال کو حاصل ہوئی زباں
دمکی جبین حرف یہ معنی کی کہکشاں
چھلکیں شراب نغمۂ حق کی کلابیاں
داؤدیت نے پیش کیا تاج زرفشاں

یوسف بڑھے جمال فراواں لئے ہوئے
پریاں در آئیں تخت سلیماں لئے ہوئے

جوش کی مدح کے لہجہ میں شاندار انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس کا تار و پود غیر فطری قسم کے واقعات سے تیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں سنجیدہ تفکر سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس سرچشمۂ علم کی مدحت سرائی میں انھیں اوصاف کو چنا گیا ہے جن سے اس حکیم معجز انفاس کی بلند حکیمانہ شان کی کسی نہ کسی حد تک تصویر کشی ہو سکے جوش کی اس سعی جمیل نے مسدس کے مدحیہ حصہ میں غضب کا شاعرانہ جلال پیدا کر دیا ہے اور اس صنف سخن کے لہجے کو غیر معمولی وقار بخش دیا ہے چند منتخب بند دیکھئے اس کی تصدیق ہو سکے

شب ہائے این و آں میں ہوئی صبح منجلی با دمراد ناز سے مچلی گلی گلی
عرفان کائنات کی جھپکی کلی کلی اور روح ارتقا نے پکارا کہ اے علی

لے یہ کلید علم یہ گیتی کا باب ہے
اس خاک کو ابھار کہ تو بوتراب ہے

اٹھ اور جلا چراغ سر بزم آب و گل لا خشکیوں کو کھینچ کے حشو کے متصل

نبّاضِ شرع و زورقِ بحرانِ زندگی
خاقانِ دہر و واضعِ قانونِ زندگی

برادجو دیاک نظر گاہِ مہر و ماہ		آنکھیں چراغِ کعبہ، زباں سازِ لا الہ
نقشِ قدم جبینِ سماوات کی کلاہ		ام الکتاب چہرہ تو جبریل میں نگاہ

شکلِ بشر میں آیۂ صدق و صفا ہے تو
اک ذی نفس دلیلِ وجودِ خدا ہے تو

لہرے ضمیرِ ذہن کو حاصل ہوا سرور		ایوانِ جاں کے طاق میں چمکا چراغِ طور
الفاظ آسماں کے منور ہوئے تصور		قرآں کے حرف میں داخل ہوا شعور

ذوقِ سخن کو قوتِ اعجاز مل گئی
تخئیلِ کردگار کو آواز مل گئی

فیضِ نظر نے خاک کو بستاں بنا دیا		ہر ریشۂ گیاہ کو مژگاں بنا دیا
ہر خار و خس کو سنبل و ریحاں بنا دیا		ہر شاخِ بے ثمر کو رگِ جاں بنا دیا

بے آب روز میں کو گلزار کر دیا
تاروں کا رس نچوڑ کے ذرّوں میں بھر دیا

اس طرف جوش کی شاعری کی تنقیص میں بعض ناقدین نے طولانی مضامین لکھے اور ان کی شاعری کی عظمت سے انکار کے لئے اس طرف اس طرف سے گوشے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے تو یہ سب ان کی تنقیدی بدتوفیقی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

جس شاعری کی پیغمبرانہ فکر سے شعری تخئیل کے مذکورہ بالا اعجاز نما زمزمے

انسان کے مزاج کا اس میں نہیں ہے جو / وہ کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہو

وہ شاہ نرم طبع نہ سلطان نیک خو / وہ دلنواز دوست نہ ہمت شکن عدو

وہ پاسبند رسم وفا و جفا نہیں

جذبات جس پہ ٹوٹ پڑیں وہ خدا نہیں

ہاں دل کو تو کرے گا سیہ رات سے جدا / وزنی حقیقتوں کو روایات سے جدا

اللہ کو تمام قیاسات سے جدا / اسماء و وصف و سمت اشارات سے جدا

داغوں سے تو ابد کے ورق کو بچائے گا

شخصی تعینات سے حق کو بچائے گا

اے صدق کے محیط، حقائق کے آبشار / اے فن کے بادشاہ معارف کے تاجدار

اے علم کے خدیو تفکر کے شہریار / نوع بشر کو فکر و عمل کی طرف پکار

ہاں صبح زندگی کی شفق ہے ترا وجود

ایفائے عہد رحمت حق ہے ترا وجود

جلوت میں بادشاہ ہے خلوت میں تو فقیر / جنگاہ میں جوان حریم خرد میں پیر

دشت وغا میں طبل ادب گاہ میں صریر / میدان میں حدید مقالات میں حریر

سو معجزوں کا عطر ہے تیری حیات میں

اللہ کس قدر ہیں تری ایک ذات میں

ماہر ادب، مفسر آیات دل نشیں / نقاد فن مصور اشکال ماء و طین

تیرا دماغ محور دل مصدر یقیں / دستور حق مبصر دنیا فقیہ دیں

شید کی جبیں جو ذرا سی چمک گئی لیلائے تیرگی کی کلائی مڑک گئی
ایک ضو جو دازِ شفق سے چھلک گئی گویا شراب شند سے مینا درک گئی

تبت عقب نے ہنس کے جو گھونگھٹ اٹھا دیا
مشرق نے اک شراب کا دریا بہا دیا

خورشید کی جبیں کے چمکنے سے لیلائے تیرگی کی کلائی کا مڑک جانا استعارے
ںا نازیبا استعمال ہے چمکنے اور کلائی کے مڑک جانے میں کوئی تعلق بھی
ںا ہے اس لئے یہ اسلوبِ ادا محض زبردستی کی بات ہے۔

ایک دوسرا بند ہے۔

ںا ہوئے دلوں پہ بلوریں تصورات پائی غیام ذہن نے زرلفت کی قنات
ے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات چومک لئے ہوئے حرکت کی چلی برات

خورشید کے ورود سے گلزار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

کولے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات" یہ غیر سنجیدہ اندازِ بیان
سنجیدہ نظم میں کہیں سے نہیں کھپتا جوش کے یہاں اس قسم کی مستانہ خرامیاں
ی دوسری نظموں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور انصاف کی بات یہ ہے کہ
نظم کے ڈھانچے میں عیب ضرور پیدا ہو جاتا ہے ایک اور بند ہے:۔

ات نبت راوی و جمنا و نیل و گنگ ہیں سرود و بربط و عود و رباب و چنگ
ہ و بانہ و طاؤس و جل ترنگ شعر و شباب و شاہد و شہ ناز و رقص و رنگ

ظہور پذیر ہو سکتے ہوں اس کے متعلق یہ کہنے کی کون جسارت کر سکتا ہے کہ اس کے کلام میں فکر کی توانائی، تخیل کی برنائی، انداز بیان کی ندیانی اور تشبیہ اسلوب کی رعنائی موجود نہیں ہے۔ جوش کے اس شعری کارنامہ کا خاتمہ ان بندوں پر ہوا ہے۔

ایوان سلطنت کے وہ در غرق ہو گئے　　جن میں ہوا بھری تھی وہ سر غرق ہو گئے
وہ قصر ہائے لعل و گہر غرق ہو گئے　　اٹھی لہو کی موج کہ مغرور غرق ہو گئے
چلے علم وہ گنبد بدر و حنین پر
دمکا وہ تاج فتح جبین حسینؑ پر

ے دشت کی سمت سے آنے لگی صدا　　اے جوش نکتہ سنج مری انجمن میں آ
آ اور جھوم جھوم کے نغمات نو سنا　　ساقی مرا سلام ادب کے کہ میں چلا
مولائے کائنات اور آواز دے مجھے
اے جبرئیل قوت پرواز دے مجھے

کاش کہ جوش سچے طور سے اسے محسوس فرمالیں کہ مولائے کائنات کی بارگاہ میں حقیقی رسائی کی شرط اولین یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مکمل صحت مند انقلاب پیدا کر لیں اور صحیح معنوں میں علوی سیرت و کردار کے نقش قدم پر چلنا شروع فرمائیں۔ اس کے بغیر تو یہ سب سخن آرائی دم بے قدم ہی کے مظاہرے ہیں وہ کتنے ہی شاندار اور دلپسند کیوں نہ ہوں۔

اس دل پذیر مسدس میں بعض مقامات قابل نظر بھی ہیں۔ ابتدا ہی میں ایک بند ہے ؎

برسات کی ہو لئے معطر کا واسطہ
میخانہ کھول ساقی کوثر کا واسطہ

اس بند میں انھوں نے دو جگہ ہندی و فارسی الفاظ میں باقاعدہ فارسی عطف کا استعمال کیا ہے یوں تو قاعدے کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہے مگر اس میں زیادہ تشدد کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن قاعدے سے اس انحراف کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جوش صاحب نے یہ نوٹ بھی دیا ہے۔ اگر صوتی اکراہ نہ پیدا ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت ایک مستحسن اقدام ہے۔

اسے کیوں مستحسن اقدام قرار دیا گیا ہے جواز کی بات دوسری ہے لیکن اس میں استحسان کہاں سے پیدا ہو گیا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نوٹ میں انھوں نے "اکراہ" کا لفظ بھی صحیح محل پر استعمال نہیں کیا ہے "اکراہ" کے معنی زبردستی کرنے کے ہیں۔ کراہت کے نہیں ہیں۔ ایک اور بند ہے۔

گرجا فلک پہ ابر بھرے مغبچوں نے جام　　چہروں پہ رنگ مل کے جھلکنے لگے خیام
صل علیٰ کی موج سے گونجے ستون و بام　　قدسی تمام دوڑ پڑے بہر انتظام
محراب حق کا نور نے پردہ اٹھا دیا
سجادہ آسماں نے زمیں پر بچھا دیا

"چہروں پہ رنگ مل کے جھلکنے لگے خیام" میں بہت دور سے استعارہ لایا گیا ہے اور بالجبر لایا گیا اور ستون و بام کا صل علیٰ کی موج سے گونجنا بھی زبردستی ہے اس قسم کے مقامات طلوع فکر میں اور بھی نگاہ غور کو مل سکتے ہیں لیکن ان تمام خردہ گیریوں کے باوجود مسدس کی عظمت پر فرق نہیں آتا اور وہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔

۱۔ اس کی تمنا کتنی حسین ہے۔
۲۔ ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے۔

عبور نانپاروی کی غزل سے نشست کا آغاز ہوا۔ جنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں غزل سنائی اور اس عارضی خوشی کو موت کے مترادف سمجھا۔ دیکھئے کہتے ہیں۔

سامان کیا کریں ہم اپنے لئے خوشی کے — افسانے سن چکے ہیں ہم جو نئی زندگی کے

عبور نانپاروی کے بعد ساحر لکھنوی کی باری تھی۔ ساحر کا ترنم اور ان کے اشعار کی روانی سے غالباً سامعین پہلے ہی سے آشنا تھے۔ اس لئے ان کا نام آتے ہی مجمع میں کچھ زندگی آ گئی۔ ساحر نے اپنی غزل سے سامعین کا دل رکھ لیا اور اچھے ترنم کے ساتھ ایک ایسی غزل سنا دی جس میں صبحِ نو کا پیام بھی تھا اور غم دوراں کی جھلکیاں بھی ملاحظہ ہوں۔

تیرا نفاذِ شب تمہیدِ صبحِ نو ہے — در اصل غم کے بادل پیغام ہیں خوشی کے
اے غم زمانہ تجھکو بھی ساتھ لے کر — سازِ غزل پہ گائیں نغمات زندگی کے
لحظہ فکرِ دوراں ہر لمحہ یادِ جاناں — یہ ناز کون اٹھائے دودن کی زندگی کے

ساحر کے بعد محسن عثمانی کو زحمت دی گئی۔ سامعین پیرو روش کو ایک نئے انداز میں پہلی بار پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے۔ محسن عثمانی نے روش کے اندازِ ترنم کو اپنانے کے بجائے تحت میں غزل سنائی اور اپنی غزل کے ذریعہ ذوقِ عمل کا پیغام دیا۔

ذوقِ گل گر دل میں نہیں ہے — عشق بھی اک زندانِ بلا ہے

محفل شعر و ادب

نمائندہ خصوصی کے قلم سے

بزم شعراء کی چودھویں نشست ۱۶ مارچ ۵۸ء ۲ بجے دن کو نواب سید اعزاز رسول صاحب کے دولتکدہ واقع مال اوینو پر منعقد ہوئی۔ اس نشست کی صدارت ابتداء میں حافظ محمد ابراہیم صاحب نے فرمائی اور پھر نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے فرائض صدارت انجام دئیے۔

اعزاز رسول صاحب کی قیامگاہ کے سبزہ زار پر ایک خوبصورت شامیانے میں منتخب شعراء اور صاحب ذوق سامعین کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ جن میں وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند، مولوی مظفر حسین وزیر سماج لفظ گووند سہائے اور دوسرے بہت سے ممبران اسمبلی کے علاوہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور شہر کے ممتاز علم دوست حضرات موجود تھے۔

اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں سندیلہ اور ہردوئی کے سامعین بھی اچھی تعداد میں تھے جو سفر کی تمام دشواریوں کے باوجود شعر سننے کے لئے آئے تھے۔ سامعین میں ادب نواز خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔

اس کامیاب نشست میں جن شاعروں نے شرکت کی ان کی طبع آزمائی کے نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ دی گئی تھیں۔

صاف ستھری غزل سنائی۔ اُن کے اشعار میں ان کے تجربات کی جھلکیاں صاف صاف نمایاں تھیں۔ آپ بھی ان کے تجربات سے سبق لیجئے۔

اپنا انھیں نہ سمجھو دھوکے میں زندگی کے — یہ شمع / چاند / تارے ساتھی نہیں کسی کے
گذرے اگر سکون سے دو چار دن کسی کے — اسباب کچھ تراشے دنیا نے دشمنی کے
خوش فہمیوں کے مارے بس اتنا کہہ رہے ہو — ہیں آسرے ہی دشمن دیر پائندگی کے

انجم شاہانی کے بعد مائیکروفون مظہر شوائی کے روبرو تھا۔ دبلے پتلے اور منحنی سے شاعر نے اچھی خاصی تندرست آواز میں اپنی غزل کے بہت سے اشعار پر سامعین سے داد لی۔

سامنے وہ محراب جبیں ہے — اب میرا سجدہ عین یقیں ہے
وہم و گماں کا پھیر ہے ورنہ — کوئی بھی منزل دور نہیں ہے
اپنے مقدر سے ڈرتا ہوں — آپ کے وعدے کا تو یقیں ہے

اب جناب سراج لکھنوی کے چشم و چراغ معراج لکھنوی کی باری آئی۔ معراج سے اردو داں طبقے کو بڑی توقعات ہیں کہ وہ سراج صاحب کی روایات کو روشن رکھیں گے۔ اس نشست میں انہوں نے جو غزل سنائی اس کے یہ دو اشعار خوب ہیں۔

پرسے اٹھا دئے ہیں ذہنوں کی تیرگی کے — بجھنے دیے جلا کر انسان دوستی کے
بخشا ہے غم تو دیدے طول اور امتحاں کو — گر بڑھ سکیں بڑھا دے لمحے تو زندگی کے

معراج لکھنوی کے بعد امتیاز ادیب کو مائیکروفون تک آنے کی زحمت دی گئی۔ اس ابھرتے ہوئے شاعر نے بڑی سادگی سے اپنی غزل سنائی اور سامعین سے متعدد

جانے کہاں لے آئی تمنا　　حد نظر تک کوئی نہیں ہے
ان کے ہی جلووں کی ہے رونق　　حسن نظر کی بات نہیں ہے

اب ناظم مشاعرہ جناب امین سلونوی نے عرفان لکھنوی کا نام لیا۔ انھوں نے اپنے ان اشعار پر سامعین سے کافی داد حاصل کی۔

نام اسی کا خلد بریں ہے　　وہ جو ترے کوچے کی زمیں ہے
ہے وہی میرے غم کا فسانہ　　آپ کو اب جو یاد نہیں ہے
ہائے وہ اس کا وعدۂ فردا　　جان رہا ہو پھر بھی یقیں ہے

قادر صدیقی کا نام آتے ہی محسوس کیا گیا کہ شاعروں میں سرگوشیاں ہونے لگیں لیکن قادر صاحب نے بغیر کسی احساس کے اپنی غزل سنائی۔ پتہ نہیں ان کے کلام کا اثر تھا یا پھر صف شعرا و دیگر سامعین ہی نے طے کیا تھا کہ ان کو داد و تحسین سے نہ نوازا جائے۔ ان کا یہ شعر چونکا دینے کا پیش ہے۔

پھر آج اشک آنے ہیں آنسو　　کل کی ابھی تک نم آستیں ہے

اب شفق کانپوری مائیکروفون کے سامنے آئے اور انھوں نے شمع حسن یقین روشن کی۔

حسن یقیں پھر حسن یقیں ہے　　وقت کا یہ محتاج نہیں ہے
بھول گیا ہے راہ زمانہ　　وہ تو جہاں تھا اب بھی وہیں ہے
چرخ سے ہے انوار کی بارش　　سجدے میں اک خاک نشیں ہے

شفق کانپوری داد و تحسین کے بعد جب ڈائس سے اٹھے اور انجم شملائی کا نام لیا گیا۔ شہر کے اس نوجوان سنجیدہ شاعر نے داد و تحسین کے درمیان ایک

دل میں بسا ہے حسن کی دنیا — بزم تصور کتنی حسیں ہے

شعور بریلوی کے بعد احسن طباطبائی فضا میں درد و غم بکھیرتے ہوئے آئے لیکن سامعین نے مسکراہٹوں سے ان کو نوازا اور ان کی غزل سنی ۔

درد کا پہلے شوق بہت تھا — درد کا اب احساس نہیں ہے
یا غمِ دنیا یا غمِ عقبیٰ — غم سے کوئی محفوظ نہیں ہے

اب منے آغاذ کی باری تھی ۔ ڈائس پر آتے ہی سامعین نے ان کی گنگناہٹ سنی جیسے کوئی مغنی گانے سے پہلے اپنی لے درست کرتا ہو ۔ ویسے ہی ذکی صاحب اپنی دھن سٹ کرتے ہوئے تشریف لائے اور ایک ایسی غزل سنائی جس کا ہر شعر ذکرِ محبوب کا حامل تھا ۔

آپ کے دم سے خلد بریں ہے — ورنہ یہ دنیا کچھ بھی نہیں ہے
تیرے ہی نقشِ پا پہ جھکے گی — واقفِ کعبہ میری جبیں ہے
چین نہیں کیوں دستِ جنوں کو — آمدِ فصلِ گل تو نہیں ہے

منے آغاذ کی کے بعد مختصر لکھنوی نے ساز غزل چھیڑا ۔ ان کا نام آتے ہی صاحب خانہ ہمہ تن گوش ہو گئے ۔ مختصر صاحب نے اپنے مطلع ہی پر حاضرین کو چونکا دیا ۔ ان کی پوری غزل ان کے تلخ تجربات کی آئینہ دار ہے :

ان تلخیوں میں بھی ہیں دکھلا رہا ہوں جو بھی — اب تک تو زندگی میں تیور یہی زندگی کے
اہل غرض جو دعوے کرتے ہیں دوستی کے — چھوڑو انھیں یہ سب ہیں پروانے روشنی کے
ہٹ جائے رہبروں پر اب رہزنوں کا دھوکا — کتنے بدل گئے ہیں انداز دلبری کے

مختصر لکھنوی کی کامیاب غزل کے بعد تبسم نظامی نے اپنی غزل سنائی ۔

اشعار پر داد و تحسین حاصل کی۔

لطف و ستم میں فرق نہیں ہے — وہ بھی حسیں تھا یہ بھی حسیں ہے
سجدہ جو مقصودِ جبیں ہے — ممکن ہے آسان نہیں ہے
لغزشیں پیہم تجھ سے بڑھ کر — رہبر کامل کوئی نہیں ہے

اس مشاعرے میں ہم سب ایک نئے شاعر سے متعارف ہوئے یہ تھے ظفر بہانوی۔ ظفر بہانوی کی غزل اچھی تھی دو شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

اے بے حسی کا عالم جیسے ہوں گذار دن — کچھ دن گذر گئے ہیں کچھ دن ہیں زندگی کے
ہے چشم نم کا عالم آنسو جو بہہ چکے ہیں — پیمانہ رکھ دیا ہے جیسے کسی نے پی کے

ظفر بہانوی کے بعد مصور لکھنوی آئے جنھوں نے سازِ غزل پر دل کے ترانے سنائے

دل کے ترانے کون سنے گا — ساز تو ہے آواز نہیں ہے
دل میں خوشی کی ہے جو کرن سی — غم کا نہیں دھوکا تو نہیں ہے

مصور لکھنوی کے بعد قرار لکھنوی کا نام لیا گیا جن کی پوری غزل انتہائی خاموش فضا میں سنی گئی۔ اور یہ دو شعر قدرے پسند کئے گئے۔

جان کا دینا سہل ہے لیکن — عرضِ تمنا سہل نہیں ہے
ہنستے ہیں اربابِ جنوں پر — اہلِ خرد کو ہوش نہیں ہے

اب ہمارے جانے پہچانے شاعر شعور بریلوی کی باری تھی جو اپنے کلام کے علاوہ ناقدانہ نظریات اور سنجیدہ انداز ظرافت میں بھی ایک خاص درجہ کے مالک ہیں۔ اس نشست میں شعور صاحب نے چند ایسے شعر سنائے اور معاملاتِ حسن و عشق اپنے ڈھنگ سے بیان کرنے کی یوں کوشش کی۔

حسن دنیا جتنی حسیں ہے — اتنی فریبِ حسن یقیں ہے

اردو غزل کی جملہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو داں طبقے کے محبوب شاعر بن گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کے ہر شعر پہ حاضرین سے داد وصول کی۔

پھیکی سی اک ہنسی ہے لب پر کلی کلی کے   ممکن ہے اب یہی ہوں معنی شگفتگی کے
کتنے ہی راستے ہیں کتنے ہی راہبر ہیں   پھر کیوں ہمارے سر ہیں الزام گمرہی کے
دن انتظار کے دن راتیں عذاب کی راتیں   سچ پوچھئے تو سنہا وہ دن تھے شاعری کے

ایس۔ این سنہا کے بعد سروش طباطبائی نے اپنا کلام سنایا۔ سروش صاحب کی غزل اور ان کے ترنم نے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔

غم نہیں تو جو پاس نہیں ہے   تیری تمنا مجھے حسین ہے
موت یہاں ہے زیست سے لرزاں   عشق ہے کوئی کھیل نہیں ہے
چشم کرم کا احساں لیکن   دل کو عنایت راس نہیں ہے

اب اناؤنسر نے عمر انصاری کو زحمت دی۔ عمر صاحب اپنے ہمعصر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اپنے کلام اور اردو غزل کو نت نئے راستوں پہ لگانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ دراصل یہی کوششیں ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہیں۔ دیکھئے ان کی غزل جس میں ان کی زندگی کی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں

نئی لئے ہیں کیا کیا دنیا نے خامشی کہ   بدنام ہو گئے ہم کچھ اور ہونٹ سی کے
ہوشیار ہر قدم پہ اے رہروان منزل   ہر موڑ پہ ہیں رہزن رستے میں زندگی کے
دو موت جس سے بہتر وہ زندگی ہی کب ہو   لے آئے جانے کیا ہم دھوکے میں زندگی کے

اب دوسروں کو دعوت شعر خوانی دینے والے کی باری تھی۔ ہیں سلو تو ی مائکرو فون پہ

کوئی نہ سمجھا دل کی حقیقت — دل اک حجاب پردہ نشیں ہے
دامن بچا کر لے دل گذر جا — دنیا غبارِ راہِ یقیں ہے

فطرت نے تبسم اور بہار کو ہمیشہ ایک ساتھ رکھا ہے۔ چنانچہ اس نشست کے اناؤنسر نے بھی تبسم کے بعد بہار کا نام لیا۔ بہار کا پورا نام نردلم لال ہے۔ جو ایسے مشاعرہ میں پہلی بار سنے گئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جس طرح بہار اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ دل کو بھاتی ہے اسی طرح بہار نے بھی سامعین کو اپنے چیدہ اشعار سنائے۔

ذکر خدا اور یاد تمہاری — کس مشکل میں جانِ حزیں ہے
کیا ایسے سجدوں کو کہئے — سر ہے کہیں اور دھیان کہیں ہے
دورِ طرب کی ختم ہیں باتیں — اب تو بہار اک گوشہ نشیں ہے

جگت موہن لال رواں کی ہستی اردو ادب کے لئے ایک ایسی روشن شمع تھی جو وقت سے پہلے بجھ گئی۔ لیکن شعر و شاعری کا جو پودا رواں مرحوم لگا گئے تھے اسے ان کے لائق فرزند سروش اوناوی نے زندگی کی الجھنوں اور فکر معاش کی الجھنوں کے باوجود مرجھانے نہ دیا۔ اور آج بھی رواں مرحوم کے گھر میں شعر و شاعری کا چرچا ہے۔
اس نشست میں پربھات شنکر سروش اوناوی کی غزل بڑی پسندیدگی کے ساتھ سنی گئی

حسن پہ تجھکو ناز ہے لیکن — رنگ وفا کچھ اور حسیں ہے
دل پہ ہزاروں زخم ہیں لیکن — آنکھ میں آنسو ایک نہیں ہے
تیری محبت۔ تیری تمنا — سب کے بس کی بات نہیں ہے

سروش اوناوی کے بعد ایس۔ این سنہا کو دعوت غزل خوانی دی گئی۔ سنہا صاحب نے

نھوں نے غزل میں اختصار سے کام لیتے ہوئے چند ہی شعر سنائے۔

ہم نے بھی خون دیا ہے اک اک کلی کی خاطر　　مالک تمہیں نہیں ہو گلشن کی زندگی کے
آتا ہے حرف جس سے خود داری جنوں پہ　　قائل نہیں ہیں راحت ہم ایسی بندگی کے

اب اس شہر کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر مولانا افقر موہانی وارثی کو زحمت دی گئی۔ افقر صاحب کی غزل ان کے کسی شاگرد نے ترنم سے پڑھی۔ لیکن خوبی کی بات یہ تھی کہ ترنم سے زیادہ افقر صاحب کے اشعار میں کشش تھی۔ ایک زبردست داد و تحسین کی فضا میں ان کی ساری غزل سنی گئی۔

جب سے سمجھ میں آئے اسرار بیخودی کے　　اٹھنے لگے ہیں پردے دل سے میری خودی کے
جس کا سرور ہستی جس کا خمار مستی　　اے دلنواز ساقی دو چار گھونٹ اسی کے
ہر آستاں پہ سجدہ ہر سنگ در کا بوسہ　　آئے نہ پھر بھی ہمکو آداب بندگی کے

مولانا افقر کے بعد مولانا عرشی لکھنوی تشریف لائے۔ عرشی صاحب ایک پرانے شاعر ہونے کے باوجود عام طور سے مشاعروں کو ترک کر چکے ہیں۔ پتہ نہیں موجودہ شاعروں کا غیر سنجیدہ ماحول انھیں راس نہیں آتا یا پھر عدیم الفرصتی موقع نہیں دیتی۔ بہرحال بزم شعراء کے مشاعروں میں شرکت سے ان کے شعری و ادبی دلچسپیوں کے جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ دیکھئے ان کی غزل کے چند اشعار

کیا کیا فریب کھائے دنیا نے آگہی کے　　پھر بھی کھلے نہ اب تک اسرار زندگی کے
اللہ رے اقتدار حسن کمال طاقت　　بندوں نے کی خدائی پردے میں بندگی کے
تم جسکو ڈھونڈتے ہو پندار کے بتوں میں　　وہ رفعت خودی ہے سجدوں میں بیخودی کے

عرشی لکھنوی کے بعد صاحب خانہ کے ملتی شاعر نشتر سندیلوی کو تکلیف دی گئی

اپنا نام بتائے بغیر تشریف لائے ایسے سامعین جو سندیلہ اور ہر دوئی سے یہ شا سننے آئے سے تھے غالباً ان سے متعارف نہ تھے۔ کسی طرف سے آواز آئی اپنا نام بتائیے۔ اس سے پہلے کہ امین صاحب اپنا نام بتاتے۔ ایس ایم سنہا کو کہتے سنا گیا "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے" اور کسی نے امین سلونوی کا نام لے امین صاحب نے اپنی کامیاب غزل اپنے مخصوص ترنم سے سنائی۔ فرماتے ہیں

راہ طلب میں شوق ہے رہبر   منزل مقصود دور نہیں ہے
آج کی دنیا آج کا عالم   کل بھی رہے گا کس کو یقیں ہے
سجدے کئے کس نقش قدم پر   کتنا منور داغ جبیں ہے

امین سلونوی اپنی غزل سنا چکے تو انہوں نے اپنے پرانے ساتھی طپش لکھنوی کو مائیکروفون پر بلایا جنھوں نے امین صاحب کی غزل سے قائم ہوئی فضا کو برقرار رکھا۔ طپش صاحب کا کلام غزل کی جگہ کہنہ روایات کا حامل تھا۔

گلشن میں آشیاں کی اب خیریت نہیں ہے   تیور بتا رہے ہیں صیاد کی ہنسی کے
کیا تھا شعور ہم کو جب کاتب مقدر   ماتھے پہ لکھ رہا تھا حالات زندگی کے

طپش صاحب کے بعد یہ نشست تھوڑی دیر کے لئے ملتوی ہو گئی کیونکہ سامعین و شعرا کو بیگم صاحبہ اور سید اعزاز رسول صاحب نے ایک پر تکلف عصرانہ دیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد دوسرا دور شروع ہوا اور راحت مولائی (ایم۔ ایل۔ اے) کو تکلیف دی گئی۔ مولائی صاحب کچھ تاخیر سے تشریف لائے تھے لیکن مجلس قانون ساز کے ممبر اس مشاعرے کے آئین سے ناواقف تھے اس لئے صاحب خانہ کی سفارش پر انھیں اس بار مشاعرے میں شریک کر دیا گیا۔

ڑھے ہی جاتے ہیں۔ غزل کو نئی راہوں اور نئے خیالات سے روشناس کرنے والے
یں صدیقی صاحب کا بھی بڑا ہاتھ ہے لیجئے اس نشست میں پڑھی جانے والی
امیاب غزل کے چند اشعار آپ بھی پڑھیئے۔

آساں نہیں نبھانا آداب دلبری کے — مانند شمع سوزاں دیکھے تو کوئی جی کے
شمع یقیں بجھا کر، نقش قدم مٹا کر — خود کر لئے فراہم اسباب گمرہی کے
اے چشم گلبداماں سرچشمہ تمنا: — ہم کب سے منتظر ہیں اک جنبش خفی کے
ب اور تجھ سے ناصح ہم کیا کہیں کہ تو نے — انداز دلنوازی دیکھے نہیں کسی کے

صدیقی صاحب کی کامیاب غزل کے بعد اناؤنسر نے مولوی مظفر حسین وزیر
حکومت کو دعوت دی۔ مظفر صاحب کئی مشاعروں کی صدارت کرتے
تو دیکھے گئے تھے لیکن سامعین اور شعراء نے انھیں شاعر کی حیثیت
سے پہلی بار دیکھا۔ انھوں نے ایک مختصر مگر اچھی غزل سنائی۔ ایک
شعر مولانا آزاد کی وفات سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

ہردم ترا تصور ہر شے میں تیرا جلوہ — وہ بھی تھے کیا زمانے آغاز عاشقی کے
شاید مری دعائیں باب اثر کو پہنچیں — آثار کہہ رہے ہیں اس دل کی بیکلی کے
واحسرتا کہ رخصت اک دیدہ ور ہوا ہے — اخبار کہہ رہے ہیں بائیس فروری کے

ب مشاعرے کے اختتام کا وقت تھا اور صدر مشاعرہ نواب جعفر علیخان
صاحب اثر "پیر دیر" کو زحمت دی گئی۔ اثر صاحب کی ہستی بزم شعر و سخن
کے لئے ایک ایسی روشن شمع ہے جس کی روشنی سے کتنے ہی پروانۂ ادب
فیض حاصل کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اثر لکھنوی کے دم سے لکھنؤ کی عظمت

34073

انھوں نے اپنی صاف ستھری زبان میں کچھ اچھے شعر سنائے پڑھنے کے پرانے انداز نے ان کی غزل میں چار چاند لگا دیے۔

جلوہ گر اس میں کون حسین ہے — عرش کی ہمسر دل کی زمین ہے
کہتی ہوں جیسے حسن کی آنکھیں — عشق بھی ظالم کتنا حسین ہے
نشتر بند آنکھوں سے نظارہ — اس کا تصور کتنا حسین ہے

نشتر صاحب کے بعد سندیلہ کے دوسرے بزرگ شاعر بسمل سندیلوی آئے جن کی غزل کے کئی اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔ جن صاحب نے بسمل صاحب کی غزل پڑھی تھی اگر پہلے ہی سے انھوں نے پڑھنے کی مشق کر لی ہوتی تو غالباً غزل کا لطف دو بالا ہو جاتا تلفظ اور عطف و اضافت کی غلطیوں سے کہیں کہیں جو بے لطفی آ گئی تھی وہ درمیان میں حائل نہ ہوتی بسمل صاحب نے اپنے کلام میں زندگی کا گلہ بھی کیا ہے اور حسن و عشق کی باتیں بھی کی ہیں۔

گویا زبان غم ہیں انداز خامشی کے — افسانہ کہہ رہے ہیں ہونٹوں کا کپکپی کے
اپنے جنون غم کی تکمیل کر رہا ہوں — پرزے اڑا رہا ہوں دامان زندگی کے
کچھ ظلم کے ستائے اکثر سنبھل گئے ہیں — لیکن نہیں سنبھلتے مارے ہوئے خوشی کے

بسمل سندیلوی کے بعد حبیب احمد صدیقی کی باری آئی۔ صدیقی صاحب اس قسم کی نشستوں کے روح رواں ہیں۔ ان کی ادبی دلچسپیوں نے لکھنؤ کے بہت سے شاعروں میں ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔

کلام میں بے پناہ جاذبیت، سلاست و روانی کا امتزاج اور حسن و عشق کی باتیں بڑی خوبی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ پڑھنے کا انداز ایسا کہ جو چھا جاتا

۲۲۴ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی		کبیر احمد جائسی	۲/۰
۲۲۵۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ		حامد اللہ افسر	۳/۰
۲۲۶۔ نیا راستہ	(ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۲۷۔ نوروز	(ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۲۸۔ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ)		آل احمد سرور	۵/۰
۲۲۹۔ نقوش و افکار		مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
۲۳۰۔ نیلم		انتصار حسین	۳/۰
۲۳۱۔ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی		عبدالاحد خان خلیل	۳/۰

(ہ)

۲۳۲۔ ہمارا گاؤں	(افسانے)	علی عباس حسینی	۳/۰
۲۳۳۔ ہندی کے مسلمان شعرا		امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۳۴۔ ہمارا جھنڈا		حامد اللہ افسر	۱/۰
۲۳۵۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر		منظر سلیم	۱/۵۰
۲۳۶۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ		" "	۱/۵۰

(ی)

۲۳۷۔ یاقوتی	(ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۳۸ یادگار انیس		امیر احمد علوی	۳/۰

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۔ امین آباد پارک لکھنؤ

کاٹنے شروع کر دئے ۔۔ وہ اس قدر مضبوطی سے باندھے گئے تھے کہ بند کاٹتے ہوئے اسے کافی محنتا مارنا پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر مرتعش ہوتے چلے جا رہے تھے۔ خوف دہراس سے اس کی پیشانی پر پسینہ کے بیشمار قطرے منجمد ہو گئے تھے۔ اور آخری ڈوری کے کٹتے ہی ایک نسوانی آواز اس کی کانوں میں گونجی۔

صرف آواز ہی نسوانی تھی.... اس نے پتلون پہن رکھی تھی اور سر پر ایک کپڑا بندھا ہوا تھا۔ چینٹ کا رنگ کالا تھا۔

"مجھے یہاں سے جلد لے چلو" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اسکے ہاتھ پیر بید مجنوں کی طرح لرزاں تھے ۔۔ اس نے اپنی پوری طاقت یکجا کر کے اسے موٹر میں بٹھا دیا۔ اور کار جنگل کا سینہ چیرتی ہوئی جھاڑ جھنکاڑوں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

وہ بڑی تیز رفتاری سے موٹر چلا رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔ کئی بار تصادمی حادثوں کا خطرہ بھی لاحق ہوا لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔۔۔ ہمسفر کی صراحی نما گردن کافی اونچی اٹھ گئی تھی۔ اس نے اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کو تبسم ریز پایا۔ لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کون تھا۔۔!

"آپ بہت تھک گئے ہیں" "لائیے میں ڈرائیو کروں" یہ ہمسفر کی آواز تھی۔

اور اسی کے ساتھ اس کے نرم نرم ہاتھ اسٹیرنگ پر قابض ہو گئے

پاداش ناکردہ

الطاف حسین واہی (احمد آباد)

"ل.... ف.... ٹ...."

درخت کے پیچھے سے ایک دبی ہوئی آواز فضا میں بکھر گئی۔

موٹر تیزی سے چل رہی تھی۔ اور آواز اس قدر دبی دبائی تھی کہ یہ تعین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ جنگل کے کسی گوشہ سے اٹھی تھی.... اس نے موٹر روک دی اور انجن بند کر دیا اور سڑک پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی مسلط ہو گئی۔ وہ دو منٹ کھڑا رہا۔ لیکن آواز نہیں دہرائی گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کرنے کے ارادہ سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ وہی آواز پھر ایک بار ہوا کے دوش پر پھیل گئی۔ اس مرتبہ آواز قدرے صاف تھی لیکن دبی ہوئی

"لفٹ.... پلیز....!"

سڑک کی شمالی جانب والی نالی میں نیم کے ایک بڑے درخت کے پاس ایک گٹھری سی پڑی ہوئی تھی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ دوسرے لمحے اس گٹھری میں حرکت ہوئی اور وہی آواز پھر سنائی دی گئی.... لیکن اس بار آواز میں قدرے جمود تھا۔ مایوسی تھی۔

اس نے جیب سے پستول نکالا۔ اور ایک ہاتھ سے گٹھری کے پا

لیکن جو "باتیں بے زبانی" زبان بن گئی اور پھر
نظر سے نظر نے ملاقات کر لی
رہے دونوں خاموش اور بات کر لی

موٹر فرنٹ روڈ پر چل رہی تھی اس نے پھر ایک بار موٹر روک دی۔
جگہ قدرے سنسان تھی۔

"آپ مہربانی فرما کر تھوڑی دیر کے لئے موٹر سے اتر جائیے اور جب تک میں اشارہ نہ کروں میری طرف نہ دیکھئے۔" ہمسفر نے کہا۔

وہ ایک آٹومیٹک مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔ حکم ملتے ہی وہ فوراً نیچے اتر گیا اور مخالف سمت میں کھڑا ہو گیا۔ پیچھے سے کپڑوں کی سرسراہٹ بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن وہ مجسمہ بنا ہوا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ڈائل میں طواف کر رہی تھیں۔ بڑا کانٹا گیارہ سے بارہ تک پہنچ گیا تھا لیکن حکم حاکم ابھی صادر نہیں فرمایا گیا تھا۔ مزید پانچ منٹ گزر چکے تھے اور اب انتظار کا ایک ایک سیکنڈ ایک ایک سال کے برابر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ہمسفر غائب تھا!

سیٹ پر سگریٹ کی ڈبیا کا ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر ہمسفر کی زبان میں یہ الفاظ تبسم ریزی کر رہے تھے۔

"شکریہ! پھر ملیں گے۔ بھول تو نہ جاؤ گے نا؟"

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھا اور دوسرے لمحے نظریں سڑک پر دوڑائیں لیکن دور دور کسی کا پتہ نہ تھا۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ کار چل رہی تھی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ، ذہن و دماغ پر کافی زور دینے کے باوجود بھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا اور کار یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سامنے ہی ایک ہوٹل تھا

"آئیے پہلے چائے پی لیں۔" ہمسفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونو نیچے اتر گئے۔

اس نے دو کافی اور بسکٹ کا آرڈر دیا۔ اس کو ہمسفر کے انتخاب پر بیحد تعجب ہوا۔ "بسکٹ اور کافی۔"

"آپ سگریٹ پئیں گے؟" اس نے پوچھا۔

اور جواباً اس نے سر ہلا دیا۔

وہ خاموش تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے چکروں میں اس کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ جیسے اس کی طاقت گویائی سلب ہو گئی تھی۔

ہمسفر کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا جزو بن رہی تھیں۔ ہمسفر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کار پھر روانہ ہو گئی۔

اس نے ایک سگریٹ نکالا اور اس کو جلانے سے پیشتر ہی ہمسفر نے لائٹر اس کے مدمقابل کر دیا۔ اس مرتبہ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟"

لب بند، گم حواس، تحیر نگاہ میں
تصویر بن گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں

"آپ تو کوئی شاعر معلوم ہوتے ہیں"

— کیا میں اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا؟" اس نے کہا۔

"آپ جس کے متعلق اتنا سوچتے ہیں اس کا کچھ اتا پتہ تو بتلائیے۔ ممکن ہو میں بھی آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔" موعظۃ الشباب دوشیزہ نے اسے تسکین آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

"نہیں مرونا! تم اسے نہیں پہچان سکتیں — صرف ایک بار ملاقات ہو سکی ہے اس کی موجودگی میں میری طاقت گویائی بے کار ہو گئی تھی۔ میں محو حیرت تھا کہ اس قدر لرزہ خیز واقعہ کے بعد بھی اس کا چہرہ کسی پریشانی یا زردی سے بوجھل نہ تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے مجھے ہوٹل میں جانے بلائی تھی۔ لیکن صرف سگریٹ جلاتے وقت اس کی پتلی پتلی انگلیوں میں قدرے ارتعاش تھا۔

"شاید پہلا موقع ہو گا۔" مرونا! میں نے اسے تھیلے سے نکالا تو وہ قدرے خائف تھی۔ لیکن میرے چہرے پر اس نے نہ جانے کونسی نفسیاتی کیفیت کا جائزہ لیا کہ میں نے دوسرے لمحے اسے مسکراہٹ بداماں پایا...

اچھا میں چلا —

مضطرب شب کا شکستہ ساز دم توڑ رہا تھا۔ اور افق کی گہرائیوں میں ملجا و ماوی تلاش کر رہا تھا۔ گہرا جمود طاری تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی — موٹر سڑک کا سینہ چیرتی ہوئی پرسکون راستوں میں ہلچل مچاتی ہوئی گریٹ ٹاور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مرونا کے سکون بخش وعدے نے ہمسفر کی یاد کے نقوش مزید ابھار دیئے تھے تیز رفتاری کے ساتھ اس کے دل

اس نے چاروں طرف دیکھا تلاش کیا.... لیکن....

سڑک پر دور دور خاموشی کا تسلط تھا۔ جنگل کا ذرہ ذرہ اسے خائف بنا رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کا متعاقب ہو!

—— زندگی کروٹیں بدل رہی تھی لیکن ہمسفر کا خیال اسے اکثر مضطرب بنا دیتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے یکایک چل پڑتا اور کار وہیں لاکر کھڑی کر دیتا جہاں ہمسفر کا ساتھ چھوٹا تھا۔

جب بھی کسی کو کالی تیلون میں ملبوس دیکھتا اس کی یاد زندہ ہو جاتی —— اور رفتہ رفتہ اس کی یاد اس کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بنکر رہ گئی۔ نہ دیکھے ہوئے کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا تھی! —— امید انسان کی زندگی کا جزو اعظم ہے جس کے سہارے وہ پرپیچ راستوں اور خونخوار طوفانوں کو بھی سر کر لیتا! اس نے ہمسفر کو شہر کے ہر بڑے ہوٹل اور کلب میں تلاش کیا۔

—— زندگی چنگ اور رباب کی والہانہ بر لطف نوائی سے ہمکنار رہتی۔ موسیقی کی سحر افزا نے شراب برسا رہی تھی۔ اور اس کے بالوں میں کسی کی مخروطی انگلیاں الجھی ہوئی تھیں —— ریشمی بالوں کی مہک سے فضا معطر بنی ہوئی تھی۔ ریشمی پردوں اور ملائم قالینوں میں سبز روشنی کا انعکاس نہایت ہی دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔

"اٹھئے۔ کافی رات بیت گئی" تبسم ریز ہونٹ پھڑپھڑائے۔

"جی ہاں۔ میں سویا نہیں تھا۔ میرا دماغ ابھی تک کسی دھندلی تصویر کے اردگرد طواف کر رہا ہے۔"

نمبر پلیٹ الگ کرتے وقت ہیلمٹ دھلنگ ڈیوٹی پر مڑتے ہوئے ایک سپاہی
نے موٹر پر ٹارچ پھینکی لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ ایکشن لے سکے وہ گاڑی
اسٹارٹ کر چکا تھا۔

— وہ آٹومیٹک مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔ موٹر چل رہی تھی یادوں
کی دیوی نت نئے روپ میں ذہن کو برما رہی تھی۔ اس کو اپنے پر غصہ آ رہا
تھا۔ اس کا دماغ اور حافظ دونوں اس سے بغاوت کر رہے تھے۔ غصّہ اور
حیرت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر رک گئی۔
"اب ہم بالکل محفوظ ہیں۔ یہ میرا بنگلہ ہے نیچے تشریف لے آئیں"
— اس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور کالی ہیٹ بھی — اور پھر ایکبارگی
اس کا دماغ ماضی کی ایک جانی پہچانی شاہ راہ پر گامزن ہو گیا۔ لیکن کسی
اندرونی احساس سے وہ چونک پڑا۔

"یہ میرا بنگلہ ہے۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں"
اس نے اب تک اپنا چہرہ اوور کوٹ میں چھپا رکھا تھا اس کی آواز
سنتے ہی اس کا چہرہ یکایک باہر آ گیا۔ جیسے طوفانی رات میں بادل
چھٹ گئے ہوں۔ اور چاند آسمان پر نمودار ہو گیا ہو!
"شکریہ — دیکھئے ہم مل رہے ہیں۔ آپ تو بھول گئے نا؟"
— وہ چونک پڑا۔ استعجاب۔ تحیّر اور مسرت و خوشی کے جذبات سے
اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ بیک وقت عورت کے انگنت روپ اس کے
دل و دماغ پر چھا گئے۔

کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہوتی ہوتی جا رہی تھیں۔ تخیل تا حدِ امکان پرواز کر کے تھک سا چکا تھا۔ اس نے موٹر کی رفتار اور تیز کر دی۔

"موٹر روکو!"

کسی نے گرجدار کرخت آواز میں اسے للکارا۔ لہجہ میں تحکم تھا۔

اس نے بریک لگا دی۔ موٹر رک گئی اور پچھلے دروازے سے کوئی اندر داخل ہو گیا۔

"تیز چلائیے اور مجھے اپنے ہی مکان پر لے چلئے۔"

لہجہ میں یکایک تبدیلی تھی، انکسار تھا اور بے چینی تھی! اور شاید مایوسی بھی ــ!

اس نے پوری طاقت سے موٹر دوڑانا شروع کر دی۔ ڈامر کی چکنی سڑک سے گلے مل مل کر پہیئے ایک عجیب آواز پیدا کر رہے تھے۔

"کچھ آہٹ ہوئی۔

مہربانی فرما کر ذرا تیز چلایئے۔ دیکھئے کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔"

پیچھے کی آواز تھی۔

آواز بالکل صاف تھی اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آواز میں ماضی کے دھندلے نقوش نظر آ رہے تھے۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔

"دیکھئے ابھی تک ہمارا کوئی تعاقب ہے آپ کار ٹھہرا کر نمبر پلیٹ نکال لیجئے تاکہ کوئی نمبر نہ دیکھ سکے۔

ــــ وہ فوراً نیچے اتر گیا۔ اور نمبر پلیٹ پیچھے سے علیحدہ کر لی گئی لیکن

ن ہو سکتا۔ آپ کپڑے بدل لیجئے۔"

"لیکن میرے پاس زنانہ کپڑے نہیں ہیں۔"

"میں ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں۔"

اس نے اوورکوٹ اتار دیا۔ اس کی قمیص بے شمار خون کے دھبوں ے گلنار بنی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مرائی —

"آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ایک مرتبہ آپ بنگل میں منہ پھیر کر کھڑے رہنے کا حکم دیا تھا آج آپ ہی کے مکان میں پ سے کہہ رہی ہوں۔ میں کپڑے تبدیل کر دوں، صرف اتنی دیر..."

اور وہ پردے کی اوٹ میں چھپ گئی۔

"کیا آج بھی وہ بھاگ جانے گی۔" لیکن نہیں آج تو وہ اس کے دکے مکان میں ہے جہاں چاروں طرف سے دروازے بھی بند ہیں۔" اس نے سوچا اور خود بخود مطمئن ہو گیا۔

اور دوسرے لمحے اشارہ پا کر اس نے مڑ کر دیکھا وہ زنانہ لباس یا پیکر حسن دکھائی دے رہی تھی اس کا حسن پورے شباب پر تھا۔ اس ا آنکھیں کافی بڑی بڑی تھیں لیکن کیسی قرینہ تکی جھکنے کے سبب قد لمبے رخی مائل تھا۔ اس کے گلابی رخساروں کی چمک نظروں کو خیرہ بنا رہی تھی ، نے اسے دونوں شانوں سے اٹھا لیا۔

"— واقعی ہم مل رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ بھی ایسی ملاقات کا ایک زخم دیکر غائب ہو گئیں تھیں۔ اور آج پھر اسی طرح ہم مل رہے ہیں — کیا مجھے آپ نے ایسے موقعوں پر ہی ملنے کا قصد فرما لیا ہے۔"؟

اور ایک نقرئی قہقہہ کے ساتھ اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا جس سے اس کے دراز بال چہرے کے ارد گرد پھیل گئے۔

"اچھا تو یہ ہے آپ کا اصلی روپ؟"

"جی ہاں! پہچان گئے!؟" وہ بولی۔

اتنا کہا اور یکایک اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ گھبرا گیا۔

"دیکھیئے آپ بنگلے کے تمام دروازے بند کر دیجئے۔ سپاہی نے جبر پڑھ لیا ہے۔ وہ میرے تعاقب میں ہوگی۔ کہیں پتہ لگ گیا تو آپ خواہ مخواہ میرے ساتھ جنوں کے ساتھ گھن کی طرح پس جائیں گے۔"

پولس کا نام سنتے ہی اس کا چہرا زرد پڑ گیا — رات کا وقت، ایک نوجوان عورت، اور پولس اس کے تعاقب میں اس کا ذہن مختلف مختلف بھیانک توہماتی اشکال کی آماجگاہ بن گیا۔ اس نے بغیر ضرورت کے جیبوں کی تلاشی لینی شروع کر دی اور ٹیبل سے سگریٹ اٹھا کر منہ میں دبالی ور دوسرے ہی لمحہ لائٹر اس کے ہونٹوں کے پاس تھا۔

"ہوٹل میں بھی اس نے اسی طرح میرا سگریٹ سلگایا تھا۔ اس نے سوچا۔

"محترمہ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ یہاں بغیر اجازت کے کوئی اندر داخل

مجھ سے شادی کرنے کا متمنی تھا ـــــ میرا پڑوسی منوہر میرا بچپن کا ساتھی تھا لیکن وہ میرے دل و دماغ کی کائنات پر چھا جانے کی صلاحیت کا محرک نہ بن سکا۔ وہ میرے والد کے ایک محبّ خاص کا لڑکا تھا اور اس لئے میرے خاندانی اندرونی راز سے بخوبی واقف تھا۔ صرف تفریحی مشاغل کے لئے وہ اپنے اندر اچھی صلاحیت جذب کئے ہوئے تھا۔ اور اسی لئے ہر جگہ وہ میرے ساتھ ہوتا۔ وہ کئی بار میرے سامنے مجنوں و وامق کا مجسمہ بن چکا تھا۔ لیکن میں نے ہر مرتبہ اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ میری دولت سے وابستہ ہونا چاہتا تھا ـــــ اور شاید میرے ہر وقت کے انکار سے اس کا لہو حسن کی چنگاری شعلہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ دنیا بھر کی بدحواسیاں اور پریشانیاں چہرے پر سمیٹ کر میرے سامنے آتا اور نت نئے بہانوں سے مجھ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے ہی جاتا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اب میں بھی اس کی روزانہ کی دست طلبی سے تنگ آ گئی تھی۔ جس روز ہماری پہلی ملاقات جنگل میں ہوئی وہ اسی کی چیرہ دستی کا پیش خیمہ تھی۔ اس نے منوہر نے مجھ بڑے ہی والہانہ انداز سے آ دبوچا اور میری طرف ایک مردانہ لباس پھینکتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آج تم اس لباس میں تفریح کو چلو گی۔ اس کے چہرے پر ریاکاری اور فتنہ پردازی کے ملے جلے تاثرات ضرور جھلک رہے تھے لیکن میرے لئے انکار بھی ناممکن تھا ـــــ!

ہم چل رہے تھے۔ کبھی وہ ڈرتا ٹوکرتا اور کبھی میں ... اس نے اس مرتبہ

"کتنی حسین ہو تم! دل چاہتا ہے تمہیں اسی طرح دیکھتا رہوں۔ قدرت نے تمہیں دستِ خاص سے تخلیق فرمایا ہے۔"

خون آلود کپڑے اس نے کونے پر رکھ دیئے۔ اور وہ اس کے پاس صوفے پر دراز ہو گئی۔ اجسام کے اتصال کے ساتھ دلوں میں ہلچل پیدا ہو گئی اور اس کی انگلیاں اس کے عریاں بازوؤں پر تھرتھرا گئیں۔ رات کا آخری حصہ دم توڑ رہا تھا۔ آفتاب کی سیمیں شعاعوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے پرندوں کی چہچہاہٹ کانوں میں گونج رہی تھی ــــ کچھ تو تکان اور کچھ اضمحلالِ صبح کے سبب ساری کا پلو سر سے ڈھلک کر سینہ کی حدود سے باہر نکل گیا تھا جس سے اس کے سینے کا ابھار اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی برفانی ملک کی پرشباب کنواری لڑکی بہار کی آمد کی خوشی میں جھوم اٹھی ہو

خون آلود کپڑوں سے نظریں ملتے ہی پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ــــ چہرہ دلی جذبات اور تاثرات کا صحیح ترجمان ہوتا ہے وہ فوراً سمجھ گئی۔

"آپ گھبرائیں نہیں! اس نے کہنا شروع کیا ــ" میں یہاں کے ایک مشہور تاجر کی تنہا لڑکی ہوں۔ میرے والدین مجھ سے بچپن ہی میں بچھڑ گئے تھے ــــ میں اس خاندان کی تنہا یادگار تھی اور وارث بھی۔ باپ کی کافی دولت میرے ورثہ میں آئی تھی۔ میں ابھی اٹھارویں بہار سے ہی متعارف ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ میرے دل میں بھی ایک نامعلوم جیسی محسوس ہونے لگی تھی۔ میری دولت پر بے شمار نظریں ٹکراتی تھیں اور ہر شخص

رفتار زیادہ تیز کر دی۔ اور ایکبارگی ایک سنسان جگہ اس نے موٹر کو بریک لگا دی
بالکل اسی طرح جیسے کسی چست و چالاک چابک سوار نے برق رفتار گھوڑی کو
ایڑ لگا دی ہو۔

—— میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ تم اس لباس میں کتنی بھلی دکھ رہی ہو! ——
اس نے کہا اور جیب سے ایک پستول نکال کر میرے سینہ پر رکھ دیا۔ اور یکایک
جنگل کا ذرہ ذرہ میری نظروں میں پستولوں کی نالیوں میں تبدیل ہو گیا۔ میں
پھڑپھڑائی لیکن وہ میری گرفت مضبوط بنا چکا تھا۔

اس نے ایک سادے چیک پر میرے دستخط لئے اور دوسرے لمحے
اس نے میری تجوری اور کپ بورڈ کی کنجی بھی مانگ لی۔ خوف و ہراس سے
میرا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ میں اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھی چیک اور
کنجیوں کو پوری طرح قبضہ میں کرنے کے بعد اب وہ ہوس کا راز میری
طرف بڑھا —— میں نے بڑی منت و لجاجت سے گڑگڑا کر کہا۔ "اب تمہارا
کام ہو گیا ہے تم جا سکتے ہو۔"

لیکن جواباً اس نے ایک قہقہہ ہوا میں مدغم کر دیا جس سے جنگل
کی خاموش فضاؤں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ میں نے جگہ جگہ سے اس کے کپڑے
پھاڑ ڈالے اس کے چہرے کو نوچ ڈالا —— وہ ایک زخمی شیر کی طرح میری
طرف لپکا اور ایک دیر ہوس سے میرے ہونٹوں کو داغدار بنا دیا —— میں
غرائی لیکن ایک مرد کے سامنے بے بس تھی۔ اس نے موٹر کی سیٹ کے نیچے سے
ایک تھیلا نکال کر میرے ہاتھ پیر باندھ دئے گئے اور مجھے اس تھیلے میں

(باقی آئندہ)

ہندوستان میں ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں مندرجہ ذیل جگہوں سے مل سکتی ہیں!

بمبئی :- منیجر علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳- (۲) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ -
(۳) راشٹرس ایمپوریم لیمیٹیڈ فیروز شاہ مہتا روڈ - (۴) عثمانیہ کتب خانہ بمبئی

احمدآباد :- کلیم بکڈپو۔ خاص بازار - (۲) رفیق بکڈپو - (۳) عزیز بکڈپو -

مالیگاؤں :- انصار بک اسٹال

حیدرآباد دکن :- (۱) نعمت بک ہاؤس کریم نگر - (۲) رحمانیہ بک ڈپو روبرو گھڑیال -

بنگلور :- (۱) سنٹرل بک ڈپو (۲) فیروز بک ڈپو نیو مارکیٹ -

پونا :- اسلم بک ڈپو -

دہلی :- مکتبہ شاہراہ - مکتبہ جامعہ
علمی کتب خانہ - پنجابی پستک بھنڈار، مکتبہ ہم خیال

پٹنہ :- (۱) کتاب منزل سبزی باغ - (۲) اقبال بک ڈپو -

بھاگلپور :- کمالیہ بک ڈپو -

گیا :- ظفر بک ڈپو کچہری روڈ - (۲) کتاب منزل باری روڈ -

کلکتہ :- عثمانیہ بک ڈپو لور چیت پور روڈ - انوار بکڈپو - دارالاشاعت قرآن
ایم بشیر حسین -

مدراس :- خورشید بکڈپو - ٹرپلیکین - (۲) مدینہ بک ہاؤس -

سرینگر :- غلام محمد نور محمد بک سیلر - (۲) شیخ غلام محمد قرآن منزل

جموں :- اسٹوڈنٹ اسٹورس -

الہ آباد :- کتابستان بک سیلر - کملا نہرو روڈ -

قوموں کا عروج زوال دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ مگر مسلمانوں نے اپنا ماضی جس قدر درخشاں چھوڑا ہے اس کی نظیر عالم میں نہیں ملتی، اور مسلمانوں میں بھی خصوصیت کے ساتھ اندلس کے مسلمان اوراق تاریخ میں زندہ جاوید رہیں گے۔ انھوں نے فنون لطیفہ۔ طب۔ فلسفہ اور سائنس میں جتنی ایجادات کی ہیں۔ بنی نوع انسان ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تمام ترقیاں اس وقت تک تھیں جب تک عمل پیہم، اتحاد اور اخوت کی کارفرمائی تھی۔ مگر جب اسلام کا صحیح راستہ چھوٹ گیا تو یہی قوم خون کے آنسوؤں سے اپنی تاریخ کا آخری باب لکھ رہی تھی۔ ۔ بے بسی اور بے چارگی میں اس پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے گئے اور وہ خواب غفلت سے نہ چونکی۔ حتیٰ کہ اپنے ساتھ اپنی نسلوں کو بھی فنا کر گئی۔

ان واقعات کی تفصیل دیکھنے کے لئے وحشی محمود آبادی کا

ناول

زوال غرناطہ

ملاحظہ فرمائیے

زیر طبع

ناشر:- ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

قصائد مومن مع شرح

ظہیر احمد صدیقی محتاج تعارف نہیں، ان کے اور ان کے والد کے رشحات قلم ملک کے موقر علم و ادب کے شائقین کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ ان دونوں کو مومن سے جو انسیت اور محبت ہے وہ ان کی ادبی تحریروں سے بخوبی عیاں ہے۔

ظہیر احمد صدیقی لکچرر دہلی کالج دہلی نے مومن کے قصائد کی شرح کرکے ایک اہم کام کیا ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا —— (زیر طبع)

مشرق اور مغرب کی تہذیب کا دلچسپ تصادم

ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ کی رومانی داستان

کشمکش زندگی کا حسین مرقع ——

یاقوتی

خان محبوب طرزی کا تازہ ترین معاشرتی ناول

یاقوتی

اپنے دلچسپ پلاٹ، سلاست، روانی اور عظیم کردار کے اعتبار سے ایک شاہکار ناول ہے

قیمت تین روپے آٹھ آنے (۸/۳ عہ)

ملنے کا پتہ:- ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ کی سول ایجنسی ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کو حاصل ہو گئی ہے

اِس لئے

انجمن ترقی اردو ہند کی شائع کردہ مندرجہ ذیل مطبوعات ہمارے ذریعہ سے طلب فرمائیے

عندلا	صہ	شگفتہ	سے	باپو کے قدموں میں	ملعہ
اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج	عہر	بزم بے تکلف	۱۲/	سیاسیات کے اصول ۳ حصہ کامل	صہ
کاروان معیشت	ہیر			قومی تہذیب کا مسئلہ	سہ
ہندوستانی سماجیات	للعہ	انتخابات		اخلاقی سماجیات	للعہ
ادبی قومی تذکرے اول، دوم	لعہ	مجاز، مجروح		اسلامی فن تعمیر	سعہ
نفسیات افراد	۱۲/	اختر شیرانی		انواع فلسفہ	عہر
ایک مشترکہ کتب خانہ	سے	شاد عارفی		مذہب و دھرم	للعہ
اردو کی ابتدائی نشو و نما	صہ	عرش ملسیانی		انتخابات کلام میر	عہ
مشترکہ زبان	ملعہ	مخدوم محی الدین		حیات سرسید	ہیر
احوال غالب	لعہ	سکندر علی وجد		یادگار حالی	للعہ
زندان نامہ	۱۲/	جگن ناتھ آزاد		نقد غالب	عہ
حیات اجمل	ہے	جاں نثار اختر		دھمپد	سے
تنقیدیں	للعہ	اختر انصاری		ہندی ادب کی تاریخ	عہر
مرقع افعال	۱۲/	احمد ندیم قاسمی		اردو صرف و نحو	عہ
مقالات حالی	۱۲/	فیض احمد فیض		چند ہم عصر	عہر
اردو ہندی لغت	صہ	ہر ایک جلد ۱۲/		قطرے سے گہر ہونے تک	سے

فن خطابت پروفیسر مصطفیٰ [illegible] کی تازہ ترین تصنیف جس میں فن خطابت کی تاریخی حیثیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible]

نقوش فانی کبیر احمد جائسی کی تازہ تصنیف جس میں فانی کی شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور ان کے کلام کا بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

جلوے (پروفیسر معین الدین دردائی) رشید احمد صدیقی، قاضی [illegible] بابائے اردو عبدالحق اور اسی طرح ممتاز شخصیتوں کو تفصیلی طور پر روشناس کیا گیا ہے۔ قیمت صرف [illegible]

سخن ہائے گفتنی پروفیسر کلیم الدین احمد کے جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو کہ اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت صرف [illegible]

ادب کا مقصد۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ۔ قیمت [illegible]

جوئے رواں حامد اللہ افسر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ جلد طلب فرمائیے۔ قیمت [illegible]

زیٹیوں کا بادشاہ (حکیم بابا) سید علی عباس حسینی کا تازہ ترین ناول۔ قدیم زندگی کی ایک جھلک۔ زیٹیوں کے ساتھ ضلع جگت۔ دلچسپ ہنسانے والا بہترین ناول۔ قیمت [illegible]

ادبی خطوط غالب مرزا عسکری بی اے کے ایسے خطوں کا مجموعہ جس میں مرزا غالب کے نکات ادبیہ حل کیے ہیں اور اشعار کے معنی سمجھانے اور شعراء کے متعلق رائے زنی کی ہے۔ قیمت صرف [illegible]

نقوش ادب اور شعور پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے معرکۃ الآرا جدید و تنقیدی مضامین کا مجموعہ جن کے متعلق [illegible] پاکستان کے ادبا

مصنوعی چاند خان محبوب طرزی کا سائنٹیفک ناول۔ جو روس کے دو مصنوعی چاندوں کے بعد ہندوستان سے چھوڑا گیا ہے۔ قیمت للعہ

ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی کا حیرت انگیز ناول میڈیکل سرجری کا ایک عجیب و غریب کارنامہ۔ دلچسپ رومان۔ جس کے متعلق مصنف کا دعویٰ ہے کہ آج تک ایسا ناول میرے قلم سے نہیں نکلا۔ پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ قیمت للعہ

دوشیزۂ قاف خان محبوب طرزی کا معرکۃ الآرا جدید تاریخی اسلامی ناول جو کہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ قیمت صہ

دل ربا۔ خان محبوب طرزی کا سماجی ناول۔ قیمت ہے،

قیامت صغریٰ " " سائنٹفک " " ہے،

فریدہ " " " جاسوسی " " عا،

آغاز سحر " " غدر ۱۸۵۷ء پر بہترین ناول " ۔ ہے

یاقوتی " عشق و محبت سے بھرپور سماجی ناول " ہے

نیا راستہ " " " " " ہے

معمار کہنہ مشق اور کامیاب ترین ناول نگار مائل ملیح کا شمالی افریقہ کے پس منظر پر ایک رزمیہ تاریخی ناول۔ مغرب کے معماروں کی ایک زندہ جاوید تصویر۔ قیمت صرف للعہ

غزنی دروازہ مائل ملیح آبادی کا جدید ترین معرکۃ الآرا تاریخی ناول جلد جلد خرید لیجے۔ قیمت للعہ

سفر مائل ملیح آبادی کا جدید ترین اسلامی تاریخی ناول۔ حضرت آدم سے اس وقت تک کے اکابرین اسلام کی سوانح عمری اور کارنامے۔ قیمت ہے،

رسالوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ قیمت ۳ ر

روایت اور بغاوت (مع اضافہ جدیدہ) پروفیسر احتشام حسین رضوی کی معرکۃ الآرا کتاب جلد طلب فرمایئے۔ قیمت ۲عہ

ادب اور نظریہ پروفیسر آل احمد سرور کا چوتھا جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس کو ہر بہی خواہ اردو نے سراہا ہے اور اپنی لائبریریوں کی زینت بنایا ہے آپ بھی اس کو جلد خرید یئے۔ قیمت ۲عہ

تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ہمارے ممتاز نقادوں میں سے ہیں ان کی تنقید میں تخلیقی رس بھرا ہے اسلئے علم و ادب کے شیدائی ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ آپ بھی تنقیدی اشارے (مع اضافہ جدیدہ) جلد طلب فرمایئے جو کہ تیار ہو گئی ہے اور یوپی کے محکمہ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کورس میں بھی شامل کر لی ہے۔ قیمت صرف ۳ ر

پیسہ اور پرچھائیں ڈاکٹر محمد حسن کے نو ڈراموں کا مجموعہ جس پر ہند گورنمنٹ نے مجموعی طور پر ۷۵۰ روپیہ بطور انعام دیئے ہیں۔ قیمت ۱عہ

قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے تنقیدی مضامین کا گرانقدر مجموعہ جس کا آپ کو بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ اب تیار ہو گیا ہے۔ جلد طلب فرمایئے۔ قیمت ۲عہ

کفِ گلفروش غلام احمد فرقت کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو اپنی مثال آپ ہے جلد از جلد طلب فرمایئے۔ قیمت ۳عہ

ستاروں سے آگے شوکت تھانوی کے شیش محل کی طرح نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ جلد طلب فرمایئے۔ قیمت ۲عہ

پیغام ۔ ڈاکٹر طاہر دیا لپوری کا اصلاحی سماجی ناول۔ قیمت ۳عہ

فلسفی ابن رشد ناول کے انداز میں فلسفی ابن رشد کی مفصل کہانی کا ایک تاریخی ورق اور سوانح حیات۔ قیمت ۱۲ر

لال قلعہ ۔ غدر ۱۸۵۷ء کی مفصل تاریخ۔ قیمت ۲؍

زینب ساحرہ مغرب اقصیٰ کی وہ اولوالعزم حسینہ جس نے اپنے شوہر کو جام شراب کے بجائے تلوار پیش کر کے افریقہ و اسپین کا فاتح بن تاشفین بنا دیا۔ وحشی محمود آبادی کا تازہ ترین تاریخی ناول پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ قیمت سے

سید سالار مسعود غازی ناول کے انداز میں مکمل سوانح حیات۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ وحشی محمود آبادی کا بہترین ناول قیمت سے

محبوبۂ کربلا جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے مشہور ناول غادۂ کربلا کا اردو ترجمہ یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی۔ شائقین کے اصرار پر اس کا جدید اڈیشن شائع کیا گیا ہے لہٰذا جلد آرڈر دیجئے۔ قیمت ۱۲ر

حجاج بن یوسف جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے مشہور ناول غادۂ کربلا کا اردو ترجمہ جو کہ تقریباً ۲۵ برس سے نایاب تھا۔ اب تیار ہو گیا ہے۔ آج ہی آرڈر دیجئے۔ قیمت لعہ

جادو کی آنکھ ۔ ڈاکٹر اثر بلگرامی کا جاسوسی ناول۔ قیمت ۱۲ر

شکست کی آواز ۔ قاضی عبد الستار کا بہترین ناول۔ قیمت ے ر

ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے سید علی عباس حسینی کا تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ جس کے ایک افسانے پر گورنمنٹ نے پانچسو روپیہ انعام دیا ہے۔ قیمت فی جلد سے ر

پاگل خانہ ۔ مانک ملیح آبادی کا سماجی ناول۔ قیمت ۱۲ر

۵۔ دوشیزہ قاف (خان محبوب طرزی) عہ
۶۔ اجنبی آباد ،
۷۔ مصنوعی چاند ، للعہ
۸۔ دل ربا ، سہ
۹۔ مجرم (جاسوسی ناول) ،
۱۰۔ آغاز سحر (غدر کے مکمل واقعات)
۱۱۔ واجد علی شاہ صوبہ اودھ کی تاریخ
۱۲۔ نیا راستہ
۱۳۔ باتونی (خان محبوب طرزی)
۱۴۔ زینب ساہرہ (حسن محمود آبادی) سے/
۱۵۔ زوال غرناطہ ،
۱۶۔ سید سالار مسعود غازیؒ ،
۱۷۔ پاگل خانہ (مائل ملیح آبادی)
۱۸۔ معمار (اسلامی تاریخی ناول) ،
۱۹۔ سقر ، ، سے/
۲۰۔ غزنی دروازہ ، للعہ
۲۱۔ فلسفی ابن رشد ،
۲۲۔ لال قلعہ (غدر ۱۸۵۷ کی مکمل تاریخ)
(مائل ملیح آبادی) سے/
۲۳۔ دختر بحر (العر کریم قدوائی) عہ
۲۴۔ محمد بن کرار (جرجی زیدان)

۲۵۔ حجاج بن یوسف (جرجی زیدان) عہ
۲۶۔ اسپین کی شہزادی (صادق حسین سردھنوی)
۲۷۔ سیاحت زمین (محمود عظیم فہمی) عہ/
۲۸۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)
(ڈاکٹر اثر بگرامی)
۲۹۔ شکست کی آواز (قاضی عبدالستار) سے/
۳۰۔ جبلی۔ (محمد علی واحدی) مع تعارف نامہ
، (شوکت تھانوی) عہ
۳۱۔ بہو بیٹی۔ (محمدی بیگم) عہ/

افسانے

۱۔ ٹھیکرے کی مانگ (افسانوں کا مجموعہ)
(صدیقہ بیگم سیوہاروی) عہ/
۲۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے
علی عباس حسینی سے/
۳۔ چوتھی ہمن (مسیح الحسن رضوی)
۴۔ جاگتے سپنے (قیصر تمکین)
۵۔ ابوالحمد (حمید الدین گورکھپوری) ۱/
۶۔ سنہرا حلقہ (ناظر کاکوروی)

مزاحیہ

۱۔ ریڈیوں کا بادشاہ حکیم (انا ناول)
(سید علی عباس حسینی) سے/

۲۳۔ بہادر شاہ ظفر مع اضافہ جدیدہ
چوتھا اڈیشن ۔ ۳؍

۲۴۔ تنقیدی اصول اور نظریہ
(حامد اللہ افسر) ۸؍

۲۵۔ بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقار
(ڈاکٹر اختر اورینوی) ۱۲؍

۲۶۔ فن خطابت (کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ) ۱۲؍

۲۷۔ جلسے (پروفیسر معین الدین دردائی) ۱۲؍

۲۸۔ نقوش فانی (کبیر احمد جائسی) ۲؍

ادبی کتابیں

۱۔ بزم بے تکلف (ڈاکٹر سید عابد حسین) ۸؍

۲۔ ہمارا حج یعنی خلاصہ سیر کوہسار
(ڈاکٹر احسن فاروقی) ۴؍

۳۔ پردیسی کے خطوط (مجنوں گورکھپوری) ۸؍

۴۔ یادگار انیس (حسین [illegible])
(امیر احمد علوی) ۳؍

۵۔ اُردو شاعری ۸؍

۶۔ شاندوں سے آگے (ناظر کاکوروی) ۸؍

۷۔ شہر الحلقہ ″ ۸؍

۸۔ ایک نادر روزنامچہ
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۸؍

۹۔ ادبی خطوط غالب (مرزا عسکری) ۸؍

۱۰۔ شرح دیوان غالب (طباطبائی) ۸؍

۱۱۔ سرمایہ زبان اُردو
(جلال لکھنوی) ۳؍

۱۲۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ (مرزا فرحت اللہ بیگ) ۱۲؍

۱۳۔ ہندی کے مسلمان شعرار (انجمن زرانی) ۱۲؍

شبلی کی تصانیف

۱۔ علم الکلام ۸؍

۲۔ دستہ گل، فارسی کلام منظوم ۶؍

۳۔ بوئے گل ۶؍

۴۔ شعر العجم کامل ۵؍

خلاصہ

۱۔ خلاصہ روح تنقید ۱۲؍

۲۔ خلاصہ حیات جاوید ۸؍

۳۔ خلاصہ قواعد اردو ۸؍

۴۔ سارا دو عروض یعنی خلاصہ جواہر العروض ۸؍

ناولیں

۱۔ قطرے سے گہر ہونے تک (صالحہ عابد حسین) ۸؍

۲۔ عذرا ″ ۸؍

۳۔ ایک جان تین قالب (خان محبوب طرزی) ۸؍

۴۔ نغمہ کوہسار ″ ۸؍

۸۔ اپنی موج میں (ادارہ) [illegible]

۹۔ کفن گلفروش (غلام احمد فرقت) [illegible]

۱۰۔ صید و ہدف [illegible]

۱۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (دو جلدیں کامل) [illegible]

منظومات

۱۔ ذوق جنوں (آل احمد سرور) [illegible]

۲۔ نغمائے حبیب (نعتیہ کلام کا مجموعہ)
(بہزاد لکھنوی) [illegible]

۳۔ جوئے رواں (حامد اللہ افسر) [illegible]

۴۔ اچھی نظمیں (ڈاکٹر مشتاق) [illegible]

۵۔ مرثیہ غالب [illegible]

۶۔ مسٹر ملا کی نوک جھونک

۷۔ پردہ نسواں کے متعلق منظوم مناظرہ) ۱۲ر

۸۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم اور ان کا کلام۔ (رضا انصاری) [illegible]

ڈرامے

۱۔ پیسہ اور پرچھائیں (ڈاکٹر محمد حسن) [illegible]

۲۔ راکھی (شجاعت علی سندیلوی) ۲ر

تاریخ

۱۔ شاہان مالوہ (امیر احمد علوی بی اے) [illegible]

سیر و سیاحت

۱۔ ساحل اور سمندر (احتشام حسین) [illegible]

۲۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں
(عبد الماجد دریابادی) [illegible]

متفرق

۱۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی
(عبد الماجد دریابادی) [illegible]

۲۔ گاندھی جی کے ساتھ
(حامد اللہ افسر) [illegible]

۳۔ حکایات صحابہ (مولانا محمد زکریا) [illegible]

۴۔ اپنی پہچان (یعنی سال میں پیدا ہونے والے لوگوں کی قسمت کی معلومات)
اعجاز فاروقی [illegible]

۵۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ (غلام الثقلین) [illegible]

۶۔ بانیٔ اسلام (علامہ محی الدین خیاط) کی تاریخ کا اردو ترجمہ ۱۲ر

۷۔ یسرنا القرآن ۹ر

۸۔ بہشتی ثمر اول دوم (یعنی خلاصہ بہشتی زیور مکمل) [illegible]

۹۔ زکوٰۃ الحق ھدہ ہمارا مجلہ [illegible] ۵ر

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر [illegible] لائسنس نمبر [illegible]

اردو زبان کی بقا اور اسکے تحفظ

واقعی جو زبان اردو پہ خاص احسان کر رہا ہے — وہ فروغ اردو شاندار رسالہ ہے

بہ نظر سے ادب نجائیاں قدم قدم پیشہ فطرت — نفس نفس کو حیات نو کا لطیفہ عنوان کر رہا ہے

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

نومبر ۱۹۵۹ء

مدیر اعزازی

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی (ڈی لٹ)

مدیران

شجاعت علی سندیلوی و حکیم عبد القوی دریابادی بی۔ اے

منیجر و نگران

محمد حسین شمس قاسمی کاکوروی

قیمت فی پرچہ ۴ ر سالانہ چندہ ۲ روپے

ترسیل زر کا پتہ

۳۔ امین آباد پارک لکھنؤ — مبارک بکڈپو و مطبوعہ [illegible] نیشنل پریس

[illegible]

اپنی باتیں

ادارہ

اردو دنیا کے لئے اب دو ہی راستے ہیں یا تو وہ اپنے حقوق کو منوانے کے لئے یقین محکم کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائے اور دستور کے دیئے ہوئے تمام حقوق سے مستفید ہو، اور یا پھر اپنی اردو زبان کو مصنوعی ہندی کے اوپر قربان کر دے اگر اب بھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاتا تو وہ دن دور نہیں ہے جب آنے والی نسل اردو کے نام تک سے واقف نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اس کا نتیجہ تو اب بھی یہ سامنے آرہا ہے کہ دو تین اسکولوں کے لڑکے اردو پڑھتے ہیں اور جو غیر سرکاری اسکولوں کے طلبا اردو سے واقف ہوتے ہیں اور باقی اسکولوں کے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو پڑھنے والوں کی جو تعداد ہے وہ بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ شہروں میں تو کہیں کہیں اردو پڑھائی جاتی ہے لیکن قصبوں اور دیہاتوں کے اسکولوں میں جو زیادہ تر ضلع پریشد یا میونسپل بورڈ کے تحت ہوتے ہیں۔ اردو کا نام و نشان تک نہیں۔ یہ صورت اتنی خطرناک ہے جس کا اندازہ غیر متعلق حضرات نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی قیادت جن حضرات کے ہاتھوں میں ہے وہ اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ صرف سرکار کے اعلانات ہوتے رہتے ہیں۔ ان اعلانات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور ان پر عمل کہاں تک ہوتا ہے اس [illegible] تعلیم سے ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تنظیم کو زیادہ سے

ترتیب

۱۔ اپنی باتیں		۳ و ۴
۲۔ مولوی عبدالمجید سالک مرحوم	حکیم عبدالقوی دریابادی	۵ تا ۱۸
۳۔ غزل۔	میکش ناگپوری	۱۹
۴۔ "	تمکین رضوی	۲۰
۵۔ نور کا تڑکا ہوا۔	کنہیا لال کپور	۲۱ تا ۲۶
۶۔ شعر گفتن چہ ضرور	محمد فضل الرحمٰن	۲۷ تا ۳۵
۷۔ بدایوں کی ادبی شخصیتیں	مولانا یعقوب بخش راغب	۳۶ تا ۳۹
۸۔ افسانہ نگاری	نسیم بستوی	۴۰ تا ۵۲
۹۔ کتابوں کی باتیں	سید احتشام حسین	۵۳ تا ۵۹
۱۰۔ غزل	اختر بستوی	۶۰
۱۱۔ ادبی خبریں۔		۶۱ تا ۸۰

سید نصار حسین پرنٹر و پبلشر نے سرفراز پریس میں چھپوا کر دفتر ... سے شائع کیا

مولوی عبدالمجید سالک مرحوم

از حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے مدیر اعزازی

مولوی عبدالمجید سالک اردو کے صحافیوں میں بلند ترین مقام کے حامل تھے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز تو ماہانہ رسالوں سے ہوا. لیکن بعد میں اصل شہرت انھوں نے روزانہ اخباروں کے ذریعہ حاصل کی، ان کی صحافتی زندگی کم و بیش ۴۰ سال کی رہی، ادھر کئی سال سے کسی اخبار یا رسالے سے منسلک نہ تھے، پھر بھی لکھتے تھے اور بہت لکھتے تھے، خواہ اپنے نام سے لکھیں یا کسی اور کے نام سے، یا گمنام، بہرحال وہ بہت خوب ہوتا تھا.

عمر تقریباً ۶۴ سال کی پائی، تقریباً ایک سال سے عوارض قلب میں مبتلا تھے، درمیان میں کئی بار حالت بہت نازک ہو گئی تھی، لیکن ادھر صحت بہتر ہو گئی تھی، ڈاکٹروں نے ہر طرح اطمینان دلا دیا تھا اور مرحوم اپنے حلقۂ احباب میں یہ امید ظاہر کر چکے تھے کہ عنقریب وہ پھر تصنیفی و تحریری مشاغل جو علالت کی وجہ سے ڈاکٹری مشورے کے بموجب ترک کر رکھے تھے از سر نو شروع کر دیں گے افسوس کہ یہ امید پوری نہ ہوئی. اور ایک روز جب وہ اپنے گھر سے باہر کہیں جا رہے تھے کہ مرض قلب کا حملہ ہوا، گر پڑے، اور تھوڑی دیر میں روح پرواز کر گئی، انا للہ و انا الیہ راجعون.

زیادہ بہتر بنائیں اور تقسیم کار اس طرح کریں کہ کوئی گوشہ ایسا نہ رہے جن کی حالت سے ہم بے خبر ہیں ظاہر ہے یہ کام بہت بڑا ہے۔ اور بڑے بے صبر اور استقلال کی ضرورت ہے وہی لوگ اس کو کامیاب بنا سکتے ہیں جو اپنے اندر اُردو کی خدمت کا پر خلوص جذبہ رکھتے ہوں اور جن میں نام و نمود یا زمانہ سازی کے بجائے خلوص خدمت اور قربانی کا جذبہ زیادہ نہ ہو۔ جن کا مطمح نظر صرف اُردو کی خدمت ہو۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارا ذی شعور اور دانشور طبقہ اس اہم ضرورت کی طرف جلد توجہ کرے گا۔ مستقبل میں ہمیں کیا کیا کرنا ہے۔

اُردو کو کن کن طریقوں سے ختم کئے جانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے یا آیندہ اس کی راہ میں کیا کیا دشواریاں ہوں گی؟ ان تمام مسائل پر غور و فکر کرکے ہمیں ایسا لائحہ عمل بنانا ہے جس سے نئی نسل کم از کم اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم نہ رہے۔

اردو بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان مرحوم کے مشہور و معروف روزنامہ زمیندار (لاہور) میں سالہاسال تک افکار و حوادث کے عنوان سے ظرافتی کالم ان کے قلم سے نکلتا رہا پھر جب انہوں نے اور ان کے رفیق طریق مولوی غلام رسول مہر نے زمیندار سے الگ ہو کر لاہور ہی سے روزنامہ انقلاب نکالا تو افکار و حوادث کا یہ باغ و بہار کالم روزانہ پابندی کے ساتھ انقلاب میں نکلنے لگا۔ روزانہ کالم ڈیڑھ دو کالم ان کی ظرافت نگاری اور وہ بھی اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ مزاح پھکڑپن میں اور تفنن طنز بے جا، سب و شتم کی شکل اختیار کرنے پائے ساتھ ہی زبان و ادب کا بلند معیار بھی قائم رہے اور پھر ناظرین اس سے ہر روز نیا لطف حاصل کرتے رہیں۔ ہرگز کوئی آسان کام نہ تھا۔ سالک صاحب کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے برسوں اس کالم میں ان ساری خصوصیات کو قائم رکھا، وہ کچھ اور نہ کرتے تو تنہا ان کا یہی کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا ان کے قلم سے نکلے ہوئے افکار و حوادث کو جتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اتنی کسی اور اخبار کے ظرافتی کالم کو حاصل نہ ہوئی اور اس طرز نگارش کے سالک صاحب صرف موجد و مخترع نہ تھے بلکہ خاتم بھی تھے، یہ امر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا کلام ظرافت و مزاح میں بے مثل تھا اسی طرح نثری ظرافت میں سالک صاحب وحید اور بے عدیل تھے اگر یہ کہنا بھی شاعرانہ داخل مبالغہ ہو کہ

مرحوم بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ شعر وشاعری کی تحریروں میں ان کے نام کے ساتھ سالک بٹالوی بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔ پہلے ایک رسالہ "فانوس" نکالا۔ اس سے ان کے ادبی جوہر چمکنے لگے تھے۔ پھر پنجاب دارالاشاعت لاہور سے نکلنے والے اور ایک زمانہ میں بہت ہی مقبول و کثیرالاشاعت، بچوں اور عورتوں کے پرچوں پھول اور تہذیب نسواں کی ادارت میں شریک رہے۔ ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز بھی غالباً اسی دارالاشاعت سے ہوا۔ یہ بچوں اور عورتوں کے لئے سلیس اور رواں عبارت میں متعدد چھوٹی بڑی کتابیں زیادہ تر ناولوں اور افسانوں کی شکل میں لکھیں ان میں بعض تراجم تھے، اور بعض طبع زاد۔

اس دور کی کتابوں میں نقش ساحل، خودکشی کی انجمن، چھپا اور چترا وغیرہ تھیں۔ چترا مشہور بنگالی شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور آنجہانی کے شاہکار کا اردو ترجمہ تھی، اسی دور میں ان کی منظومات کا بھی ایک مجموعہ "راہ و رسم منزلہا" کے نام سے چھپا تھا جو اپنے رنگ میں منفرد اور ان کی جودت طبع کا آئینہ دار تھا، وہ نامور شاعر اور استاد سخن حضرت رسا رامپوری کے شاگرد تھے اس کے علاوہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم سے بھی تعلق و ربط خصوصی رکھتے تھے اور ان کے رنگ سے بھی بہت کچھ متاثر تھے۔

سالک صاحب شاعر صحافی ہی نہ تھے بلکہ ان کا شمار ملک کے صاحب طرز ادیبوں میں تھا لیکن انھوں نے اصل کمال ظرافت نگاری میں حاصل کی

کیے ہوئے ترجمے ناول اور افسانوں تک محدود نہ تھے معاشیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ کی معرکہ آلارا انگریزی کتابوں کا ترجمہ ان کے قلم سے شائع ہو چکا تھا ان کے انتقال کے وقت متعدد کتابیں زیر طبع یا زیر ترجمہ تھیں۔ ان کی ترجمہ کردہ کتب سلاست و روانی میں اپنی نظیر آپ تھیں کہیں سے ترجمہ نہیں معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ کتاب اصلًا و مستقلًا اردو زبان میں لکھی گئی ہے لاہور کے ادارہ ثقافت اسلامی (جسے نیم سرکاری حیثیت حاصل ہے) کے زیر اہتمام اس قسم کے متعدد تراجم، مستقل تصانیف ان کے قلم سے گذشتہ چند سال کے اندر نکلی تھیں۔ جن میں تاریخ ثقافت پاکستان سب سے زیادہ قابل قدر لائق ذکر اور ان کے نام کو زندہ رکھنے والی ہے ان کی ایک کتاب پر یونیسکو عالمی ادارہ سے ایک بیش قرار انعام بھی ملا تھا۔

برصغیر ہندوستان کی اردو صحافت میں ان کی ٹکر کا کثیر المطالعہ و وسیع المعلومات صحافی، میر بشارت علی جالب دہلوی مرحوم (ایڈیٹر ہمدم و ہمت لکھنؤ) کے سوا شاید اور کوئی نہیں گزرا ان کی سنجیدہ تالیفات میں تین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں یاران کہن (اس میں سالک صاحب نے اپنے معاصرین کے حالات لکھے ہیں) ذکر اقبال اور خود نوشت سوانح حیات۔

حکومت پاکستان نے ان کی وفات سے پانچ چھ ماہ قبل ان کے لئے پانچسو روپیہ ماہانہ سے زائد کا وظیفہ مقرر کردیا تھا مگر افسوس کہ سرکاری دفاتر کی بدنظمیوں کی وجہ سے وظیفہ کی رقم ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک نہ پہونچ سکی۔

تحریر و گفتگو دونوں میں حضرت اکبر کے رنگ کو اپنانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا جس مجلس میں بیٹھ جاتے اس کے میر مجلس اور محور توجہ بن جاتے ان کی دلچسپ اور ساتھ ہی بصیرت افروز گفتگو، لطائف اور چٹکلوں سے بھرپور فقروں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا، جن میں آمد کے سوا آورد کا نام و نشان تک نہ ہوتا، سننے والوں کی کسی طرح سیری نہ ہوتی شاید حضرت اکبر ہی سے اس مناسبت و مماثلت خصوصی کا اثر تھا کہ انھیں کی طرح سالک نے بھی ستمبر ہی کے مہینے میں وفات پائی۔

ظریفانہ طرزِ نگارش کے ساتھ ساتھ سنجیدہ نگاری میں بھی کمال رکھتے تھے، پنجابی ہونے کے باوجود اردو اہل زبان کی سی لکھتے تھے ان کے قلم سے جو کچھ سنجیدہ طرز کا نکلا ہے اس کی مجموعی ضخامت بالیقین ان کی ظریفانہ تحریروں کے مجموعہ سے کہیں زائد ہے۔

افسوس ہے کہ سنجیدہ نگارشات کا ایک خاصہ بڑا حصہ گمنام ہے خصوصاً قیام پاکستان کے بعد جب ان کا اخبار 'انقلاب' انقلاب زمانہ کے ہاتھوں بند ہو گیا تھا تو انھوں نے بہت کچھ وہاں کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کے لئے اور وہاں کی حکومت کے حسب ایما لکھا، جس میں ان کا نام آنے نہیں پایا۔ وہاں کے بہت سے وزرا اور ارباب سیاست اپنی تقریریں انھیں سے لکھواتے یا اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی چیزوں کا ترجمہ انھیں سے کراتے۔

ترجمہ میں بھی سالک صاحب غیر معمولی مہارت رکھتے تھے ان کے

جلدی تھی، لہٰذا یہ قاعدہ سمجھا، بولتا ہوا تماشہ بن گیا۔ ایک نے کہا حضرت پہلے آپ" دوسرے نے ادب سے جواب دیا "قبلہ پہلے آپ" دونوں طرف سے یہی سوال و جواب ہونے لگے مگر نہ حضرت اپنی جگہ سے ہلے نہ دوسرے نے اپنے مقام سے جنبش کی، ریل کمبخت نئے زمانہ کی پیداوار اپنے وقت سے آئی اور اپنے وقت سے جانے کے لئے تیار۔ وہ اس تکلف میں ان بزرگوں کا ساتھ کہاں دینے والی تھی، نہ ادب جانے نہ لحاظ، ایک مرتبہ انجن نے سیٹی دی، گارڈ صاحب نے سبز جھنڈی ہلائی وقت کا ساتھ دینے والے مسافر لپک جھپک کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن ان وضعدار بزرگوں میں "پہلے آپ پہلے آپ" کی رد و بدل ہوتی رہی، وقت کی نزاکت کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ یہ تکلفی الفاظ ذرا جلدی جلدی ادا ہونے لگے اور ایک نے دوسرے کو سہارا دینا بھی شروع کر دیا۔ لیجیے ریل چل کھڑی ہوئی، ڈبہ کا دروازہ اسی طرح کھلا ہوا ہے اور دونوں صاحب اسی طرح سے چلتے گاڑی کے ساتھ لمبے قدم، لمبی سانسیں، گاڑی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں، دس پانچ قدم یہ سلسلہ بھی رہا، جس کے بعد ان وضعدار مسافروں سے ریل تو چھوٹ گئی مگر خدا کے فضل سے وضع نہ چھوٹی اور لطف یہ ہے کہ مونچھ پر مونچھ نہ آئی، وہی ادب وہی اخلاق، نہ کوئی شکوہ نہ شکایت، دونوں بزرگوں کو اپنی اپنی طرف سے اطمینان، گاڑی چھوٹ جانے کے نہ یہ ذمہ دار، نہ وہ، واقعہ تو ہنسی کا بیان ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ سوچا جائے کہ اس سے خالی نہ ہو گا کہ ذکر پہ کیا گزری اور صاحب کا کیا ہوا

تکلفات

سید آل رضا لکھنوی

تکلفات کچھ نہ کچھ اب بھی ہوتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ان کا بھی ایک زمانہ تھا جب وقت کی رفتار اتنی تیز نہیں معلوم ہوتی تھی، اب تو خیال اور عمل کی دنیا ہی بدل گئی اور آئے دن بدلتی چلی جا رہی ہے کام کی دنیا اور آرام کی دنیا میں ذرا فرق ہوتا ہے۔ یہ باتیں بھی جو اس وقت اتنی بے تکلفی کے ساتھ کہی جا رہی ہیں پہلے غالباً یوں نہ کہی جاتیں۔ تکلف کا یہ دلچسپ واقعہ تو آپ نے اکثر سنا ہوگا ریل نکلنے کے بعد دو بزرگ کہیں سفر کو چلے، گاڑی اسٹیشن پر آکر ٹھہری نوکر نے بڑھ کر دروازہ کھولا، یہ نہ سمجھئے گا کہ آج کل کے نوکروں کی طرح لپک کے مالک کے سامنے سے نکل گیا۔ جی نہیں ذرا اکڑ اکڑ نہایت ادب کے ساتھ بڑھا اور دروازہ کھول کر چپکے سے ایک طرف کھڑا ہو گیا یا اسباب رکھوانے لگا۔ اب ان دونوں بزرگوں نے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا، دونوں صاحب پرانی وضع کے پابند، سوال یہ تھا کہ پہلے ڈبہ میں داخل کون ہو؟ ایک کا دوسرے پر سبقت کرنا بداخلاقی اور بداخلاق بننے کیلئے نہ یہ تیار نہ وہ۔ پہلے تو ایک نے بدن کو ذرا اوپر دے کر دوسرے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ بسم اللہ اندر تشریف لے چلئے مگر ادھر سے بھی آداب کی زبان میں اسی انکساری یا ایکٹنگ کا نمونہ پیش کر دیا گیا، ریل کو چھوٹنا تھا

اب یہ صورت لے لیجیے کہ سفر صرف دو ایک اسٹیشنوں کا ہے اور راستہ میں کھانے کا وقت بھی نہیں آئے گا۔ تو جناب خدا آپ کا بھلا کرے جس کے گھر جا رہے ہیں کیا اسے یہ سمجھنے کا موقع دیا جائے کہ میاں گھر سے ناشتہ لئے بغیر چلے ہیں، ریل کا کیا ٹھیک، نہ جانے راستہ میں کیا واردات ہو جائے، اور پھر آخر وضعداری بھی تو کوئی چیز ہے، زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ راستہ میں ناشتہ دان کھلنے کی نوبت نہ آئیگی لیکن یہ تو سوچیے کہ جب میزبان کے گھر بھرا ہوا ناشتہ دان جائے گا اور وہاں کے ملازموں میں وہ ناشتہ سوغات کی طرح تقسیم ہوگا تو وہ لوگ بھی کیا سمجھیں گے کہ آج کس بھاگوان کے قدم آئے ہیں، راستہ کے تکلفی سامان کا بیان نامکمل رہے گا اگر حقہ اور پان کا ذکر نہ کیا جائے، تازہ چلبلے حقہ میں خمیرہ کم سے کم ایسا تو ہو کہ ریل کا درجہ بھر مہک اٹھے، ایک آدمی پئے تو دس آدمی خوشبو کا مزہ لیں۔ گلوریوں کی نفاست کا کیا کہنا، دوب کے ایسے سپید سپید ملائم پان، گویا بالائی کے ورقوں میں لپٹا ہوا مصالحہ، کیوڑہ میں لبا ہوا کتھہ، دودھ میں بجھا ہوا چونا، گول باریک کٹی ہوئی چھالیا۔ چنبے تلے الائچی کے دانے، نہ کم نہ زیادہ۔ لال لال لچھے دار صافی، قوام، گولیوں، زردہ اور تمباکو کی شیشیاں علیحدہ، جاڑوں میں خاصدان اور گرمیوں میں طول اور لچھے سے منڈھی ہوئی مٹی کی ہانڈی، غرض کہ تکلفات کا یہ ایک گلدستہ تھا جو نہایت نفاست کے ساتھ سجایا جاتا تھا۔

اسی اسباب میں ناشتہ دان بھی ہوگا جو نہایت تکلف کے ساتھ سجایا جاتا تھا، ناشتہ لے جانے میں اس بات کا خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ کتنی دور یا دیر کا سفر ہے اور راستہ میں کھانے کا وقت پڑے گا بھی یا نہیں، نواب صاحب کو سفر درپیش ہوا اور بیگم صاحبہ کئی دن پہلے سے خشک و تر ناشتہ تیار کرانے کا خیال فرمانے لگیں۔ ناشتہ کوئی معمولی چیز تو تھا نہیں کہ فوراً تیار کرا دیا جائے اور نہ خدانخواستہ کوئی ریفرنیگ کا زمانہ تھا۔ مختلف قسم کی بہت سی چیزوں کا، کافی مقدار میں ہونا ضروری تھا جو میاں کے میاں پن اور بی بی کے سلیقہ کا قصیدہ پڑھتی تھیں، اگر راستہ میں ناشتہ دان کھلنے کی ضرورت ہوئی تو درجہ میں بہت سے بھلے مانس مسافر بیٹھے ہوں گے، یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ ہر شخص کو دعوت دئے بغیر کھانا اکیلے زہر مار کر لیا جائے۔ سب کو دعوت دینا اور ہر شخص کے منہ سے "بسم اللہ" سننا ضروری تھا اور دعوت بھی فقط رسمی نہیں بلکہ اصرار کے ساتھ، اس اخلاق کو برتنے میں اپنی طرف سے یہ سمجھ لینا مناسب نہ تھا کہ دوسروں کے ساتھ بھی ناشتہ ... ہو سکتا ہے اور اگر ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ صاحب بھی اپنے گھر کے سلیقہ کا نمونہ بھی اسی عام دعوت میں شامل کر دیں! تب تو یہ بات اور ضروری ہو گئی کہ کسی کو اپنا ناشتہ دان کھولنے میں خفت نہ ہو، اب تو آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ ناشتہ کو حسب مقدرت زیادہ سے زیادہ تکلف کے ساتھ تیار کرنے میں کن کن باتوں کا خیال کیا جاتا تھا، اچھا

مسکراکر "اچھے رہے"، یہ تو خوشی کے ساتھ میل جول کا ذکر ہے "حضورِ والا" خفگی کے اظہار میں بھی تکلف برتا جاتا تھا، اگلے زمانہ کی بات چیت میں خاکساری کو بہت دخل تھا اور اپنی طرف بڑائی منسوب کرنے سے بچا جاتا تھا لیکن غصہ کی شدت کو حرام مگر اس کے اظہار کو ضروری سمجھ کر "میں" کے بجائے "ہم" استعمال ہونے لگتا تھا مثلاً ہم اسے پسند نہیں کرتے، ہم تو یہ کہتے ہیں، ہمارا تو یہ طریقہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے بھی زیادہ لطیف چیز یہ تھی کہ اگر اتنا غصہ آیا کہ منہ سے گالی نکل جانے یا زیادہ سخت سست کہہ جانے کا اندیشہ ہے تو کسی خاص ملازم یا مصاحب نے مالک کی نظر پہچان کر فوراً یہ فریضہ مناسب احتیاط کے ساتھ اپنی طرف سے ادا کر دیا۔ غصہ سے بھری ہوئی دل کی کچھ بھڑاس بھی نکل گئی اور نازیبا الفاظ بھی درمیان میں نہ آنے پائے۔

ملاقات کے وقت اٹھنا بیٹھنا یعنی نشست و برخاست کا ڈھنگ بھی بڑا پُرتکلف ہوتا تھا گو یہ قواعد بھی حسب مراتب بٹتے تھے۔ لیکن عام طور سے، بزرگوں، صاحب عزت لوگوں، اور دوست احباب کو آتا دیکھ کر سروقد کھڑا ہو جانا اور جب تک انھیں نہایت تپاک کے ساتھ بٹھا نہ لیا جائے خود نہ بیٹھنا ضروری تھا۔ یہی صورت ملاقات کے درمیان میں یا رخصت ہونے کے وقت بھی ہوتی تھی، مہمان صاحب کسی وجہ سے کھڑے ہوئے تو میزبان صاحب بھی فوراً کھڑے ہو گئے اور اسی طرح مہمان نے میزبان کی عزت کا اظہار کیا، جب ایک صاحب بیٹھنے لگے

یہ [illegible] باتیں ہوئیں، گھر میں رہ کر بھی ایسے تکلفات برتے جاتے تھے کہ کس کس تکلف کا ذکر کیا جائے۔ پہلے آداب ملاقات اور اس میں بھی سب سے پہلے سلام ہی کو لے لیجئے، مختلف قسم کے لوگوں کو سلام کرنے کا طریقہ علیحدہ، مختلف طرح کے لوگوں کے سلام لینے کا انداز جدا، ہر طریقہ اور انداز کے ساتھ ایک خاص قسم کا تکلف، عورتوں میں ایک قسم کا سلام، مردوں میں دوسرے قسم کا سلام، مردوں کے سلام میں اگر کسی خاص بزرگ کو سلام کرنا ہے تو جھک کر گردن میں خم کے ساتھ داہنے ہاتھ کی انگلیاں ملا کر اس طرح حرکت دی جائے گی کہ ہاتھ بالکل منھ یا ناک کے سامنے آئے، اگر کسی ایسے بزرگ کو سلام کرنا ہے جس کے ساتھ خصوصیت کم ہے تو ہاتھ تو اسی طرح اٹھے گا لیکن ہاتھ اور منھ کے فاصلے یا زاویہ میں کچھ فرق ہو جائے گا یعنی ہاتھ کی جنبش میں ذرا اترچھا پن آ جائے گا، ان سلاموں کے علاوہ دوسرے منھ کی سلام میں ہاتھ ناک کی طرف نہیں بلکہ کان کی طرف جائے گا۔ اور جھکنے اور گردن کو خم کرنے میں بھی کافی فرق ہو جائے گا، اسی طرح حسب مراتب سلام لینے کے بھی مختلف طریقے ہوتے ہیں، اپنے سے کمتر کے بزرگوں کے سلام کے جواب میں صرف گردن کا اشارہ اور ہاتھ کی جنبش کافی تھی، ان حرکتوں میں مختلف قسم کی مسکراہٹ کا ملانا بھی ایک خاص اہتمام اور تکلف کے ساتھ ہوا کرتا تھا ان کا بھی موقع ہوتا تھا کہ سلام کے جواب میں نہ ہاتھ اٹھے نہ گردن کی حرکت کی جائے بلکہ صرف

مطلب کی سمجھ لیتے تھے۔

آج کل آئے دن مسکنیشیا وغیرہ کا استعمال کر لیا جاتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی مگر ایک زمانہ تھا جب یہ فرض خاص موسم میں نہایت تکلف کے ساتھ ادا ہوتا تھا اور عزیزوں اور دوستوں کے یہاں سے زیادہ تر پان اور کبھی کبھی پھل کے اتنے تحفے آتے تھے کہ آجکل کی رسمی محفلوں میں نہیں دکھائی دیتے، بعض لوگوں کے یہاں امام ضامن کی بھی کثرت ہوتی تھی اور صدقہ و خیرات کے دوسرے طریقے بھی برتے جاتے تھے جس سے بیچارے غریبوں کا بھی بھلا ہوتا تھا۔ حسب معمول تنقیہ میں یہ عالم ہوتا تھا تو درحقیقت بیماریوں کی حالت میں مریض کے ساتھ کیا کیا تکلف برتا جاتا ہوگا اور اسی تکلف میں ہمدردوں کی طرف سے کتنی خیر خیرات ہو جاتی تھی اور مریض کا دل رکھنے کے لئے کیسے کیسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔

غرض یہ ہے کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں انتہائی تکلف نہ کیا جاتا ہو، لوگوں کے پاس دل تھا، فرصت تھی، اطمینان تھا اور تکلفات اچھے سے اچھے اخلاق میں داخل، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا، ہر بات کا ایک الگ تکلف تھا، کسی کے سامنے پانی یا پان تک پیش کرنے میں ایک خاص انداز اختیار کیا جاتا تھا یہ تھوڑی ہی ہوتا تھا کہ گلاس یا پاندان اٹھایا اور بڑھا دیا، بائیں ہتھیلی کے اوپر داہنی ہتھیلی [illegible] اس کے اوپر گلاس اور پھر کے جسم میں تھوڑا سا خم یا [illegible]

دوسرے نے فوراً "بسم اللہ" کہا اور دونوں طرف سے تسلیمیں ہو گئیں
اس اٹھنے بیٹھنے کا مزہ تو اس وقت تھا جب زیادہ تر فرش کی نشست
ہوتی تھی، کرسی مونڈھے میں تو یہ اخلاقی ورزش آدھی سے بھی کم رہجاتی
ہے اور اس کا پورا لطف نجی صحبتوں میں نہیں بلکہ محفلوں میں آتا تھا جب
ہر معزز آنے والے کے خیر مقدم میں قریب پوری محفل ... کھڑی
ہو جاتی تھی اور یہ چہل پہل گھنٹوں قائم رہتی تھی غالباً یہ طریقہ اگلے زمانہ کے
مرغن کھانوں کو ہضم کرنے میں کافی مدد دیتا ہوگا۔

بات میں بات نکلتی ہے، کھانے کے ذکر کے ساتھ کھانے کا تکلف
بھی یاد آگیا ایک تکلف تو یہ کہ کیا کیا کھانا پیش کیا جائے اور دوسرا
تکلف یہ کہ کس طرح اور کتنا کھانا کھایا جائے، میزبان کی طرف سے
جبتک کئی قسم کی نمکین اور میٹھی چیزیں نہ ہوں اس وقت تک دسترخوان
ہی کہلانے کے قابل نہ ہوتا تھا، لیکن مہمان کی طرف سے خوش تمیزی اسی
میں تھی کہ کم سے کم کھایا جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میزبان
برابر اصرار کیے جائے کہ "نوش فرمائیے" "یہ ملاحظہ کیجیے" "آپ کو میرے
سر کی قسم ذری سا اور دیکھئے واللہ آپ تو بہت تکلف فرماتے ہیں"
اور مہمان باوجود تکلف کے یہی کہے جائے کہ "جی ہاں، میں نے خوب
کھایا، سبحان اللہ، نہایت لذیذ چیزیں ہیں، کیا کہنا، میں تو آج معمول
سے زیادہ کھا گیا" ان الفاظ کے معنی کچھ اور ہوتے تھے اور مطلب کچھ
اور لیکن لطف یہ تھا کہ کہنے والا اور سننے والا دونوں اپنے اپنے

غزل

میکش ناگپوری

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے بانیِ میخانہ آج
ڈھونڈتا ہے کو بہ کو تجھ کو ترا دیوانہ آج

دور ہوتا جا رہا ہوں آب و رنگِ دہر سے
کیا چھلکنا چاہتا ہے زیست کا پیمانہ آج

کس کو ہم اپنا کہیں اپنا یہاں کوئی نہیں
جس کو اپناتے رہے نکلا وہی بیگانہ آج

آپ ہی فرمائیے کیسے جبیں سائی کروں
لرزہ بر اندام ہے سنگِ درِ جانانہ آج

ساری دنیا دیکھ لے نا عاقبت اندیشیاں
بجلیوں کے زیرِ سایہ ہے مرا کاشانہ آج

آئیے اور دیکھئے جوشِ تمنا کا مآل
چور ہے مستی میں کتنا آپ کا مستانہ آج

ایں بجا تر من گنہگارم و لیکن ہم نفس
چھوڑ کر تجھ کو کہاں جائے ترا دیوانہ آج

چھیڑنا اچھا نہیں آشفتہ حالِ عشق کو
جا رہی ہے عرش تک آہِ دلِ دیوانہ آج

میکشِ غم آشنا کچھ تو کہو کیا بات ہے

تکلف کے ساتھ بڑھا ہوا۔ مگر ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی ہوتی کہ بات کرنے میں منھ کی رطوبت پانی میں نہ پڑ جائے، پان دینے میں خاموشی کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن زیادہ بات کرنا بھی خلاف ادب ہوتا تھا، بہرحال گردن کے خم اور ہاتھ بڑھا کر پیش کرنے کا انداز خاص ہوا کرتا تھا۔ عورتیں جو صرف اپنے خاص عزیزوں کے سامنے ہوتی تھیں وہ بھی پان دینے کے وقت سر پر آنچل ضرور درست کر لیتی تھیں۔ کس کس تکلف کو بیان کیا جائے اور سب جانے دیجئے، سودا بیچنے والے تک اپنی آواز میں خاص تکلف کے ساتھ اتار چڑھاؤ پیدا کرتے تھے اور خاص قسم کے دلچسپ تکلفی الفاظ استعمال کرتے تھے، آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ہمیں ہمیں ککڑیوں کا بیچنے والا اپنی انتہائی موسیقیت کے ساتھ آواز لگاتا تھا۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں کیا خوب ککڑیاں ہیں، ایک تربوز کی لال لال قاشیں بیچنے والا تو کمال ہی کرتا تھا جب ہزاروں شعر اپنی اس ایک آواز میں کہہ ڈالتا تھا کہ

"من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم"

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

نُور کا تڑکا ہوا

کنہیا لال کپور

رات کے ۵ بجے ہمسائے کے ٹائم پیس کا الارم بجا، ہمسائے کو تو کانوں کان خبر نہ ہوئی کیوں کہ وہ ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے حالانکہ وہ گھوڑوں کا بیوپاری نہیں، لیکن ہماری نیند اچاٹ ہو گئی۔ اب کباب سیخ کی طرح کبھی یہ کبھی وہ پہلو بدلتے ہیں۔ لیکن نیند نے نہ آنے کی گویا قسم کھا رکھی ہے۔ گھبرا کر سوچنے لگے خدانخواستہ ہمیں یکلخت بے خوابی کا مرض لاحق ہو گیا ہے اور اس سے پہلے کہ یہ مستقل آزار کی صورت اختیار کرے ڈاکٹر گھوش سے رجوع کرنا چاہیے پھر خیال آیا، اپنی نیند تو حرام ہو ہی چکی ہے بیچارے ڈاکٹر کی کیوں نیند خراب کی جائے۔ معاً یاد آیا کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ علی الصباح کی سیر کی جائے تو بدن میں چستی آتی ہے یعنی سارا دن آدمی چاق چوبند رہتا ہے، بستر سے اٹھے اور بجلی کا بٹن دبایا بجلی غائب تھی، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار کر بوٹ کی بجائے چپل اور کوٹ کے بجائے واسکٹ پہن کر گھر سے چل نکلے۔

باہر آئے تو عجب سماں تھا چوطرفہ مرغوں کی اذانیں تھیں ککڑوں کوں، ککڑوں کوں کی صداؤں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ خاکروب گلیوں اور سڑکوں پر جھاڑو دے رہے تھے اور ہر طرف ریت اور مٹی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ بازار سنسان تھے اور فٹ پاتھ پر سونے والے خراٹے

غزل

تکمیلؔ رضوی

فنا کے بعد بھی مایوس امتحاں سے نہ تھے
خدا گواہ یہ شکوے غمِ جہاں سے نہ تھے

مٹا دی خاک سی ہستی طلب میں منزل کی
چھٹے کہیں یہ بھی ہم گردِ کارواں سے نہ تھے

شرار و برق سی آہیں یہ اشک بار آنکھیں
نہاں حیات کے پہلو تو رازداں سے نہ تھے

ابھی سے حشر بپا ہو گیا محبت میں !
نشانِ سجدہ مٹے سنگِ آستاں سے نہ تھے

ابھی سے موڑ دیا قصۂ حیات کا رُخ
ابھی تو اشک تھمے چشمِ خوں فشاں سے نہ تھے

نفس نفس میں تھا تکمیلؔ زندگی کا پیام
حیات کے یہ تقاضے تھے پر جہاں سے نہ تھے

جواب دیا "اجی آپ تو ہماری توند کے غم میں یونہی سوچ سوچ کر سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں۔ دیکھیے ننانوے کے پھیرے سے نکلیے۔ کچھ کھایا پیا کیجیے۔" اس تمہید کے بعد جو دوسری دلچسپ باتیں ہوئیں اس قسم کی تھیں۔

"کٹنے گائے کا کیا حال ہے؟"

"جب سے بچھڑا مرا ہے اس نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے"

"تو بیچ دیجئے، بکری خرید لیجئے۔"

"دیکھئے پہاڑی بکری نہ خرید لیجئے گا۔"

"جوڑوں کے درد میں کچھ افاقہ ہوا؟"

"اجی کہاں، ہڈی ہڈی دکھتی ہے۔"

"آلو کی ترکاری، دالیں، دودھ، انڈے، گوشت، اور پھل چھوڑ دیجئے"

"تو گویا بھوکا مر جاؤں۔"

"آپ کی آنکھوں کا کیا حال ہے۔"

"جب سے آپریشن کرایا ہے نگاہ کمزور ہو گئی ہے۔"

"ایک بار پھر آپریشن کرائیے۔"

ان باتوں کی تاب نہ لا کر ان سے اجازت لی۔ اور آگے چلے، کچھ دفتروں میں کام کرنے والے بابو سیر کر رہے تھے سوچا ان کی گفتگو سے حظ اٹھایا جائے ان کی باتیں سن کر طبیعت اور مکدر ہو گئی۔ وہ سب اپنے نئے سپرنٹنڈنٹ سے بیزار نظر آتے تھے اور طرح طرح کے القاب سے اسے یاد کر رہے تھے "بالکل گدھا ہے صاحب" بات کرنے کی تمیز نہیں، خدا جانے کون سے

سنے رہے تھے، کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ چند قدم اور چلے تھے کہ دو ایک کتے "صبح بخیر" کہنے کے لئے ہماری طرف لپکے، گھبراہٹ کے عالم میں کچھ نہ سوجھا کہ ان کا خیر مقدم کس طرح کیا جائے ان میں سے ایک ذرا زیادہ بے تکلف واقع ہوا تھا کہ مصافحہ کرنے کے بجائے بغلگیر ہونا چاہتا تھا ہم نے صدقہ اتارنے کے لئے دائیں چپل اتاری وہ چپل کو دانتوں میں داب کر چلتا بنا، دوسری چپل ہم نے دوسرے کتے کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کی نذر ہے"

ننگے پاؤں سڑک پر چلنے لگے سوچا کیا مضائقہ ہے "یہ یاترا" یوں بھی تو کی جاتی ہے اور پھر ابھی اتنا اندھیرا ہے کہ کسی کو معلوم ہی کب ہوگا، چند گز کے فاصلے پر کچھ لوگ خراماں خراماں چلے جا رہے تھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہم بھی ان سے جا ملے۔ ان میں سے دو ایک شناسا نکلے۔ ہمیں دیکھ کر گویا ان پر بجلی سی گری کہنے لگے "ارے ارے آپ واقعی آپ ہیں۔ کہئے حضرت آج کیسے سیر کو چلے آئے آپ تو دس بجے سے پہلے بستر نہیں چھوڑتے تھے۔ خیریت تو ہے"

ہم نے معذرت کے انداز میں جواب دیا "یونہی آج غلطی ہو گئی، سخت شرمندہ ہوں، آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا" دو ایک منٹ ہماری ہنسی اڑانے کے بعد وہ ایک دوسرے کو آڑے ہاتھوں لینے لگے "کیوں صاحب" ایک نے دوسرے سے کہا "سیر تو آپ روزانہ کرتے ہیں لیکن آپ کی توند گھٹنے کی بجائے بڑھتا جا رہا ہے، کس چکی کا پسا کھاتے ہیں آپ؟" دوسرے نے

کیاریوں میں پیاز اور لہسن لہلہا رہے تھے ان کا نظارہ کر رہے تھے کہ ایک تیز ہوا کا جھونکا جو لہسن اور پیاز کی بو سے بوجھل ہو رہا تھا ہمارے نتھنوں سے ٹکرایا، بے تحاشہ چھینکوں کا تانتا بندھ گیا، چھینکتے چھینکتے جب بے حال سے ہو گئے تو سوچا کہ کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھ جائیں شاید کچھ افاقہ ہو جائے دو ایک منٹ کے لئے چھینکیں رک گئیں. خدا کا شکر کیا کہ زکام میں مبتلا ہونے سے بال بال بچے، سگریٹ سلگایا اور طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے لگے بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ کنوئیں میں جھانک کر دیکھا جائے کہ اس کی تہہ کہاں ہے لیکن جونہی کنوئیں میں جھانکنے کی کوشش کی ایک چھینک زور سے آئی۔ اور سر سے ٹوپی اور ناک سے عینک لڑھک کر کنوئیں میں جا پڑی۔ ان دونوں کا فاتحہ پڑھا اور گھر لوٹنے کا ارادہ کیا۔

جب گھر پہونچے تو شریمتی جی نے سوالوں کی بوچھار کر دی.

"یہ آپ صبح صبح ننگے پاؤں کہاں سے آ رہے ہیں۔؟ عینک کہاں ہے؟ ناک کیوں سرخ ہو رہی ہے کھوئے کھوئے کیوں نظر آتے ہو؟ واسکٹ الٹی کیوں پہن رکھی ہے؟

ہم نے ان تمام سوالوں کے جواب میں مسکرا کر کہا۔ بھاگوان یہ سب نور کے تڑکے کی برکت ہے"

اس دن دفتر میں اونگھتے رہے، عینک کی عدم موجودگی میں بڑی مشکل سے دفتر کا کام کیا، شام کو گھر لوٹے تو سیدھے ہمسائے

اصطبل میں پڑھتا رہا ہے۔۔۔۔ اجی بائولا کتا ہے بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ پاگل ہے صاحب ایک دم پاگل اسے تو رانچی کے پاگل خانے میں بھجوانا چاہیے۔ کل ہم صرف ڈیڑھ گھنٹے لیٹ آئے۔ اور ہماری جواب طلبی ہوگئی بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے شرما صاحب کے زمانہ میں ہم دو دو گھنٹے لیٹ آیا کرتے تھے مجال ہے جو انھوں نے کبھی کچھ کہا ہو۔ اجی صاحب کیا بات تھی شرما صاحب کی وہ تو دیوتا تھے خود کبھی کبھی اس وقت دفتر میں تشریف لایا کرتے تھے جب دوسرے لوگ دفتر سے گھر لوٹتے ہیں۔"

ان سے آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے ایک باغ نظر آیا۔ جی میں آئی کہ مرغانِ سحر کی وجد آور موسیقی کی تعریف تو کتابوں میں بہت پڑھی لیکن کبھی اسے سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیں، اگر حسن اتفاق سے عنادل نغمہ سرا ہوئے، درختوں پر سینکڑوں پرندے بیٹھے ہوئے طلوع آفتاب کا خیر مقدم کر رہے تھے نہایت غور سے ان کا گانا سننے لگے۔ اگر استھائی اس بول پر مشتمل تھی ؎

چوں چوں ٹرپ، ٹی ہوں، ٹی ہوں، ٹیں ٹاں، تو انترہ کے بول تھے ؎

ٹیں ٹیں ٹاں، ٹپ ٹپ ٹراپ ٹراپ، چوں پانچ دس منٹ کے بعد محسوس ہونے لگا کہ جو لوگ اس شور و غل کو موسیقی سے منسوب کرتے ہیں وہ موسیقی کی الف، ب، سے بھی واقف نہیں۔

باغ سے کھیتوں کا راستہ لیا، گھاس پر شبنم اس قدر مقدار میں تھی کہ پتلون کے پائنچے تر بتر ہو گئے، ایک کنوئیں پر پہونچے، وہاں چھوٹی چھوٹی

شعر گفتن چہ ضرور

فضل الرحمن مصباحی مبارکپوری

کچھ لوگ اکتساب علم، اسباب معاشرت مہیا کرنے کے لئے کرتے ہیں یعنی جب آلام و مصائب روزگار، فاقہ کشی کی دعوت دیتے ہیں تو اس شاکش حیات و موت سے بچنے کے لئے اردو کی تیسری اور چوتھی پڑھ لیتے ہیں۔ تاکہ کہیں اردو اور قاعدہ بغدادی پڑھا کر سامان تعیش کیا جا سکے اسی طرح بعض حضرات جن کی آواز کچھ موزوں ہوتی ہے اور راگ لاپنا آتا ہے تو وہ اپنے کو شاعر بنانا چاہتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے کچھ پوشیدہ نہیں۔ غالب و ذوق، میر و سودا عالم بالا کی سیر کر چکے، مگر آج بھی ان کے کلام ہمارے سامنے آئینے کی مانند نمایاں ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ روز بروز ہمارا ادب پست ہوتا جاتا ہے حالانکہ اگر ہم ان کی تقلید ہی میں فن شاعری کو ارتقائی درجہ تک پہونچانا چاہیں تو کوئی مشکل نہیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کے لئے حساس طبیعت، ذوق سلیم اور موزونی طبع ضروری ہیں۔ لیکن آج فطرت سے بغاوت کر کے ماحول و وقت کے محرکات سے منہ موڑ کر شاعری کی جاتی ہے جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ ان کی شاعری بے تاثیر ہو کر رہ جائے بلکہ رہا سہا ادب بھی زائل ہو جاتا ہے۔

کے ہاں پہنچے اور بڑی عاجزی سے کہا۔

"ورما صاحب، یہ آپ نے ٹائم پیس تو خرید لیا لیکن اس سے فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" ورما صاحب نے کہا۔

"میرا مطلب ہے آپ پانچ بجے کا الارم تو لگا دیتے ہیں لیکن اٹھتے دس بجے ہی ہیں۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

"اگر مناسب سمجھیں تو ٹائم پیس مجھے فروخت کر دیں، مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد ورما صاحب نے ۵ روپے میں ٹائم پیس فروخت کر دیا۔ ہم نے اسے ایک مضبوط سیف میں رکھ کر تالا لگا کر نہ یہ صبح پانچ بجے بج سکے اور نہ نور کا تڑکا ہوگا۔"

(شکریہ آئی ای آر)

اس لئے الفاظ اور ان کی ترکیب کا خیال نہیں کرتے۔

مگر میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا فن شاعری میں اس کی گنجائش ہے ایسی ایسی صریح غلطیاں بھی معاف کی جا سکتی ہیں، اگر اس میں تصوف کا غلبہ ہے تو کوئی ہمیں کتب مذکورہ سے ثابت کردے کہ ان میں ایسے ایسے بھی اشعار ہیں جو عام بازاری شاعروں میں نہیں پائے جاتے۔

اصغر گونڈوی مستند شاعر ہیں ان سے بڑا صوفی بھی کو خاطر میں نہیں لایا جا سکتا مگر فن شاعری کے ؟! اصول انھوں نے برتے ہیں۔ ایجاز و اختصار کا ان میں اتنا مادہ تھا کہ ہر سخت سے سخت بات کو ایسی آسانی اور شمولیت کے ساتھ کہہ جاتے تھے کہ صاف دل میں اتر جاتی تشبیہ و استعارہ، مصوری، حسن تعلیل، محاورات کی شستگی، الغرض ان میں ہر وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کا فن شاعری متقاضی ہے اور جو ایک فنکار شاعر میں ہونا چاہیئے۔ اور تصوف کے ایسے ایسے مسئلے حل کئے ہیں جن کو خاطر میں نہ لایا جا سکتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو مجھ پہ گذر رہی ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پہ ستارہ سحری!

اللہ رے دیوانگی شوق کا عالم　　اک رقص میں ہے ذرہ صحرا نظر آیا
کسی کا نام لب پہ آ رہا ہے　　سنائے جا میرے غم کا فسانہ
کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم　　کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اس بات میں مرزا احمد علی صاحب کا یہ قول مختصر گفتی ہے ضرور، قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔

اب ہم چند شعراء کے کلام پیش کرتے ہیں جن میں داخلی پہلو سے قطع نظر صرف صنعت خارجی پر نظر ہوگی اور یہ ظاہر کریں گے کہ ایسے ایسے اگر شخص کسی بنیا کے نوکر ہوتے تو ان سے کبھی کبھی نمک اور مسور کی دال کا بھاؤ پوچھ لیا جاتا، ناحق شاعر کا دعویٰ کر کے ذلت و رسوائی کا شکار بنتے ہیں۔

مگر اس سے مجھے یہ بتانا ہرگز نہیں کہ وہ اب سے شاعری کرنا چھوڑ دیں بلکہ صرف یہ کہ اگر واقعی شاعری کرنی ہے تو اس کے قیود کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

سب سے پہلے اس باب میں جناب بیکل بلرامپوری کا نام لیا جا سکتا ہے اگر ان کی آواز موزوں ہے ترنم اچھا کر لیتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ شاعری بھی کریں؟ وہ بھی اگر صرف اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے وقتی طور پر کچھ کہہ لیتے، اور دل ہی دل میں محظوظ ہوتے تو اور بات ہوتی، کتاب لکھ کر اردو ادب کا معیار پست کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ہر مبتدی شاعر جناب موصوف کی احسن اور تحفہ بیکل، پڑھ کر یقیناً اردو ادب کی شاہراہ سے بھٹک کر گمراہ ہو سکتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ بیکل صاحب جو بھی کہتے ہیں اثر میں ڈوب کر کہتے ہیں، وہ صوفی منش ہیں ان کا میلان زیادہ تر معنویت سے متعلق ہوتا

اُمید ملنا' یہ نہ تو لکھنؤ اسکول کا' روزمرہ ہے نہ ہی دہلی کا' اُمید ہوتی ہے اور امید کی جاتی ہے' نہ کہ امید ملتی ہے

۲۔ جلد بلا تو رب کے ولائے   سانس ہے باقی جان نہیں ہے

ایسا عجوبہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر قوت باصرہ کے مشاہدہ کیا جائے۔ اور بغیر جان کے سانس آتا جاتا رہے۔

۔یہ لباس بشریت میں کیا آگیا   فرش پر عرش کا ناخدا آگیا!

بشریت' یا کی تشدید کے ساتھ صحیح ہے، تخفیف یا کی غلط' پھر عرش کوئی دریا اور کشتی تو نہیں جہاں ملاح و ناخدا کا تذکرہ کیا جائے' لفظ کیا شی لایعقل کے لئے آتا ہے' جیسے بندر کو دیکھکر "یہ کیا آگیا" غالباً بیکل صاحب نے "کون آگیا' کا مفہوم اس سے لیا ہوگا جو غلط ہے۔

نہ آیا جس کو یقیں وہ تو بوجہل ہی رہا   جو سچ کہے اسے صدیق کا خطاب ملا

'جہل' فتحہ ہائے ہوز غلط ہے صحیح بالسکون ہے۔

مولانا معنوی ؎

سنگہا اندر کف بوجہل بود   گفت اے احمد بگو ایں چیست زود

"جو سچ کہے" سے غالباً جس نے سچ کہا۔ کا معنی پیدا کرنا چاہا ہے (دگر غلط ہے)

اختیار رجعت کا دم دیکھئے   چاند سورج اشاروں پہ چلنے لگے

چند لفظوں میں دلیری مراد وہ اردو ہے جو عربی و فارسی سے معرّا ہو' اضافت و توصیف اور عطف بجاعت عربی لفظ ہے' اس لئے چاند سورج

اے شیخ رہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایمان بنا دیا

میں نے اصغر گونڈوی کے کلام صرف اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ حضرات ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک صوفی قسم کا آدمی بھی جب منزل فن عروض میں قدم رکھتا ہے تو خود اسکی فنی بیہوشی رہبری کرتی ہے، یہ کوئی عذر نہیں ہے کہ بیکل صاحب صوفی ٹائپ کے انسان ہیں اس لئے معذرت سنی جا سکے۔

اب ہم بیکل صاحب کی عن اور تحفہ بطحی کے چند اشعار اپنے دعوی کی دلیل میں پیش کرتے ہیں، انشاء اللہ اس مضمون کی دوسری قسط میں دوسرے شعراء بھی آئیں گے۔

تحفہ بطحی۔

۱

لپٹ گیا ہے جو قدم رسول سے بیکل — قسم خدا کی اسے دائمی نجات ملی

قدم عربی لفظ ہے اس کا استعمال عربی میں تعیین ہے اور فارسی شعراء تحریف بھی بلا تعریف ہی باندھتے ہیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اردو میں بھی بلا ردو بدل اسیطرح ہے

راہ صحرا کی جو ہم دیکھتے ہیں — جتنے کانٹے ہیں قدم لیتے ہیں

اس سہارے پر لکھی بیکل نے نعت مصطفےٰ

حشر میں امید بخشائش کی بھی مل جائے گی باقی

اپنے زورِ طبیعت ہونا چاہیے، مضاف الیہ اور صفت کا کوئی اثر نہیں۔

اردوں طرف صحابہ ہیں اور بیچ میں حضور
جیسے ہو ماہتاب ستاروں کے بیچ میں

رسالہ "ماہِ طیبہ" کے ٹائٹیل پر آپ نے دیکھا ہوگا

محمد ماہ و گردش چار اختر — ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

ماہ، ماہتاب، اختر، ستارہ، الغرض بیکل صاحب کو صرف اتنی جرأت مل سکتی ہے کہ آپ نے اس فارسی شعر کا ترجمہ کر دیا جس کو دوسری صورت میں ترجمہ سے متجاوز ہو کر سرقہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ہمیشہ کہیں بہا کہیں سورج پلٹ پڑا — اعجاز ہے نمایاں اشاروں کے بیچ میں

مصرع میں اول لفظ "پلٹ پڑا" کا تلفظ ذوقِ سامعہ کو اسی قدر گراں گزرتا ہے جس طرح رات کے سناٹے میں تالاب کے اونچے کگار سے دی کچھوا پانی میں آرہا ہے

سرکارِ دو عالم کیا ہیں صدیقؓ و عمرؓ سے پوچھو
کیسی شمع ہوتی ہے بتلا دیں گے پروانے

اگر ولی دکنی کے زمانہ میں کوئی جاہل شمع کو میم مشدد کے ساتھ استعمال کرتا تو شاید معاف کیا جا سکتا مگر آج کے ترقیاتی دور میں بیکل کے حال زار پر ترس کھا کر بھی معاف نہیں کیا جا سکتا، صحیح شمع بالفتح ہے۔

پھر نہیں دیکھا بجز اک شعلہ پُر پیچ و تاب — شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا (میر)

انسانیت کے اجڑے محلات مسکرائے

کافی ہے، واؤ غلط

یہ کرامات ان کے غلاموں کی ہیں — شیر و چیتا سواری میں چلنے لگے

چاند و سورج والی ترکیب میں مجھے شبہ ہوا کہ جناب بیکل کا نہیں بلکہ کاتب کا کرم ہوگا، مگر اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی تاویل کی جا سکے یہ ان کا جہل محض ہے۔

بحرِ جلالِ الٰہی کو جنبش ہوئی — بوجہل تری دنیا سے چلنے لگے

شاید یہ غلط مصرع اس کی رہبری کر سکے۔

وہی چال بے ڈھنگی جو کہ پہلے تھی سو اب بھی ہے

لولاک لما کا راز کھلا قد جاءکم کا مفہوم ملا
تشریف لے آئے نورِ ازل کلمے کی تلاوت ہوتی ہے

پہلا مصرع وزن سے یکسر خارج ہے، البتہ اگر جاء کے ہمزہ کو خلاف عرب کر کے محض جاکم پڑھا جائے تو مصرع موزوں ہو سکتا ہے اور بیکل صاحب نے یہی سمجھ کر کہا ہوگا۔

مگر میں بیکل صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ ایسے ایسے طریقے کلام پاک کی تلاوت کے ہرگز نہ ایجاد کریں جن سے تحریف لازم آئے خود بھی مستحق عذاب اور اس کے پڑھنے والے غیر بھی

"زاہد کو اپنی زہد و ریاضت پہ ناز ہے
شاعر کو اپنی زورِ طبیعت پہ ناز ہے

زہد اور زور دونوں مگر میں اس نے "اپنے زہد و ریاضت"

ہیں روشن چاند تارے عارض انور کے سائے میں

شب ور نگین کی رونق مہ و اختر کے سائے میں

شب کی صفت کے باوجود رنگین کو باعلان نون پڑھنا غلط ہے۔

میں سطحی نظر سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کرکے ظاہر و باہر غلطیاں پیش کر دی ہیں اور وہ بھی ایسی جن کا تعلق محض لفظ سے تھا، اگر فن شاعری کی قیود کو مدِ نظر رکھ کر بیکل صاحب کی مصنفات پر نظر ڈالی جائے تو کوئی شعر عیب سے خالی نہ ملے گا۔ مگر اس سے کسی کی ہجو مقصود نہیں بلکہ صرف یہ کہ اردو ادب میں اس قسم کی غلطیاں بری طرح ابھرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ میرا اصلی مقصد یہ ہے کہ حضرات ناظرین سے جو شاعرانہ مذاق رکھتے ہیں وہ اس قسم کی غلطیوں سے احتراز کریں۔ اس مضمون کی دوسری قسط میں دوسرے شعراء کے نام آئیں گے۔

محل عربی لفظ ہے لام کی تشدید کے ساتھ صحیح ہے بالسکون غلط اس لئے اس کی جمع بھی محلات بالتشدید آئے گی البتہ آب حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہندی جمع بالتخفیف آسکتی ہے اس لئے مخلوط استعمال کرسکتے ہیں۔

حسن مجلی:۔

یقیناً سبھی کچھ خدا نے بنایا　　مہر اپنی قدرت کی سب پر لگایا

مہر فارسی لفظ ہے اس کا استعمال بضم المیم و سکون الہاء المہملہ ہے۔ اس لئے بفتح ہائے ہوز استعمال کرنا غلط ہے۔

بوقت نزع دل میں ذکرِ الٰہی　　زباں پر ہو مرے ثنائے محمدؐ

نزع بفتحتین غلط ہے صحیح بالفتح ہے۔

شنیدم کہ در وقت نزع روان　　بہ ہرمز چنیں گفت نوشیروان

سعدی شیرازی

سلامت آپ کی کملی اجاگر سایۂ رحمت　　قیامت میں گنہگاروں کی چشم نم بدل جائے

نم بمعنی تری ہے نہ کہ تر، اس لئے چشم نم کی ترکیب غلط ہے، چشم پر نم صحیح ہے۔

وہ آسماں پہ تاروں کا جگمگانا ہے　　وہ گلستاں میں کلیوں کا مسکرانا ہے

گلستاں باعلان نون درست نہیں، الا بصورت اضافہ و توصیف

نسیم سحر وہ گلشن میں گنگناتی ہے　　مجھے تو شاہ مدینہ کی یاد آتی ہے

سحر بسکون ہائے حطی غلط ہے، بالتحتین صحیح ہے۔

اس وقت مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے، سلیکشن کمیٹی کے رکن سید سلیمان ندوی سے خواہش کی کہ آپ مولانا راغب سے کچھ ادب کے بارے میں کچھ سوال کریں، سید صاحب نے فرمایا کہ میں کیا سوال کروں؟ مجھے تو حیرت ہے کہ مولانا راغب نے عربی میں ستر اسی شعر کا غزلی قصیدہ صنعت منقوطہ میں کیونکر لکھ لیا۔ حالانکہ امیر خسرو وغیرہ اس صنعت میں چار پانچ سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکے، ادب کے بعد فقہ کا نمبر آیا اور سید صاحب نے مولانا سے "ہدایہ" کی کسی بحث کی تشریح کرنے کے لئے کہا مولانا نے نہ صرف اس بحث کے تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی بلکہ صاحب ہدایہ پر بعض اعتراضات بھی وارد کر دیئے۔ اس واقعہ سے ان کے تبحر علمی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ممکن نہ تھا کہ کسی غیر معروف سی حدیث کے متعلق بھی ان سے پوچھا جائے اور وہ اس کا حوالہ، متن، اسناد، روایت کی جرح و تعدیل کے ساتھ نہ دکھا سکیں یا عربی کے کسی غیر مانوس لغت کی نسبت ان سے استفسار ہو اور وہ اس کے معنی اور استعمال مع شواہد و نظائر نہ بتا سکیں مولانا کو عربی ادب میں مولانا رفاقت اللہ صاحب سے، حدیث میں مولوی عبدالمقتدر صاحب اور حضرت مولانا سید یونس علی صاحب سے اور معقول میں جناب مولانا محب احمد صاحب سے تلمذ تھا، دوسرے الفاظ میں حدیث میں ان کا سلسلہ میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے اور معقول میں مولانا فضل حق خیرآبادی سے ملتا تھا۔ اردو شاعری میں انھوں نے ابتداً کچھ غزلیں منشی احمد علی شوق کو دکھائی تھیں۔ مولانا ایک نادر کتبخانہ

بدایوں کی ادبی شخصیتیں

نظیر احمد صدیقی بدایونی

مولانا یعقوب بخش راغب

زمانہ ماضی میں مسلمانوں میں ایسے افراد کی کافی تعداد ہمیں تاریخ میں ملتی ہے جو صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قلم بھی یا علوم دینی میں متبحر تھے اور علوم دنیاوی میں بھی لیکن موجودہ دور میں ایسی مثالیں النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہیں۔ لیکن مولانا راغب کا شمار مستثنیات میں ہے وہ بیک وقت حدیث کے عالم بھی تھے اور فقہ کے ماہر بھی، تاریخ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان ریاضی دانی کے ثبوت میں ان کا ترجمہ "قانون مسعودی" پیش کیا جاسکتا ہے اور ان کی نجوم کی واقفیت کی سند میں ان کا رسالہ "الانجم الطوالع" کافی ہے، عربی نثر وہ اس قدر قلم برداشتہ لکھتے تھے کہ ہندی علماء میں کم حضرات ان کی ہمسری کر سکیں گے، شاعری کا یہ حال تھا کہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ اور واقفانِ فن سے خراج تحسین حاصل کیا ہے کبھی زور کلام دکھانے پر طبیعت مائل ہوئی تو عربی میں طویل قصیدے صنعت غیر منقوط نیز صنعت منقوط میں کہہ ڈالے، ایک مرتبہ عربی لیکچرارشپ کے انٹرویو میں سر شاہ سلیمان نے جو

کر کے ریٹائرڈ ہوئے اور علی گڈھ میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، وفات پائی۔ جوش صاحب اردو کے بڑے ادیب اور کامیاب افسانہ نگار تھے انھوں نے اس وقت اردو کی خدمت شروع کی جبکہ ہمارے آج کل کے بہت سے ادیبوں نے قلم اٹھانا بھی نہ سیکھا تھا، ان کی متعدد کتابیں مثلاً مضامین جوش، جوش و فکر، ملک میں شہرت حاصل کر چکی ہیں اور اگرچہ گذشتہ چند سالوں میں افسانہ کا فن کافی ترقی کر چکا ہے تاہم وہ آج تک قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مالک تھے جس میں عربی کے قیمتی قلمی نسخے جمع تھے، یہ نسخے کچھ تو خود مولانا نے حاصل کئے، کچھ ان کو اپنے پرنانا مولوی علی بخش شرر کے کتب خانے سے دستیاب ہوئے، مولانا راغب مرحوم چھوٹی عمر میں مولانا عبدالقادر صاحب قادری بدایونی سے بیعت ہو گئے تھے اور اوراد و ظائف، عملیات و مجاہدات سے کچھ نہ کچھ شغل چلا جاتا تھا، ان کے کشف کے بعض واقعات بھی لوگوں نے بیان کئے ہیں ان کے اکثر عربی قصائد طبع ہو چکے ہیں ــ مگر افسوس کہ اردو دیوان کس مپرسی کی نظر ہو رہا ہے، جو شعر اس وقت حافظے میں رہ گئے ہیں نذر قارئین کئے جاتے ہیں ؎

اب ہم ہیں اور بہار تماشہ ہے حشر تک
آنکھیں ہوئیں ہیں بند رخ یار دیکھ کر

سجدے میں سر ہے باب حرم پر پڑا ہوا
اب سر اٹھائے گی نہ شکایت نصیب کی

نہ لوں ملے جو کہیں قسمت رقیب مجھے
خوشا نصیب وہ کہتے ہیں بدنصیب مجھے

سلطان حیدر جوش:

بدایوں سے دو میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے جو شیخو پور کے نام سے مشہور ہے یہاں شیوخ فاروقی کا ایک خاندان مدت سے آباد ہے جو جہانگیر کے زمانے سے ریاست و وجاہت میں نامور رہا ہے جوش مرحوم اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے ایم اے او کالج سے بی اے کیا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ پوری مدت تک نیک نامی کے ساتھ ملازمت

چند جلے سننے کو مل جاتے مگر اس سے کیا فرق آتا، اس کو کوئی غم کے اتھاہ سمندر سے تو نکال سکتا نہیں تھا۔

یوں تو کہانیاں وہ تقریباً دو درجن رسالوں کے لئے لکھتا تھا مگر ان کے مدیران میں محض چند ایسے تھے جو کسی کہانی پر اس کو دس یا پندرہ روپے بھیجد یتے تھے جن سے اس کی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی لو کچھ دنوں کے لئے بجھنے سے محفوظ ہو جاتی تھی بس۔

پھر ایک دور ایسا بھی آیا جس میں مسلسل کئی ماہ تک اس کو کہیں سے ایک پیسہ بھی نہ ملا، مگر وہ خون جگر جلا جلا کر لوگوں کی مسرت و زندگی کا سامان فراہم کرتا رہا مگر وہ خود موت کے غار سے قریب سے قریب تر ہو گیا۔ دنیا کا ہر انسان ایک فریب پیہم میں مبتلا ہے ایک امید کے سہارے جی رہا ہے۔ مستقبل کا سنہرا خواب دیکھ رہا ہے اور اگر انسان سے یہ سہارا بھی چھین لیا جائے تو پھر اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ اپنے تخیل کی وسعت کے مطابق ہر شخص چند لمحوں ہی کے لئے سہی خوشی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔

بقدر پیمانۂ تخیل خوشی میسر ہے آدمی کو
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

یا جد بھی حسن مستقبل کی امید میں حال کے تمام آلام و افکار اپنے دل و دماغ پر اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ وہ اتنا بڑا افسانہ نگار جس کی شہرت و مقبولیت ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر دوسرے ملکوں

افسانہ نگاری

نسیم بستوی

اس نے زندگی کی نامرادیوں ـــ شب و روز کی پیہم مایوسیوں ـــ جو اپنے روزگار کے زخموں کے درد و کرب کے سوا آج تک کچھ بھی نہ پایا تھا ـــ اس کی مثال اس کشتی کی سی ہو گئی تھی جو موجوں کے پے در پے تھپیڑوں سے برابر ہچکولے پہ ہچکولے کھا رہی ہو، اور ساحل کا کہیں دور دور تک پتہ نہ ہو ـــ ماجد زمانہ کا ہر ستم اٹھانے کے لئے صرف تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے اوپر پانچ زندگیوں کا پہاڑ جیسا وزنی بوجھ لدا ہوا تھا جن کی روٹی اور کپڑے کا سوال اس کے دل و دماغ پر اس بری طرح مسلط تھا، جیسے کسی کی گردن میں سانپ بچھو کا مالا ڈال دیا جائے اور اسے اس کی جان لیوا صورت سے ایک لمحہ بھی قرار نہ ملے کہ خدا جانے کب ان موذی جانوروں کا زہر رگوں کا خون جلا کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔

ماجد ایک اچھا اور مقبول خاص و عام افسانہ نگار و کہانی نویس تھا مگر اس کی حالت اک بھیک منگے سے بھی کہیں زیادہ خراب و خستہ تھی، اس کی کہانیاں پڑھ کر اس پر داد و تحسین کے پھول نچھاور کرنے والے ہزاروں انسان اس کے غمناک لیل و نہار سے ناواقف تھے ـ اور اگر کسی کو خبر بھی ہوتی تو وہ کیا کر سکتا تھا ـــ بس اس کو جھوٹی تسلیوں کے

کتنوں ہی مرتبہ چمک کر ڈوب گئی ہوں گی لیکن ماجد کی شامِ الم کا دامن دراز ہی ہوتا گیا۔ اسے کبھی سحر کا نور نصیب نہیں ہوا ؎

چمک چمک کے ہزاروں آفتاب ڈوب گئے
ہم اپنی شامِ الم کو سحر بنا نہ سکے

انسان کہاں تک صبر۔ کس قدر غم برداشت کرے ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے، ماجد ان خوددار انسانوں میں سے ایک تھا جو اس حقیقت پر سختی سے پابند ہوتے ہیں ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لیکن برسوں سے مسلسل غم کا کڑوا گھونٹ پیتے پیتے اس کا قدم انسانیت کی منزل پر بڑی طرح ڈگمگانے لگا۔ اس نے سوچا کسی سیٹھ کی بھری تجوری سے روپے اڑا لئے جائیں، کسی مہاجن کا گھر رات کی تاریکی میں جاکر لوٹ لاؤں مگر پھر اس بھیانک پاپ کے تصور سے اُسے ابکائی آگئی۔ اس کا خوددار دل خود اسی کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ "ماجد تم اس قدر نیچے اترنے کا خیال رکھتے ہو، تھو تھو کتنا ناپاک خیال ہے تمہارا، اس سے کہیں بہتر تو یہ ہے کہ گنگا میں پھندا ڈال کر خود کشی کر لو۔ یا اپنے کو دریا کی خوفناک موجوں کے سپرد کر دو۔ مگر تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تمہارے ساتھ چار زندگیوں کا بھی تو سوال ہے۔!"

اس کے دوستوں اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اس نے

کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی زندگی میں دولت کی بہار ضرور آکر رہے گی۔ پھر اس کے جگر کے ٹکڑے پھول کی طرح کھل جائیں گے ان کے بے نور چہرے پر خوشی و مسرت کی نورانی لہریں رقص کریں گی۔ ان کے جسم کے لٹکتے ہوئے گندے اور متعفن چیتھڑے زرق برق لباسوں میں بدل جائیں گے۔ ان کو ہر شخص بیقرار ہو کر محبت سے اپنی آغوش میں کھینچ لے گا۔ اس کی شریک حیات انیسہ اندرونی غم میں نہ گھلے گی۔ اس کے نازک اور حسین جسم پر سونے چاندی کے خوبصورت زیورات چمک اٹھیں گے اس کی بہن کی کسی اچھے گھر شادی ہو جائے گی۔ اس قسم کے اور بہت سے خیالات کا شاندار محل وہ چند گھڑیوں میں تیار کر لیتا اور جب اس قسم کی باتیں وہ سوچتا تو اس کے اداس چہرے پہ جیسے زندگی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ فرط شادمانی میں وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ اسی طرح سوچتے سوچتے خیالات کے بڑے بڑے خوبصورت محلات تیار کرتے کرتے برسوں بیت گئے۔ وہ جوانی کی منزل سے گذر کر...... قبل از وقت بڑھاپے کے حدود میں داخل ہو گیا۔ سر کے بے ترتیب اور الجھے ہوئے بالوں میں سفیدی کا رنگ جھلکنے لگا۔ مگر اسے گردش ایام سے نجات نہ ملی۔ بچوں کے چہروں پہ خوشی نہیں آئی۔ بہن کی شادی کا پیغام کسی ادھر ادھر سے بھی ان کے یہاں سے بھی نہیں آیا۔ بیوی گھل گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔

سورج ایک دو بار نہیں سیکڑوں ہزاروں بار چمکا ہوگا۔ شفیع

قابل قدر سرمایۂ ناز ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ہمت افزائی
بھی نہیں کر سکتے ۔ مجھے آپ کے پر درد خط نے بہت ہی
متاثر کیا ہے ۔ اور آپ کی خدمت کے لئے بیقراری
کے عالم میں ایک نہایت کامیاب صورت بھی نکال لی ہے
آئندہ ماہ "تعمیر ادب" کا افسانہ نمبر شائع ہو رہا ہے ؟ آپ
پہلی فرصت میں اس کے لئے ایک شاندار کہانی لکھکر روانہ
کریں ، کہانی کے مطابق ہوا تو میں آپ کو اس کا معاوضہ حاضر
کر دوں گا ۔ امید کہ آپ جواب کہانی کے ساتھ جلد ہی
ارسال فرمائیں گے ، منتظر ہونگا ۔

میرے لائق اور کوئی کارِ خدمت

آپ کا اپنا ایڈیٹر تعمیر ادب دہلی

۱۰ر جولائی ۵۹ء

ماجد نے ایک عظیم کہانی کے کردار کاغذ پر بکھیرنا شروع کر دیا اور بھوک کی تپش میں انتہائی توجہ و انہماک کے ساتھ ایک رات کے اندر حد تکمیل تک پہونچا دی ۔

جب کہانی کی اختتامی سطروں تک اس کا قلم پہونچ گیا تو اس نے اطمینان کا ایک بھرپور سانس لیا ۔ ایک جگہ کئی گھنٹے جمے رہنے کے باعث اس کے کمزور جسم کے جوڑ جوڑ میں پھوڑے کی سی ٹیسیں ہونے لگیں پھر اس جگہ اپنی معمولی ٹوٹی پھوٹی کرسی پر دراز ہو گیا اور اس وقت تک بے خبر سوتا رہا

سوچا لاؤ اپنے محبت کرنے والوں کے پاس ہی خط لکھنا شروع کر دوں شاید کسی بندۂ خدا کو مجھ ناتواں پر ترس آ جائے ۔ مگر اس کا پروگرام بھی اسی طرح خیل ہو گیا جیسے کئی درجن خطوط ان نے انسانوں ۔ پاس نہیں جانوروں کے پاس بھیجے تھے جنھوں نے ان خطوط کو کچھ نہ سمجھتے ہوئے پیروں سے روند ڈالا ۔

تمام خطوط سپردِ ڈاک کرنے کے ایک ہفتہ کے بعد ہر روز منی آرڈر کا انتظار کرنا اور پوسٹ مین سے روپے کے متعلق دو ہفتے تک ہر روز ہی پوچھتا ۔ مگر منی آرڈر کے سلسلے میں "نہیں" کا مختصر سا جواب سن کر اس کا دل بیٹھ جاتا ۔ پھر چند گھنٹوں کے بعد کل کے لئے ایک امید کی ہلکی سی خوشی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی ۔ چند دوستوں نے خطوط کے جواب دینے کی زحمت گوارا بھی کی تو انھوں نے بجائے تسلی کے چند الفاظ تحریر کرنے کے اپنی داستانِ غم کی تفصیل لکھ کر بھیج دی ۔ رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں نے بھی بہت تاخیر کے بعد روکھا پھیکا دل شکن جواب دیا ۔ مگر ان میں اتفاق سے ایک دردِ آشنا بھی نکل آیا جس کے جواب سے ماجد کو کچھ اطمینان ہوا ، انھوں نے لکھا تھا ۔

محترمی ! تسلیم و نیاز !

آپ کا مرسلہ گرامی نامہ ملا ! آپ کی معاشی زبوں حالی کی خبر سے بیحد صدمہ ہوا ۔ کیا کیا جائے ماجد صاحب ! یہ ہم مدیرانِ رسائل و جرائد کی انتہائی غفلت و سستی ہے کہ ہم اپنے مشہور

ماجد نہایت تیز [illegible] جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں
شفیق کی آواز ٹکرائی۔ "السلام علیکم ماجد بھائی!" مڑ کر دیکھا تو ایک گلی سے
شفیق مسکراتا ہوا اس کے قریب ہو رہا تھا اور وہ وہیں چند لمحوں کے
لئے ٹھہر گیا۔ "کہئے شفیق بھائی خیریت تو ہے نا بھابی اور بچے مزے
یں ہیں نا؟" شفیق اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "کیا آپ نے
ری سے ابھی حال ہی میں صحت پائی ہے بالکل نحیف و لاغر نظر آ رہے
یں اور آپ کی آنکھیں بھی تو سرخ انگارہ ہو رہی ہیں شاید کسی وجہ سے
ت بھر نہیں سو سکے ہیں آپ؟" اس کا جواب ٹالتے ہوئے ماجد نے
ہا۔ "اچھا میں ذرا پوسٹ آفس تک جاؤں گا پھر کبھی ملوں گا۔"
شفیق مایوسی کے انداز میں بولا۔ "بہت بہتر جائیے۔"

جب ماجد اس کے پاس سے رخصت ہو کر چلنے لگا تو شفیق اپنی جگہ
ھڑے کھڑے دور تک نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتا رہا اس کے
ل میں طرح طرح کے خیالات آ جا رہے تھے

کیا ماجد کو کوئی بڑا روگ لگ گیا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ اس کے دماغی توازن میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ خدا رحم فرمائے
س پر کیا صورت ہو گئی ہے اس کی۔ یہ آخری جملہ اس نے ایک
ھنڈی آہ کے ساتھ ادا کیا اور اپنی راہ اس کے متعلق سوچتا ہوا اپنی
راہ پر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ واقعہ ہے ع

میاں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

فضا میں موت کی تاریکیاں چھانے لگیں ۔۔۔ زندگی کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ جیسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی بجھا کر خاموش کر سکتا تھا۔

ماجد کی کہانی "تاریکیاں" تعمیر ادب کے دفتر پہونچ گئی......

ایڈیٹر نے اسے شروع سے آخر تک پڑھی اور بہت پسند کی ۔۔۔ کہانی افسانہ نمبر کے نمایاں صفحات کے لئے متعین ہو گئی اور افسانہ نگار کے لئے سو روپے کا معاوضہ طے پایا۔ اور ڈاک ذریعہ وہاں سے ماجد کے نام روانہ بھی کر دیا گیا۔ دفتر سے کہانی نویس کے نام ایک رجسٹری بھی بھیجی گئی جس میں ایڈیٹر نے لکھا تھا۔

مکرمی! تسلیم و نیاز

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ آپ کی کہانی "تاریکیاں" نظر سے گذری بیحد پسند آئی ۔۔ ابتک دفتر میں افسانہ نمبر کے سلسلہ میں جتنی کہانیاں موصول ہو چکی ہیں ان میں آپ کی کہانی سب سے زیادہ موثر اور کامیاب ہے' سچ پوچھئے تو آپ کی کہانی تعمیر ادب کے افسانہ نمبر کی جان ہے..... اس کامیابی پر آپ کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے، ایک بار پھر اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ ملک کے بلند پایہ کہانی نویسوں کے لئے باعث فخر ہیں۔۔

میں پر خلوص گذارش کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی میرے رسالہ کے لئے اسی قسم کی بہترین کہانیاں ارسال فرما کر مجھے شکر گذار ہونگا

[illegible]ک خانہ سے واپس ہو کر سیدھا گھر آیا اور اپنی ٹوٹی چارپائی پہ لیٹ گیا۔ شب بیداری سے اس کا عضو عضو ٹوٹ رہا تھا نیند پوری نہیں لے سکا تھا اس لئے دوبارہ سو گیا اور جب دو گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں چارپائی کی پٹیوں میں کس کے باندھ دئیے ہوں، اس میں حرکت کرنے کی بھی تاب باقی نہ رہی تھی اس عجز و درماندگی سے اس کا دل رونے لگا...... پھر اس دکھن نے بخار کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی اور چند ہی گھنٹوں میں دیکھتے دیکھتے اس کا جسم شدید بخار کی آگ میں جلنے لگا۔

ماجد کی اس حالت سے گھر کی تمام زندگیاں غم کے ایک نقطہ پر سمٹ کر جمع ہو گئیں، انیسہ کی نگاہوں میں خوفناک تصویریں ناچنے لگیں۔ بہن کی آنکھیں خوشگوار گھڑیوں کا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں، اس کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے جیسے کاجل کی ہلکی سی لکیر جو اس کی جوانی پر بد نما داغ تھی اختر اور شاہین دونوں بچوں کے پھول جیسے چہرے مرجھا گئے جیسے خزاں کی آتشیں لپٹ سے پھولوں کا رنگ روپ جھلس جائے جن کی جانب کوئی اچٹتی سی نظر ڈالنے کے لئے آمادہ نہ ہو۔

بخار کے ساتھ ساتھ ماجد کو کھانسی بھی آنے لگی جس نے اس کے پھیپھڑ کو چھلنی کر کے رکھ دیا — دوا علاج نہ ہونے کے باعث اس پر ٹی کا حملہ ہو گیا...... کمزوری اس قدر بڑھ گئی کہ چارپائی سے اٹھ کر دو قدم چلنا بھی اس کے لئے دوبھر ہو گیا — پورا گھر ماتم کدہ بن کر رہ گ

بیٹے پر نظر پڑی تو اسے اپنے قریب کرکے نہایت نحیف آواز میں بولا
کیا کہتے ہو شاہین بیٹے" شاہین پھر بولا۔ [illegible] نام لیا اور تحصیلی آئی
ہے۔" اس خبر سے ماجد کے چہرے پر ایک آن کے لئے خوشی کی ہلکی سی لہر
ابھری اور جلد ہی غائب ہو گئی۔

ماجد شاہین کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ جاؤ اس کو اندر بھیجو اور کہنا کہ
ابو جان بہت بیمار ہیں باہر نہیں آسکتے،" یا اس سے فارم اور رجسٹری کی
مانگ کر لے آؤ، میں ان پر دستخط کر دوں،" افت میرے خدا،" اتنا کہتے کہتے ان
کا دم گھٹنے لگا اور سانس اس قدر تیزی سے چلنے لگا جیسے کوئی لوہار کی دھونکنی ہو۔

چند لمحوں کے بعد شاہین فارم لیکر اندر داخل ہوا اور بولا۔
"ابو، ڈاکیہ نے کہا ہے اس پر دستخط کرا لاؤ تو میں لیا دیدوں ....."
جد نے اٹھنے کے لئے پاس بیٹھی ہوئی بیوی کو اشارہ کیا، انیسہ نے ہزاروں
قت انہیں تکیہ کے سہارے بٹھایا پھر اس نے قلم طلب کیا۔ فارم بچے سنبھالے
ہوئے تھے۔ بیوی اور بہن اس کو سہارا دیئے ہوئے تھیں۔ عجیب منظر تھا۔ یہ
یہ اور محمودہ کی مجبور و یاس زدہ آنکھوں میں غم اور خوشی کے ملے جلے آنسو
ٹپ رہے تھے

انیسہ سوچ رہی تھی، چلو کم از کم اتنے روپوں سے ماجد کا علاج تو
جائے گا ـــ محمودہ بھی ایسی باتوں کی فکر میں تھی ـــ بچے روٹی اور
ان کی سوندھی سوندھی بو محسوس کر رہے تھے جیسے ایک سو روپے اپنے
من میں خوشی کی بہاریں لیکر آیا ہے۔ ماجد نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے

موقع دیں گے ۔ بطور معاوضہ نہیں بطریق نذر ایک صد روپے کی حقیر رقم حاضر کر رہا ہوں ان کی رسید سے اطلاع دیں۔

مخلص

مدیر ماہنامہ تعمیر ادب دہلی ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۵۹ء

منی آرڈر فارم اور رجسٹری چھ تھے دن کانپور پہنچ گئی اور پانچویں روز صبح دس بجے پوسٹ مین دونوں چیزیں لیکر ماجد کے محلہ میں آیا ۔ اختر اور شاہین اس وقت اتفاق سے باہر ہی تھے، پوسٹ مین نے کہا کیا تم دونوں ماجد صاحب کے بیٹے ہو"؟

چھوٹا لڑکا شاہین جلدی سے بول پڑا ۔ جی ہاں کیا آپ کو ان سے کوئی کام ہے ؟

ہاں تمہارے ابو کے نام ایک سو روپے کا منی آرڈر ہے اور ساتھ ہی میں ایک رجسٹری بھی ہے ۔ دونوں لڑکے دوڑتے دوڑے اندر گئے جہاں ان کا باپ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا ۔ اس جگہ لڑکوں کی ماں اور پھوپھی بھی موجود تھیں۔ ادھر ماں نے اختر سے دھیرے سے پوچھا کیا ہے بیٹے"؟

ادھر شاہین باپ کے پاس پہونچکر کہنے لگا " ابو جان اٹھئیے آپ کے نام پیا اور بجلی آئی ہے باہر ڈاکیہ آپ کو بلا رہا ہے" شاہین کی آواز سنتے ہی ماجد نے آنکھیں کھولدیں اس وقت اس پر غشی کی کیفیت نہیں طاری تھی۔

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سید احتشام حسین

صنف انشائیہ اور چند انشائیے — از ڈاکٹر سید محمد حسنین، ناشر ایوانِ اردو، پٹنہ نمبر ۴۔ قیمت چار روپے

ادھر کچھ دنوں سے نثری ادب کی اس صنف کی جانب توجہ کیجا رہی ہے جسے انگریزی میں "لائٹ ایسے" کہا گیا ہے اردو میں اس کے لئے انشائیہ کا لفظ عام ہو رہا ہے۔ گذشتہ سال حیدرآباد کی ایک خاتون سیدہ جعفر نے اور الہ آباد کے ایک طالب علم سید ناصر حسین نقوی نے تقریباً ایک ہی زمانہ میں اس موضوع پر لکھے ہوئے مقالوں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں، یہ مسرت کی بات ہے کہ دوسرے ادیب بھی ادھر متوجہ ہیں۔ اگرچہ واقعی انشائیے بہت کم لکھے جا رہے ہیں، انشائیہ کو محض ہلکا پھلکا، فکاہی یا مزاحیہ مضمون سمجھنا درست نہیں، شگفتگی اس میں ضرور ہوتی ہے لیکن وہ محض طنز و مزاح تک محدود نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر محمد حسنین نے دو تین کو چھوڑ کر باقی جتنے انشائیوں کا انتخاب کیا ہے وہ سب مزاحیہ ہیں۔ مرتب نے اس مجموعہ میں ۲۸ مضامین یکجا کئے ہیں جن میں آزاد، شرر، حسن نظامی سے لیکر موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ صرف طلباء ہی کے لئے نہیں عام ادبی

فارم پر جوں ہی قلم رکھا اس پر کھالسی کا زبردست دورہ پڑ گیا۔ قلم زمین پر گر پڑا۔۔۔ اختر اور شاہین گھبرا گئے۔۔۔ انیسہ اور محمودہ کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں، ماجد کی نگاہوں میں دھند چھا گیا۔ تاریکیوں کا پردہ پڑ گیا۔ چاروں طرف موت کے سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔

ماجد پر کھالسی کا یہ حملہ اتنا شدید ہوا کہ اس نے اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ پھیپھڑے پھول گئے، اس عالم میں خون کی ایک قے آئی جس نے فارم کو رنگین بناتے ہوئے آس پاس کی تمام چیزوں کو لالہ رنگ بنا دیا۔۔۔۔۔ پھر فضا میں سہاگ کی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز بکھر گئی۔۔۔!

نے عالم ارواح کا ایک مشاعرہ ترتیب دیا جو لکھنؤ سے شایع ہوا ـــــ
ابو اللیث صدیقی نے لکھنؤ کا ایک مشاعرہ تیار کیا، گذشتہ سال اظہر علی فاروقی صاحب نے یاد ایام کے نام سے آگرہ کے ایک مشاعرہ کو رد یک کی شکل میں پیش کیا۔ اب ڈاکٹر محمد حسنین کا مرتب کیا ہوا یہ تمثیلی مشاعرہ بھی ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ ایسے مشاعروں کا زیادہ لطف اس کے پیش کئے جانے میں ہے کیونکہ مکالمہ کی شگفتگی اور برجستگی، شعراء کی شبیہ کذائی اور انداز نشست و برخاست، سب کی کامیابی کا دارومدار اسٹیج پر ہے خیال ہے کہ اگر یہ تمثیل قاعدے سے پیش کی جائے تو دیکھنے والوں کو ضرور محظوظ کرے گی۔

انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد } از محمد مسعود جوہر ناشر مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر ۶

قیمت سات روپے

جوہر صاحب م م جوہر کے نام سے کئی مختصر تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ انقلاب روس پر موصوف کی ایک مختصر کتاب پہلے بھی شایع ہو چکی ہے، ان کے مضامین اور کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں سارے روسی مفکروں اور سیاست دانوں میں ٹراٹسکی نے سب سے زیادہ متاثر کیا، یہ بات بحث طلب ہو سکتی ہے کہ ٹراٹسکی کا نقطۂ نظر انقلاب روس کے متعلق کس حد تک صحیح تھا۔ بہر حال اس تاریخ پر بھی اس کے تصورات کی چھاپ

ذوق رکھنے والوں کے لئے بھی دلکشی کا حامل ہے لیکن انتخاب کا دائرہ اور وسیع ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر محمد حسنین نے ابتدا میں ۴۲ صفحوں کا ایک مفید مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں انشائیہ کی خصوصیات سے بحث کی ہے اور مستند انگریزی انشائیہ نگاروں کے اقوال اور خیالات سے بحث کرکے اردو پڑھنے والوں کے لئے چند کارآمد نتائج نکالے ہیں اس سلسلے میں ہمیں بعض الفاظ اور صحت کے متعلق البتہ یہ کہنا ہے زبان میں نئے الفاظ کا اضافہ بری بات نہیں لیکن انھیں غلط نہیں ہونا چاہیے مثال کے طور پر "کہانی" سے "کہانی پن" تو بن سکتا ہے لیکن "کہا نویت" بنا نا کسی حیثیت سے بھی درست نہیں، بہر حال یہ صاف ستھرا اور خوبصورتی سے چھپا ہوا انتخاب مطالعہ کا مستحق ہے۔

عالم برزخ کا ایک مشاعرہ } ناشر ادارہ اردو پٹنہ قیمت ۷۵ نئے پیسے

مولانا محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال اور آب حیات میں جس طرح شعراء کی آمد کا ذکر تمثیلی اور علامتی انداز میں کیا تھا۔ غالباً اسی سے مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنا چراغ روشن کیا اور دلی کی آخری شمع جلائی اس کے بعد سے یہ انداز کافی مقبول ہوا۔ اور متعدد ادیبوں نے ایسے مشاعرے کی محفل سجائی، چند سال پہلے ایک صاحب نے عالم بالا یعنی فردوس میں ایک مشاعرہ منعقد کیا لیکن وہ اتنا طویل تھا کہ غالباً کہیں اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ مولوی مرتضیٰ حسین

ہندوستان کی زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا اور ہر جگہ اپنی علمی و تہذیبی خصوصیات کی روشنی میں ایسا ادبی سرمایہ جمع کر دیا جو قابل قدر ہے چنانچہ میسور کا علاقہ جو لسانی نقطۂ نظر سے کرناٹکی زبان کا علاقہ ہے اردو کا بھی ایک عظیم الشان مرکز رہا ہے جب دکھن میں اردو کا نشو و نما ہوا، اسی زمانہ سے میسور میں بھی اس کا سراغ ملنے لگتا ہے لیکن اس علاقہ میں اس کا ارتقا زیادہ تر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہوا، اب جو علمی تحقیق کا ذوق ترقی کر رہا ہے تو ہر علاقے کے مدفون خزانے باہر آ رہے ہیں۔ چنانچہ میر محمود حسین صاحب نے میسور کے ایک اہم شاعر بانکے نواب محمد حسین علی سلطان قریشی نسیم میسوری کا دیوان تلاش کر کے شائع کر دیا ہے اور اس پر ایک مفید مقدمہ کا اضافہ کیا ہے، نسیم میسوری کا تعلق اس خانوادہ سے تھا جس نے ٹیپو سلطان کو جنم دیا، نسیم بھی ایک دلچسپ اور رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۸ء میں انتقال کر گئے، ان کے دیوان کے مطالعہ سے بھی ان کی زندگی کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے، غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف بھی ان کے زیر مشق رہے اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ جاذبیت ہے یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ نسیم کا مقابلہ شمالی یا جنوبی ہند کے بڑے بڑے شعرا سے کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے کلام کی پختگی اور رنگینی اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے، مرتب نے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے یہ مجموعہ بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے وہ ہمارے شکریے

نظر آتی ہے سوا چھ سو صفحات میں جوہر صاحب نے انقلاب روس سے لیکر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک کے واقعات جو روس کی سیاسی تاریخ سے متعلق تھے بڑے دلکش انداز میں بیان کئے ہیں اگرچہ روس میں جو انقلاب ۱۹۱۷ء میں ہوا ... وہ محض ایک سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس نے زندگی کا ایک نیا تصور ہی پیدا کیا جس سے وہاں کی تعلیمی، تہذیبی، ادبی علمی اور فکری زندگی نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ اور دنیا کے ہر گوشہ میں اس کی آواز بازگشت سنائی دی لیکن مصنف نے اپنے خیالات کو محض سیاسی مسائل کی بحث تک محدود رکھا ہے یہ بھی قابل قدر ہے کیونکہ اردو زبان کا دامن ابھی علمی اور تاریخی تصانیف سے کم و بیش خالی ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ سارے افادی علوم کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ کتاب جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے دو حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں انقلاب کی تاریخ ہے اور دوسرے حصہ میں اس کی روشنی میں واقعات مابعد کے جزر و مد کو پیش کیا گیا ہے، مصنف نے مواد کی فراہمی میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے لیکن ایسی علمی کتاب میں حوالہ جات کا نہ ہونا کھٹکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آخر میں حوالہ کی کتابوں کی ایک فہرست ہی نہیں بلکہ ایک اشاریہ بھی ہوتا لیکن فہرست ضروری تھی، اردو داں کو جوہر صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے معاصرانہ تاریخ کے ایک بہت ہی اہم حصہ کو عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کلیات نسیم میسوری مرتبہ میر محمود حسین لکچرر فارسی مہاراجہ کالج میسور ناشر سنٹرل پبلشنگ ہاؤس بنگلور۔ قیمت مجلد [illegible]

ایک دوسرے سے مختلف ہیں اگر ایک طرف شاکر نائطی سے پختہ کار تو دوسری طرف کاوش بدری، دانش فرازی اور حسرت سہروردی کے سے نوجوان شعراء ہیں جو اپنے انداز سے زندگی کی کشمکش کو اشعار میں ڈھال رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ مرکز ادب ایسے اور مجموعے شائع کرے گا تاکہ جنوبی ہند کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلے۔

کے مستحق ہیں کہ انھوں نے میسور کے ایک قدیم شاعر سے ہمیں روشناس کرایا

رنگ برنگ (ریاست مدراس کے نمائندہ شعراء کی غزلوں کا انتخاب) ناشر مرکز ادب مدراس قیمت ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

مدراس بھی اردو کا ایک قدیم مرکز رہ چکا ہے لیکن تہذیبی، سیاسی اور لسانی وجوہ سے اردو کا نشو و نما وہاں بھی اس طرح نہیں ہو سکا جیسا کہ شمالی ہندوستان میں ہوا تھا، تاہم یہ بڑی قابل غور بات ہے کہ کوئی زمانہ شاعروں اور ادیبوں سے خالی نہیں رہا ہے اور ہر دور میں وہاں بھی شعراء اور ادبار سرگرم عمل رہے ہیں چونکہ وہاں سے اردو کے اچھے اخبار اور رسالے شائع نہیں ہو سکے اس لئے اکثر ایسا بھی ہوا کہ جنوبی ہند کے شعراء کے کلام منظر اشاعت پر نہ آسکے اس میں تھوڑی بہت شمال و جنوب کی عصبیت کا بھی ہاتھ رہا ہے لیکن اب حالات بدلے ہیں اور خود جنوب میں ادبی مرکز قائم ہو رہے ہیں چنانچہ یہ مختصر مجموعہ اس کا ثبوت ہے کہ مدراس کے شعراء کا جذبہ خود شناسی بھی جاگ اٹھا ہے، وہاں کے ادیبوں نے ایک مرکز ادب قائم کیا ہے۔ اس کی یہ پہلی پیش کش ہے مجلس ادارت میں صرف حوصلہ مند نوجوان شاعروں اور ادیبوں کے نام نہیں ہیں بلکہ بزرگ علماء بھی شامل ہیں، اس لئے ہمیں یقین ہے کہ یہ ادارہ کام کرے گا اور اعلیٰ پائے کی چیزیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوں گی۔

رنگ برنگ میں مدراس کے تیرہ شعراء کی منتخب غزلیں یکجا کی گئی ہیں، یہ سب موجودہ دور ہی کے شاعر ہیں اگرچہ وہ اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے

ادبی خبریں

رضی احمد

بیٹن روج :- لوزیانہ اسٹیٹ یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر نے پودوں کا بیج محفوظ رکھنے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا ہے اس تحقیقی کام میں ان کی امداد ایک ہندوستانی ماہر سائنس داں مسٹر ڈی' این مادھو راؤ کر رہا ہے۔

اس دریافت سے پودوں کی پیداوار وسیع پیمانہ پر ہوسکتی ہے اور تحقیق کرنے والوں میں اس ذریعے کے باہمی تبادلے سے مزید تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔

نیویارک :- امریکہ کی ایشیائی سوسائٹی کی ٹیگور کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصانیف کے اختصار و انتخاب کی اشاعت اور ان کی مصوری کے شاہکاروں کی امریکہ میں نمائش کا اہتمام کیا جائے۔

۱۹۶۱ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی سوویں سالگرہ کی تقریب منانے کے سلسلے میں یہ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد ۱۷ ر نومبر کو ضلع کے دھر کے گاؤں میں لالہ اچھت رائے میموریل کا سنگ بنیاد رکھیں گے جس کا گاؤں آنجہانی رائے کی جائے پیدائش ہے۔ اس موقع پر صدر جمہوریہ کو ۵ لاکھ کی تھیلی پیش کی جائے گی۔

غزل

اختر بستوی

رہبروں کی کج کلاہی کا جواب آ ہی گیا
انقلاب آئے نہ آئے اضطراب آ ہی گیا

آدمی کو اس کھلونے کا تھا بچپن ہی سے شوق
آج اس کی دسترس میں ماہتاب آ ہی گیا

اس سے بے پروا کہ میں ہوں ان دنوں غم کا شکار
مستیوں کے جام چھلکاتا شباب آ ہی گیا

جھلملائے پھر مرے خوابوں میں یادوں کے چراغ
ذہن میں پھر عکسِ چشمِ نیم خواب آ ہی گیا

بے رخی سے سن رہا تھا وصل کے قصے مگر!
وہ جو شرمائے تو مجھ کو بھی حجاب آ ہی گیا

حسن کو بھی جلوہ آرائی کی خواہش تھی مگر
خوفِ رسوائی سے چہرے پر نقاب آ ہی گیا

شورشِ طوفانِ غم اختر کچھ اتنی بڑھ گئی
زندگی کو لذتوں سے اجتناب آ ہی گیا

کے استاد اور ہر طرح کی تحریر کے ماہر ہیں نیز خطاطی کی نمائش میں سونے کا تمغہ پا چکے ہیں۔

پاکستان کے نوجوان اردو شاعر حمایت علی کو ان کے نئے مجموعے کلام "آگ اور پھول" پر پریسیڈنٹ ایوب خاں نے ایک سو پچاس روپے انعام دیا۔ اس مجموعہ کی چند نظموں کا ترجمہ انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

جارجیہ کے بچوں کے ادب کے اشاعت گھر نے ہندوستانی ادیب کرشن چندر کا ناول "الٹا درخت" جارجیائی زبان میں شایع کیا ہے اس کا ترجمہ ایک نوجوان جارجیائی ادیب ماری لک نادرے نے کیا ہے ناول اشاعت کے فوراً ہی بعد فروخت ہو گیا۔

پروفیسر سید بشیر الدین صاحب لائبریرین مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یوروپی ممالک کے چار ماہ کے دورے کے بعد علی گڈھ واپس آ گئے۔ آپ کا یورپ کا یہ تیسرا دورہ تھا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ حکومت امریکہ کی دعوت پر خصوصی مہمان کی حیثیت سے امریکہ گئے تھے اور وہاں کے مختلف کتب خانوں ان کے جدید تقاضوں، نئے رجحانات اور ضبط و نظم کا جائزہ لیا تھا۔ اس وقت فرانس جرمنی، انگلستان، ہالینڈ، سوئٹزر لینڈ، اٹلی اور

صدر پاکستان جنرل ایوب خاں نے مارشل لا کے تحت ایک حکم کے ذریعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی مجلس منتظمہ کو برطرف کر دیا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا انتظامی بورڈ بنا دیا ہے۔

حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انجمن کی جائداد جس میں اس کا چھاپہ خانہ ہے اور اردو کالج شامل نہیں نئے بورڈ کے انتظام دے دی جائے۔

اس نئے بورڈ کے چیرمین بابائے اردو مولوی عبدالحق ہوں گے۔

یہ بورڈ کراچی میں مارشل لا کے ناظم کی نگرانی میں کام کرے گا۔

انجمن کی مجلس منتظمہ کو برطرف کرنے پر زور مولوی عبدالحق نے دیا تھا کہا جاتا ہے کہ ۴ر اپریل کو انھوں نے صدر ایوب خاں کو خط لکھا تھا کہ انجمن کے معاملات اور اس کے اداروں میں مکمل افراتفری کا دور دورہ ہے

اردو ہفتہ وار "دیش" کے ایڈیٹر مسٹر راجہ رام صابر کا دوشنبہ کے روز انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۷ سال تھی اور ان کا ہفت روزہ بند ہو چکا تھا مسٹر صابر ایک اچھے صحافی ہونے کے علاوہ پرانے کانگریسی بھی تھے۔ نمک ستیہ گرہ تحریک میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا تھا۔

فن خطاطی کے ماہر شیخ ممتاز حسین جونپوری نے جو کشمیر کی آرٹ اینڈ کلچر اکاڈمی کی دعوت پر فن خطاطی کی تعلیم دینے لکھنؤ سے سرینگر دو مہینے قبل گئے تھے، کشمیر میں چھ خوش نویس تیار کر دیئے ہیں۔ شیخ صاحب فن خطاطی

ایم آر عبدالواحد صاحب نے ادارۂ منزل کا افتتاح فرمایا۔ اس ادارہ نے قطعات کا مجموعہ "رگِ سنگ" شائع کیا ہے۔

سدی پیٹھ میں دوسری جماعت ہندوستانی کا افتتاح کرتے ہوئے راجہ شام کرن ڈپٹی کلکٹر سدی پیٹھ نے کہا کہ اردو انتہائی شیریں زبان ہے جس کا کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی اور اردو کی ترقی کے لئے کام کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ جلسہ میں مددگار مہتمم پولس شری کے ایس راما راؤ، منصف مجسٹریٹ شری ایس پی راما راؤ، تحصیلدار سدی پیٹھ جناب مہدی علی خاں صاحب، نواب انور ادیب (کنوینر انجمن ترقی اردو میدک) اور جناب مورتی صاحب بھی موجود تھے۔

اردو کے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار چودھری محمد علی ردولوی کا انتقال ۱ار ستمبر کو ان کے مکان قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں ہو گیا۔

چودھری صاحب چار پانچ سال پہلے فالج کے حملے کا شکار ہو چکے تھے جب سے وہ نقل و حرکت سے معذور تھے۔

لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں متعدد ممبروں نے ریاستی حکومتوں کی طرف سے لسانی اقلیتوں کو دی گئی تحفظات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں بے اطمینانی ظاہر کی۔

روس کی حکومتوں نے آپ کو کتب خانے میوزیم اور آرٹ گیلریاں دکھانے کے لئے مدعو کیا تھا، اس دورہ میں آپ نے ۱۴ کتب خانے اور ۲۰ آرٹ گیلریاں جن میں دنیا کے مشہور و مایہ ناز مصوروں اور سنگ تراشوں کے فن کاری کے شاہکار نمونے ہیں۔ دیکھے۔

آپ نے اس دورہ میں ایک اور مفید اور کار آمد خدمت انجام دی ہے اور وہ ہے علمی رابطہ اور رشتہ جو آپ نے اپنی یونیورسٹی یورپ کی مشہور علمی درس گاہوں کے مابین قائم کیا ہے۔

مجلس ادب رجسٹرڈ کے صدر ڈاکٹر کے ایس بیدی کو دلی یونیورسٹی کی طرف سے ان کے تحقیقی مقالے "اردو اور پنجابی کا لسانیاتی رشتہ" پر پی، ایچ، ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری ملی ہے، ڈاکٹر موصوف خالصہ کالج دہلی میں اردو کے استاد ہیں۔

انجمن ترقی ادب لکھنؤ نے طے کیا ہے کہ اس کا دوسرا تحریری مقابلہ بچوں اور بچیوں کی لکھی ہوئی کہانیوں کا ہوگا جس میں بچوں اور بچیوں کو انجمن کی طرف سے خوبصورت اور نصیحت آمیز کتابیں انعام دی جائیں گی۔ سب کہانیاں مع فیس انجمن کے دفتر واقع گوتم بدھ مارگ لکھنؤ کے نام آ جانا چاہیے

کرسینٹ سوسائٹی مدراس میں سید عبدالوہاب صاحب بخاری کی صدارت

ہمت افزائی کے لئے کہا گیا ہے۔

مسٹر عبد اللطیف (کانگریس) نے کہا کہ اگر پنجاب کے حالات ایسے ہی رہے جیسے اس وقت ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ "پنجابستان" کے قیام کی شکل میں ظاہر ہوگا، انھوں نے ہندی کے پرجوش حامیوں سے اپیل کی کہ وہ زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو، کا رویہ اردو کے لیے اختیار کریں۔

راجیہ سبھا میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (کمیونسٹ) بیگم انیس قدوائی (کانگریس) اور مسٹر فرید الحق انصاری (پرجا سوشلسٹ) نے اردو کو اس کا جائز حق دینے کا مطالبہ کیا۔

مقامی کمیونسٹ پارٹی نے کارپوریشن الیکشن کے سلسلے میں چھپنے والے بیلٹ پیپر پر سخت احتجاج الیکشن افیسر اور یوپی حکومت کو لکھ کر بھیجا ہے تحریری احتجاج میں کہا گیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے امیدواروں کے ناموں کے آگے بیلٹ پیپر میں بجائے کمیونسٹ کا لفظ لکھنے کے اس کا ترجمہ "ساموادی" لکھ دیا گیا ہے جس سے ایک طرف ووٹروں میں غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہے دوسرے یہ کہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وہ برتاؤ ہے جو دوسری سیاسی جماعتوں کے لئے مناسب نہیں سمجھا گیا، احتجاج میں کہا گیا ہے کہ جب آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی تسلیم شدہ جماعت ہے تو اس کا ترجمہ کرنے کی کیا حاجت پیش آگئی تھی اور اگر ہندی میں ترجمہ ہی ضروری تھا تو کانگریس

ممبروں نے یہ بے اطمینانی دونوں ایوانوں میں لسانی اقلیتی کمشنر کی پہلی رپورٹ پر مباحثہ کے دوران ظاہر کی۔

راجیہ سبھا میں ایک ممبر نے اردو کو اتر پردیش اور دہلی میں علاقائی زبان کا درجہ دینے اور دوسری ریاستوں میں اس کی ہمت افزائی کا مطالبہ کیا جبکہ اتر پردیش کے ایک ممبر عبداللطیف نے لوک سبھا میں اردو کی ایک یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا۔

مباحثہ کا جواب دیتے ہوئے وزارت داخلہ کے وزیر شری بی این دتار نے کہا کہ کمیشن کا مقصد جہاں تک ہو سکے لسانی اقلیتوں کو مطمئن رکھنا لیکن لسانی اقلیتوں کو ہمیشہ یہ نہیں سوچنا ہے کہ وہ ایک الگ فرقہ ہیں۔ اور ان کو ترقی کے لئے ہمیشہ تحفظات ملتے رہیں گے۔

شری دتار نے ان لوگوں کے اعتراضات کا جنہوں نے رپورٹ کو مایوس کن قرار دیا تھا جواب دیتے ہوئے کہا کہ بعض ریاستوں سے جوابات موصول نہ ہونے کی وجہ سے کمیشن یہ نہیں بتا سکا ہے کہ لسانی اقلیتوں کو دی گئی یقین دہانیوں کے سلسلے میں مختلف ریاستوں نے کیا اقدامات کئے ہیں۔

انہوں نے اردو کے سلسلے میں ممبران کو یقین دلایا کہ جہاں بھی کافی تعداد میں اردو بولنے والے موجود ہوں گے اس کی ہر ممکن ہمت افزائی کی جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ دہلی کے چیف کمشنر سے دہلی میں اردو کی مزید

طلباء سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر برکا نے کہا کہ ہندوستان اور مراکش کے لوگوں نے گذشتہ ایام میں آزادی کے حصول کے لئے بڑی بڑی سختیاں جھیلی ہیں اور آزادی کے بعد سے دونوں ملکوں کو قوم کی تعمیرِ نو کا کارِ عظیم درپیش ہے۔

لکھنؤ ۲۴ر اکتوبر۔ یوتھ کانگریس لکھنؤ یونی ورسٹی نے اردو مضمون نگاری کا ایک مقابلہ کرانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ادیب اور امنِ عالم

۲۔ ہندوستانی تہذیب کی بنیادی یکرنگی۔

۳۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل

اس مقابلہ میں یونی ورسٹی و دیگر کالجوں کے طلباء ہی حصہ لے سکیں گے ہر طالب علم مندرجہ بالا عنوانات میں سے کسی ایک پر مضمون بھیج سکتا ہے جس کی آخری تاریخ ۱۶ر نومبر ہے۔

بارہ بنکی ۲۴ر اکتوبر۔ مرحوم رفیع صاحب قدوائی کی پانچویں برسی آج ان کے وطن مسولی میں ان کے مزار پر منائی گئی۔

صبح سویرے قرآن خوانی اور فاتحہ ہوا اور بڑی تعداد میں غرباء کو کھانا کھلایا گیا۔

ریاستی وزیر زراعت مسٹر موہن لال گوتم مرکزی وزارت غذا کے سکریٹری مسٹر ڈلبلے اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر مسٹر صدیق حسن نے اس فاتحہ خوانی میں شرکت کی۔

انسلٹ کا ترجمہ کیوں نہیں کیا گیا۔

نئی دہلی ۲۴ اکتوبر۔ وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت نے آج شام یہاں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا

یہ میڈیکل کالج ۳۰ ایکڑ آراضی پر بنایا جا رہا ہے جہاں پہلے ڈسٹرکٹ جیل تھا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پنڈت پنت نے کہا کہ یہاں جیل کی بھیانک دیواریں منہدم کر دی گئی ہیں۔ اور جلد ہی اس جگہ پر چمکتے ہوئے روشن برآمدے ہوں جہاں روشنی سائنس اور علم کی کرنیں پھوٹیں گی۔

یہ کالج پہلے اروِن ہاسپٹل کے ایک تین منزلہ بلاک میں سے اور یکم اگست سے قائم ہوا تھا۔

نئی عمارت دوسرے منصوبے کے خاتمے تک لگ بھگ ایک کروڑ روپے کے صرفے سے مکمل ہو جائے گی۔

نئی دہلی ۲۴ اکتوبر۔ مراکش کی قومی مشاورتی مجلس کے سابق صدر مسٹر مہدی بن برکا نے جمعرات کی شام کو جامعہ ملیہ کا معائنہ کیا، موصوف آجکل ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔

جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر ایم مجیب نے ان کو پرائمری سکول، نمائش اور دیگر شعبہ جات کا دورہ کرایا۔

اور روحانی عالم کو جوڑنے والی ایک کڑی ہے۔

انھوں نے کہا کہ سنگیت کے مادی پہلو سے تو سبھی واقف ہیں لیکن بلند پایہ فن کار اور فن کے جاننے والے اس کے روحانی پہلو سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ ۲۴ اکتوبر۔ ریاستی سائنسی تحقیق کمیٹی نے عام طبعات میں بہترین ریسرچ اسکالر کو ایک ہزار نقد اور ایک طلائی تمغہ کی پیش کش ہے۔ کمیٹی نے اس انعام کی پیش کش افادی علوم میں تحقیق کی ہمت افزائی کے لئے کی ہے۔ تاکہ یہ تحقیق نوع انسان کی خدمت کے لئے بروئے کار لائی جا سکے۔

نئی دہلی ۲۵ اکتوبر۔ دستکاریوں کی ترقی کے بھارتی کارپوریشن نے دستکاری کی اشیاء برآمد کرنے والوں کو قرضہ دینے کی اسکیم رائج کی ہے یہ قرضے برآمدی مال کے لئے پکی فرمائشوں کی ضمانت پر دیئے جائیں گے

کارپوریشن نے تجویز کیا ہے کہ چار علاقائی سنٹر ہندوستان میں اور دیگر ملکوں میں قائم کئے جائیں، دہلی میں کارپوریشن کے صدر دفتر میں نمونوں کی نمائش کا ایک مرکز کھولا جائے گا۔ آج کل ڈیزائن کی ترقی کے سنٹر آل انڈیا ہنڈی کرافٹس بورڈ کے ماتحت کام کر رہے ہیں اب ان سنٹروں کو کارپوریشن کی تحویل میں دیدیا جائیگا۔

گورکھپور۔ ۲۴ر اکتوبر۔ سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے ضلع میں ایک دستخطی چلائی جارہی ہے جس میں دستخط کنندگان نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ سرکاری دفتروں میں انگریزی کا استعمال فوراً بند کر دیا جائے، نیز یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہندی قرار دی جائے اور انگریزی کی لازمی تعلیم کو ختم کر دیا جائے۔

میرٹھ۔ ۲۴ر اکتوبر۔ مقامی شہریوں کی طرف سے آج ایک جلسۂ عام میں پنڈت جواہر لال نہرو کو پانچ ہزار کی تھیلی پیش کی گئی۔ تالیوں کی گونج میں پنڈت نہرو نے کہا کہ وہ اس رقم کو مغربی بنگال کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے بھیج دیں گے۔

نئی دہلی۔ ۲۵ر اکتوبر۔ دسمبر کے تیسرے ہفتہ میں ہندی اردو اور پنجابی کے مشاعرے ہو رہے ہیں جن میں سرکاری ملازمین حصّہ لیں گے۔ اس مقابلے کا انتظام وزارت داخلہ کے عملہ کی بہبودی کے شعبہ کی طرف سے کیا جارہا ہے اور تمام وزارتوں میں کام کرنے والے ملازمین اس مقابلے میں شریک ہو سکتے ہیں، مقابلے میں جن ملازمین کو پہلے تین مقامات حاصل ہوں گے انھیں انعام دیا جائے گا۔

نئی دہلی ۲۵ر اکتوبر۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کل شام کو یہاں آکاش وانی سنگیت سمیلن کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سنگیت ہماری

واشنگٹن ہاؤس جہاں ابراہیم لنکن کا انتقال ہوا تھا اب پبلک کے کھول دیا گیا ہے، اسے قریب قریب اسی حالت میں رکھا گیا ہے جس حالت میں وہ لنکن کے زمانہ میں تھا۔

جرمنی کا مشہور نقاش جو ۱۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو راڈسے برگ میں پیدا ہوا تھا، اس کے ڈرائنگ زیادہ تر روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں وہ جیسا دیکھتا تھا ویسے ہی اسکیچ بنا دیتا تھا ۱۹۲۴ء میں اسے پروفیسر کے خطاب سے نوازا گیا اس کے اسکیچوں اور تصویروں کی کتاب حال میں (Zille seen Milljoh) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کارنامہ کی بدولت پروفیسر ہینرخ زلے کا نام ہمیشہ دنیا کے زبان پر رہے گا۔

صدر مملکت جنرل ایوب خاں نے مسٹر حمایت علی شاعر کو ان کی کتاب "آگ میں پھول" پر ڈیڑھ سو روپیہ انعام عطا فرمایا ہے

حکومت ہند نے دار المصنفین کو ایک سال کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ کی امداد دی تاکہ وہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تمدنی اور کلچرل تاریخ مرتب کرے اسی سلسلے میں دو کتابیں زیر تالیف ہیں: "ہندوستان کے وسطیٰ کا فوجی نظام" اور "ہندوستان عربوں کی نظر میں" یہ کتابیں اپریل تک تیار ہو جائیں گی۔

۱۸۱	گلدستۂ فارسی اول و دوم		۱/۵۶
۱۸۷	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید		۰/۳۷
۱۸۸	گلہائے ادب	عبد الاحد خان خلیل	۲/۰
۱۸۹	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰
	(ل)		
۱۹۰	لوائح جامی مع مقدمہ	عبد الاحد خان خلیل	۱/۲۵
۱۹۱	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۹/۰
۱۹۲	لب بام	عادل رشید	۵/۰
۱۹۳	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۲/۰
	(م)		
۱۹۴	مضامین فرحت (حصہ اول)	مرزا فرحت اللہ بیگ	۲/۷۵
۱۹۵	مضامین فرحت (حصہ دوم)	" "	۳/۰
۱۹۶	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۲/۰
۱۹۷	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۳/۵۰
۱۹۸	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۶/۰
۱۹۹	مجبور (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۰۰	مرزا رسوا کے تنقیدی	ڈاکٹر محمد حسن	۳/۵۰
۲۰۱	مضامین جدیدہ	محمد ہادی	۱/۲۵
۲۰۲	مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۰
۲۰۳	مطالعۂ شبلی	ناظر کاکوری، شجاعت علی سندیلوی	۴/۰
۲۰۴	مطائبات شبلی	جالب مظاہری	۲/۵۰

اسٹاک ہام۔ ۲۶ اکتوبر۔ چیکوسلاویکیہ کے ایک سائنسداں کو کیمسٹری
یں ۱۹۵۹ء کا نوبل پرائز دیا گیا ہے۔ فزکس کا انعام دو امریکی سائنسدانوں
یں تقسیم کیا گیا ہے۔
کیمسٹری کا انعام چیکوسلاویکیہ کے سائنسداں پروفیسر جیسیروسلو ہائروسکی
ملا ہے دوسرا انعام پانے والوں کے نام ڈاکٹر امیلیو سیگری اور
اکٹر چیمبرلین ہیں۔

لندن ۲۶ اکتوبر۔ ایک اطلاع مظہر ہے کہ لٹن (بیڈفورڈ شائر) کے
ئبریرین مسٹر فرینک گارڈنر یونیسکو کی سرپرستی میں ایشیا کے تین ماہ کے دورہ
برطانیہ سے روانہ ہو چکے ہیں موصوف ہندوستان، سیلون، پاکستان اور
ا میں لائبریری سروس کی بہتری سے متعلق صلاح و مشورہ دیں گے، وہ
۱۵ تا ۲۰ نومبر کلکتہ، ۲۰ نومبر تا ۲۰ دسمبر مدراس اور یکم تا ۱۰ جنوری دلی میں
یام کریں گے۔
مسٹر گارڈنر ۱۹۵۱ء میں بھی ہندوستان آئے تھے اس بار انھوں نے
لک لائبریری کی تنظیم سے متعلق یونیسکو کی جانب سے حکومت ہند
و صلاح و مشورہ دیا تھا ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ایشیا میں لائبریریوں کی
نشو و نما سے متعلق دلی میں منعقد کئے گئے ایک بین اقوامی سیمینار کے نگرانی
کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔

ڈھاکہ۔ مسٹر حنیف آدم جی نے بنگال اردو ڈکشنری کے لئے ۵ ہزار کی رقم عطا کی ہے اس ڈکشنری میں ۶۰ ہزار اردو الفاظ ہیں جن کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا ہے، ڈکشنری کا مسودہ فلسکیپ سائز کے ۱۸۰۰ صفحات پر حاوی ہے، اس ڈکشنری میں قانون، ریاضی، سائنس، فلسفہ، فقہ، اسلامی وغیرہ کی اصطلاحات بھی آگئی ہیں ہر اردو لفظ کا صحیح تلفظ بھی دیا گیا ہے اس ڈکشنری کے مولف (مولوی ابو زید محفوظ الباری صدیقی) چھ زبانوں کے ماہر ہیں۔ اور آٹھ سال سے اس کام میں مصروف ہیں۔

آسٹریلیا کی حکومت نے شمالی بورنیو کے قدیم باشندوں کی زبان دکدزان کی پہلی ڈکشنری شائع کی ہے یہ کتاب آسٹریلیا کی طرف سے کولمبو پلان کے تحفہ کے طور پر شمالی بورنیو کو پیش کی جائے گی۔

اس ڈکشنری کو ایک ولندیزی پادری فادر اے اینٹونی سن نے تیار کیا ہے۔

گورکھپور۔ یہاں کی مقامی کچھ عورتیں کتب فروشوں اور رسالے فروخت کرنے والے اسٹالوں پر گئیں اور وہاں جس کتاب، رسالے یا کیلنڈر پر انھیں عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر نظر آئی اسے لے کر آگ میں جھونک دیا۔

۱۴ر اکتوبر کو بند کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر پی۔ ایس۔ دیش مکھ مرکزی وزیر زراعت اس کی رسم افتتاح فرمائیں گے۔

اس وقت چڑیا گھر میں ۵۲۴ پرندے اور جانور ہیں۔

نئی دہلی ۲۶ر اکتوبر۔ سفارتی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اسرائیل ہندوستان کے ساتھ سفارتی تعلق قائم کرنے کے لئے بہت دباؤ ڈال رہا ہے۔ سفارتی ذرائع کا کہنا ہے کہ ہندوستان سے اسرائیل کے سفارتی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اسرائیل اپنے کو افریشیائی ملکوں سے الگ سمجھتا ہے، اسی وجہ سے اسرائیل نے برما کے بعد اب ہندوستان سے سفیروں کے تبادلہ پر زور دیا۔

ایک اطلاع کے مطابق ہندوستان اس درخواست پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں جب تک کہ عرب ممالک سے اسرائیل کے تعلقات کشیدہ ہیں، یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ سفارتی تعلقات قائم کرنے سے کوئی سود مند مقصد حاصل نہ ہوگا، دوسرے یہ کہ اگر ہندوستان نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کئے تو عرب ممالک سے ہند کے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔

نینی تال ۲۶ر اکتوبر۔ آج یہاں تین روزہ سائنس سمپوزیم شروع ہوا جس کا افتتاح آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر لفٹنٹ کرنل کے پی بھٹناگر نے کیا۔ سمپوزیم میں مختلف قومی تجربہ گاہوں اور یونیورسٹیوں کے تقریباً چالیس نمایاں سائنس داں شرکت کر رہے ہیں۔

لندن ۲۶ اکتوبر۔ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ آنے والے مہینوں میں برطانیہ کے متعدد مزدور یونین لیڈر ہندوستان کا دورہ کریں گے، اور ہندوستانی مزدور لیڈروں اور ٹریڈ یونینوں کے ساتھ میل جول بڑھائیں گے

اس پروگرام کا آغاز لندن کے چھاپہ خانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی انجمن کے سکریٹری مسٹر رابرٹ ولس کے دورہ سے ہوگا۔ موصوف ۵ تا ۲۰ دسمبر ہندوستان کا دورہ کریں گے، وہ گذشتہ سال برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگریس کے چیرمین تھے۔

برطانیہ کی سب سے بڑی ٹریڈ یونین یعنی ٹرانسپورٹ و جنرل ورکرز یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر فرینک کزنز ماہ جنوری میں ہندوستان آئیں گے اور کچھ دیر بعد آئرن و اسٹیل ٹریڈ یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر ہیری ڈگلس ہندوستان کا دورہ اختیار کریں گے، برطانی مزدور سبھائی لیڈروں کا یہ پروگرام ٹریڈ یونین کانگریس کے نائب سکریٹری مسٹر وکٹر فیڈر کے ہندوستانی دورہ کا نتیجہ ہے جو اس سال کر چکے ہیں۔ ان کی رپورٹ پر ٹریڈ یونین کانگریس نے گذشتہ ماہ کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ برطانی مزدور سبھائی لیڈروں کو ہندوستان بھیجا جائے۔

نئی دہلی ۲۶ اکتوبر۔ سندر نگر میں واقع چڑیا گھر یکم نومبر سے ۲۵ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار کردہ نئی عمارت میں کھلے گی۔

یاد رہے یہ چڑیا گھر جانوروں اور پرندوں کو نئی جگہ پر منتقل کرنے کیلئے

صدر ایوب نے فیلڈ مارشل کا عہدہ قبول کر لیا

کراچی، ۲۸ اکتوبر۔ حکومت پاکستان نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ صدر ایوب خان نے فیلڈ مارشل کا عہدہ قبول کر لیا ہے۔ صدر ایوب خان کو اس عہدے کے دیئے جانے کا فیصلہ پاکستانی کابینہ نے پاکستان کی پہلی فوجی حکومت کے قیام کی سالگرہ کے دن ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو کیا تھا۔ کابینہ کے اس جلسے کی صدارت وزیر بحالیات جنرل اعظم خان نے کی تھی۔ کابینہ نے ایک رزولیوشن میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ صدر ایوب خان سے درخواست کی جائے کہ وہ پاکستان کے لئے اپنی بیش بہا خدمات کے سلسلہ میں یہ عہدہ قبول کریں۔ یہ درخواست دو شنبہ کی شام کو راولپنڈی میں صدر پاکستان سے کی گئی ہے انھوں نے قبول کر لیا۔

آغا خان کا زیر تعمیر محل ڈھائی لاکھ ڈالر لاگت آئے گی

جنیوا، ۲۸ اکتوبر۔ آغا خان اپنی والدہ شہزادی جون کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ کے شہر گستاد پہنچ گئے۔ وہ یہاں سردیوں کے لئے ایک مکان بنوا رہے ہیں۔ اس مکان میں ۱۰ غسل خانے ہوں گے اور اس پر ڈھائی لاکھ پچاس ہزار ڈالر لاگت آئے گی۔ اسی زیر تعمیر مکان کو دیکھنے وہ یہاں پہنچے ہیں۔

شیخ عبداللہ کی پیروی کے لئے برطانوی وکیل کا تقرر

لندن، ۲۸ اکتوبر۔ یہاں کے وکیلوں کی انجمن نے بیرسٹر پارلیمنٹ اور بیرسٹر مسٹر ڈنگلے فوٹ کو کشمیر کے مقدمہ سازش میں پیروی کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہونے کی اجازت دی ہے۔ مسٹر فوٹ جو جلد ہی کشمیر روانہ ہو رہے ہیں شیخ محمد عبداللہ کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔

[illegible]

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کرنل بھٹناگر نے زور دیا کہ ملک میں سائنس کی تعلیم کا معیار بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے انھوں نے کہا کہ بغیر سائنس اور ٹیکنولوجی کی امداد کے ہم کوئی ترقی ہی نہیں کر سکتے۔

لکھنؤ ۲۶ اکتوبر۔ اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں جوتوں کی چک بندی سے خوشحالی کے دور کا آغاز ہوا ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ایسے مواضعات میں جہاں چک بندی ہو چکی ہے کھاتہ داروں نے بڑی تعداد میں نئے کنویں تعمیر کئے ہیں اور وہاں بہت زیادہ سڑکیں تعمیر ہو گئیں ہیں۔

اتر پردیش کے ۹۳۹۵ مواضعات میں جہاں چک بندی اسکیم کے تحت چک منتقل ہو چکے ہیں کسانوں نے گذشتہ اگست کے آخر تک ۱۷۰۰ پکے اور ۴۰۰۰ کچے کنوئیں تعمیر کئے ہیں اور ۳۰۰ ٹیوب ویل لگائے ہیں مواضعات کے درمیان سڑکوں کی لمبائی ۲۵۰۰ میل سے زیادہ ہو گئی ہے اور کھاد گڑھوں کی تعداد بڑھ کر ۳۸۵۵۱۳ ہو گئی ہے اس کے علاوہ کھاتہ داروں نے تقریباً ۱۵۰ نئے ٹریکٹر خریدے ہیں۔

چک بندی اسکیم کے دائرہ اثر میں اس وقت ۱۲۷ اضلاع کے ۵۸۳۰۵۵۹ ایکڑ زمین زیر کاشت رقبہ پر مشتمل ۹۴۴۱ مواضعات ہیں جکی تکمیل ہو چکی ہے اور ۴۴۲۹۲ مواضعات میں چک بندی ہو گئی ہے۔

ماہنامہ

جن پر ان کے ۲۰ ساتھیوں سمیت حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں مقدمہ چل رہا ہے۔
وکیلوں کی انجمن کے ایک ترجمان نے بتایا کہ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہے کہ مقدمہ کب شروع ہوگا پہلے یہ مقدمہ پچھلے سال دسمبر میں پیش ہونے والا تھا بعد میں شیخ عبداللہ کی اس درخواست پر ملتوی ہو گیا کہ ان کا مقدمہ دوسری عدالت میں منتقل کر دیا جائے۔

سیر و سیاحت کے اخراجات پر سے پابندیاں ختم

لندن، ۱۰ر اکتوبر۔ حکومت برطانیہ کے ایک اہم اعلان میں بتایا گیا ہے کہ ۱۰ر اکتوبر کے بعد جو برطانوی باشندہ ملک سے باہر جانا چاہے وہ سال میں ۲۵۰ پونڈ مالیت کی غیر ملکی کرنسی بلا اجازت خرچ کر سکے گا اگر اس سے زیادہ رقم کی ضرورت ہو تو اسے بینک آف انگلینڈ کی اجازت لینا پڑے گی۔ اس پابندی کا مقصد سیر و سیاحت کے اخراجات کو کم کرنا نہیں بلکہ احتیاط کی پیش بندی کرنا ہے کہ سرمایہ ناجائز طریقہ سے ملک سے باہر نہ جائے۔ مختصر یہ کہ صحیح طریقہ سے جو غیر ملکی سفر اختیار کیا جائے گا۔ اس پر غیر ملکی کرنسی خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہوگی۔

چاند کا نہ نظر آنیوالا رُخ ماسکو فوٹو شائع کرے گا

ماسکو، ۱۰ر اکتوبر۔ چاند کا جو رُخ دنیا سے نہیں دکھائی دیتا ہے اس کے فوٹو پہلی بار آج ماسکو کے اخبارات میں شائع ہو جائیں گے یہ بات روسی خبر رساں ایجنسی تاس نے آج بتائی ہے۔ تاس کے بیان میں کہا گیا ہے کہ چاند کے اس رخ کی تصویریں روس کے مصنوعی سیارہ لونیک ۳ نے تقریباً چالیس منٹ تک لی تھیں اور کئی تصویریں لی گئی تھیں ـــ تاس کی خبر میں بتایا گیا ہے کہ خودکار آلات کے ذریعہ یہ تصویریں لونیک ۳ کے اندر ہی ڈیولپ کی گئی تھیں۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۰ (۱۹۵۰) لائسنس نمبر ۲۹۶/۵۰ ٹیلیفون نمبر ۲۲۳۹

اردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کا علمبردار

یہ قدم زبان اردو پہ خاص احسان کر رہا ہے — فروغ اردو فروغ اردو کا ساز و سامان کر رہا ہے
نظر نظر سے ادب نمایاں قدم قدم پہ شعور فطرت — نفس نفس کو حیات نو کا لطیف عنوان کر رہا ہے

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

دسمبر ۱۹۶۰ء

مدیر اعزازی

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم اے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ)

مدیران

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — حکیم عبد القوی دریابادی بی اے

منیجر و نگران

محمد حسین شمس قاسمی کاکوروی

قیمت: فی پرچہ ۸ر — سالانہ چندہ دو روپے ۸ر

ترسیل زر کا پتہ

۳۶ امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

مبارک بک ڈپو ڈینسو ہال بندر روڈ بالمقابل نیشنل بینک کراچی (پاکستان)

اپنی باتیں

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

مردم شماری اور ہمارا فرض

کسی ملک کی مردم شماری کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی کتنی آبادی ہے بلکہ مردم شماری سے ملک کے پورے حالات۔ اقتصادی، سماجی، تعلیمی، لسانی وغیرہ کا جائزہ ہو جاتا ہے۔ اس جائزہ کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور صحیح ہونا چاہیے کیونکہ اسی پر ملک کے روشن مستقبل کا انحصار ہے اس لیے مردم شماری کا کام نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی جمہوریت کی روح کا فقدان ہونے کی وجہ سے ابھی تک مردم شماری کی اہمیت و افادیت کو عوام سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس مرتبہ اس کمی کو دور کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ عوام کو مختلف طریقہ سے اس کی افادیت سمجھائی جا رہی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ملک کی کثیر آبادی مردم شماری کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہے۔ جس کی وجہ سے

شمارہ نمبر ۸ | دسمبر [illegible] | جلد نمبر ۷

فہرست

(۱) اپنی باتیں	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۳
(۲) اردو کے چار شاعروں کی بعض مشترک چیزیں۔	حکیم عبدالقوی دریابادی	۹
(۳) اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۷
(۴) ڈیوڈ ہیوم کے آخری وقت کے تاثرات۔	سید اختر علی تلہری	۲۹
(۵) ظریف لکھنوی کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ۔	ناظم سیتاپوری	۳۷
(۶) حسرت کا اردوئے معلیٰ۔	شمس تبریز خاں	۴۱
(۷) پسندیدہ اشعار۔	محمود نقوی	۵۷
(۸) صحن گلستان (غزل)	محمود عشقی	۵۹
(۹) شوق بے حد (غزل)	ہنین ریحانی	۶۰
(۱۰) گل مرجھا گئی (افسانہ)	نسیم لکھنوی	۶۱

سید ظہیر حسین پرنٹر و پبلشر نے سرفراز قومی پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشاعت لکھنؤ سے شائع کیا۔

پہلا وقفہ: ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء سے یکم مارچ ۱۹۶۱ء کے طلوع آفتاب تک ہے دوسرا وقفہ یکم کو سورج نکلنے سے شروع ہوگا اور ۳ مارچ کی شام کو ختم ہوگا۔ اصل مردم شماری کے وقت شمار کنندگان کو دو طرح کی پرچیاں بھرنی پڑیں گی۔ ایک خاندانی پرچہ دوسری انفرادی۔ انفرادی پرچی کے سوال نمبر ۲ (الف) میں مادری زبان اور سوال نمبر ۲ (ب) میں ثانوی زبان لکھی جائے گی۔

ہر اردو داں کا فرض ہے کہ وہ خانہ ۲ الف میں اپنی مادری زبان اردو لکھائے اور خانہ ۲ ب میں ثانوی زبان ہندی اور اگر ہندی نہیں انتا ہے تو جو زبان وہ جانتا ہے لکھائے۔ مادری زبان کے فارم میں مادری بان کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

۲۔ الف مادری زبان کا مطلب یہ ہے کہ جس زبان میں بچپن میں کسی شخص کی ماں اس سے بولتی ہے۔ یا جو زبان خاندان میں خاص طور سے لی جاتی ہے۔ اگر ماں بچپن میں مرگئی ہو تو وہ زبان لکھائی جانی چاہیے۔ بچپن میں اس آدمی کے گھر میں زیادہ تر بولی جاتی ہو۔ گونگوں اور بہروں کی مادری زبان وہ زبان ہوگی جس میں ان کی ماں عام طور سے لتی ہوں۔

(۲۔ ب اور ت) مادری زبان درج کرانے کے بعد ثانوی زبان لکھایا ر کوئی شخص کوئی اور زبان نہیں جانتا ہے تو × نشان لگا دیا جائے گا ن زبانوں کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور یہ مادری زبان سے

ہر بات کا ٹھیک ٹھیک اندراج ہونے کی امید رکھنا حاصل ہے۔ اس لئے ذمہ داران اور ملک کے ہوشمند نیز سیاستداں حضرات کا یہ فرض ہے کہ وہ مردم شماری کے وقت اس امر کی کوشش کریں کہ کوئی بات چھوٹنے نہ پائے اور ہر بات ٹھیک ٹھیک لکھی جائے۔

جہاں تک اردو زبان کے اندراج کا تعلق ہے یہ فرض اردو داں کا ہے کہ مردم شماری کے وقت وہ اپنی مادری زبان اردو لکھا کر یقین کرلیں اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو زبان زندہ رہے اور ترقی کرے اور اس کو بھی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح جملہ حقوق مل جائیں وہ بھی روزمرہ کے کاموں میں، سرکاری دفتروں میں، تعلیمی اداروں میں کچہریوں میں رائج ہو جائے تو ان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ابھی سے کوشش کریں اپنے گھروں میں، محلوں میں، حلقوں میں، ایک ایک شخص کو یہ سمجھا دیں کہ ان کی مادری زبان اردو ہے اور وہ مردم شماری میں اپنی زبان اردو لکھا کریں۔ اس مقصد کے لئے جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، حلقہ وار کمیٹیاں قائم کرلی جائیں اور ہر ہر محلے کے لئے رضاکاروں کو متعین کیا جائے اور روزانہ تھوڑا وقت دے کر گھر گھر یہ آواز پہنچائی جائے کہ وہ اپنی مادری زبان اردو لکھائیں۔

مردم شماری کا کام تو شروع ہو چکا ہے اور سرسری جائزہ لیا جا رہا ہے۔ لیکن اصل کام ۱۰ فروری سنہ ۶۱ء سے شروع ہو کر ۵ مارچ سنہ ۶۱ء تک ختم ہو جائے گا۔ کارروائی کا یہ عرصہ دو دفعوں میں تقسیم ہوگا۔

تیار رہتے ہیں۔ دو ماہ پیشتر ہم نے جو طرزی نمبر نکالا تھا اس میں بعض مضامین کے بعض حصے سہواً ایسے ضرور شائع ہو گئے ہیں جن سے بعض ادبی اداروں (خصوصاً نسیم بکڈپو) کے وقار کو صدمہ پہنچا ہے ہم ان سے اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ رہا طرزی صاحب کی ناولوں کا شمار تو ان کا صحیح شمار صرف مرحوم ہی کو معلوم ہوگا اس کے متعلق ہم کوئی فیصلہ قطعی طور پر نہیں کر سکتے۔

نور الحسن ہاشمی مدیر اعزازی

جگر نمبر

فروغ اردو کے جگر نمبر کے سلسلہ میں ابھی تک مضامین موصول ہونے کا سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ سے ترتیب میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔ مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے مضامین جلد از جلد روانہ فرمائیں تاکہ جگر نمبر جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہو سکے۔ اگر مضامین کی تاخیر کے باعث جنوری میں نمبر نہ شائع کیا جا سکا تو فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوگا۔

مختلف ہوں گی اور یہ ایسی ہوں جنھیں کوئی شخص اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا ہو۔ ایسی زبان یا زبانیں اسی زبان کی بولیوں (dialects) سے مختلف ہونی چاہئیں۔"

اس طرح یہ بات صاف ہو گئی کہ جس شخص کی ماں کی زبان اردو ہے اس کی بھی مادری زبان اردو رہے گی۔ خواہ اس کو اردو پڑھنے کا موقع نہ ملا ہو۔ آج کل ہمارے طلبا کی ۹۰ فیصدی تعداد ایسی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن جنھیں تعلیمی اداروں میں (بیسک اسکولوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک) اردو تعلیم نہیں مل سکی اور سرپرستوں کی کوشش نیز سرکاری احکامات کے باوجود ان کے لئے اردو کے پڑھنے کے تمام دروازے بند رہے اور اب تک بند ہیں۔

اس لئے والدین کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اگر ان کا بچہ اردو نہیں جانتا ہے۔ بلکہ صرف ہندی جانتا ہے تو بھی اس کی مادری زبان اردو ہی ہے۔ اور یہی انھیں درج کرانا چاہیئے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے وہ یہ کہ ادارۂ فروغ اردو کا مسلک صلح کل ہے اور اس کا مقصد اردو ادب کی خدمت ہے۔ اگر سہواً ہمارے رسالہ میں کوئی ایسا مضمون یا مضمون کا حصہ شائع ہو جائے جس سے کسی شخص یا ادارہ کے وقار و عزت کو صدمہ پہنچے تو ہم کو ایسے سہو پر رنج ہوتا ہے اور اس کے لئے اظہار افسوس کرنے کو

اردو کے چار مشاہیر کی بعض مشترک چیزیں

از حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے

اردو کے عناصر اربعہ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، اور خواجہ الطاف حسین حالی میں ان کے اختلاف طرز و اسلوب کے باوجود بہت سی چیزیں مشترک بھی تھیں۔ بعض ایسی جو چاروں میں مشترک تھیں اور بعض ایسی جو ان میں سے دو یا تین میں مشترک تھیں۔ مثلاً

(۱) یہ چاروں صاحبان شاعر بھی تھے۔ بلکہ مولانا حالی تو نثر نگار سے کہیں زیادہ شہرت شاعر کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ ان کا مسدس اردو شاعری اور ملی شاعری میں مایۂ ناز مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض اور نظمیں بیوہ کی مناجات چپ کی داد وغیرہ بھی خاص مقبول رہ چکی ہیں۔ مولانا شبلی اصلاً فارسی کے شاعر تھے اور ان کے فارسی کلام کا مجموعہ کلیات شبلی کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اردو شاعری میں بھی انہوں نے توجہ کی تھی۔ اور ان کی قومی نظموں کا ایک زمانہ میں بڑا شہرہ تھا۔ علی گڑھ کالج سے تعلق کے زمانہ میں انہوں نے ایک مثنوی صبح امید لکھی تھی جو اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ بہت سے شاعرانہ محاسن

ناولوں کے بعد ادبی کتابوں کی

چور بازاری والی کتابوں سے بچیو

اب تک ناولوں کی چور بازاری ہو رہی تھی اس کے علاوہ پاکستان کی شائع کردہ کتب ہندوستان میں بلا کسی رکاوٹ کے شائع ہو رہی تھیں۔ اب ادبی کتابوں پر بھی ڈاکہ پڑنے لگا ہے ہر ادیب اور ناول نگار بے بس نظر آتا ہے ہندوستان کی شائع کردہ اور اسکے بعد پاکستان کی شائع کردہ کتابیں بلا کسی جھجک کے اصل ناشر کے نام سے دھوکا دے کر شائع کی جا رہی ہیں

ہم سب کا فرض ہے کہ اس سلسلہ میں قانون کی گرفت کو مضبوط کریں اور ہر چور بازار ناشر کو کیفر کردار کو پہنچائیں اور ایسی کتب خرید کر ہمت افزائی نہ کریں۔

(ادارہ)

رسالہ تہذیب الاخلاق میں علامہ شبلی اور مولانا حالی دونوں کے مضامین وقتاً فوقتاً نکلتے رہے۔

(۶) شمس العلماء آزاد اور مولانا حالی دونوں نے محسن اردو کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے قائم کردہ نئے طرز کے اردو مشاعرہ میں سرگرم حصہ لے کر جدید طرز شاعری کی بنیاد ڈالی۔ مولانا حالی کی چار مثنویاں برکھارت نشاط امید حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف انہیں ماہانہ مشاعروں کے لئے تیار کی گئی تھیں۔

(۷) مولانا حالی اور شمس العلماء آزاد دونوں کا تعلق پنجاب گورنمنٹ بکڈپو سے بھی رہا۔ اور اس تعلق سے دونوں نے درسی کتابیں بھی تیار کیں۔

(۸) مولانا شبلی کی شہرت مورخ کے ساتھ ساتھ سوانح نگار کی حیثیت سے بھی ہوں اور اب تک ہے الفاروق، المامون، الغزالی، سیرت النعمان اور سب سے بڑھ کر سیرت النبی ان کے نام کو زندہ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن سوانح نگاری میں تقدم کا فخر مولانا حالی کی حیات سعدی کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یادگار غالب اور حیات جاوید (سرسید احمد خاں کی سوانح) بھی ان کی قلمی یادگاریں اور بہت بلند پایہ سمجھی جاتی ہے۔ آزاد کی دربار اکبری تاریخ، سوانح اور ادب کے مجموعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۹) شاعری پر تنقید و تبصرہ حالی اور شبلی دونوں نے خوب کیا۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اردو شاعری کے لئے انقلاب آفرین ثابت ہوا۔ شبلی کا موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم، مقالات شبلی (ادبی) اور سوانح مولانا روم

سے بھی مرصع تھی شمس العلماء آزاد کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مولانا نذیر احمد کی شاعری بھی زیادہ تر نظموں (عموماً ان نظموں کی شکل میں جو انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یا مدرسہ طبیہ دہلی کے سالانہ جلسوں میں پڑھی تھیں) پر مشتمل ہے۔ اور ان کا مجموعۂ نظم بے نظیر کے نام سے مولانا کی زندگی ہی میں اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ مولانا نذیر احمد اس اعتبار سے اپنے ان ہم عصروں سے منفرد تھے کہ انھوں نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ اور انہیں کی طرح ان کے بعد مولانا ظفر علی خاں مرحوم زندگی بھر بغیر کسی تخلص کے شاعری کرتے رہے۔

(۲) ان چاروں صاحبوں کو ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا تھا۔

(۳) شمس العلماء آزاد کو چھوڑ کر بقیہ تین صاحبان سرسید کی تعلیمی تحریک سے بہت متاثر ہوئے تھے مولانا شبلی تو کئی سال تک ایم اے او کالج علی گڑھ میں پروفیسر بھی رہے تھے۔ سرسید کے تعلیمی پیام کی اشاعت کرنے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اسٹیج کی زینت ان تینوں صاحبوں کے دم سے ہوتی رہی۔ مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر مولانا شبلی اور مولانا حالی کی نظمیں اس کانفرنس کا خاص جزو سمجھی جاتی تھیں۔

(۴) یہ چاروں صاحبان قدیم طرز تعلیم سے آراستہ تھے۔ جدید طریقہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب نگارش اور ان کی تصانیف جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبول ہوئیں اور اب تک ان کا شمار اردو کے عناصر اربعہ میں کیا جاتا ہے

(۵) سرسید کے جاری کردہ اخبارات و رسائل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور

یہ منصفانہ رائے لکھی تھی۔ لیکن ان کو کوئی شہرت حاصل نہ ہوئی۔

(۱۰) علامہ شبلی نے روم (ترکی) مصر و شام کا سفر علمی اغراض کے تحت کیا۔ اور واپسی پر اپنا سفر نامہ روم و مصر و شام کتابی شکل میں شائع کیا جو اس وقت بہت مقبول ہوا اور اب بھی حالات کی اتنی تبدیلی و تغیر کے باوجود اس کی ادبی شاہ ولی برقرار ہے۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر کیا تھا اور سیر ایران کے نام سے ایک مختصر کتاب ان کے قلم سے نکلی تھی جس میں وہاں کے حالات کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و لغات کی تحقیقات بھی درج تھی۔

(۱۱) ان چاروں مشاہیر ادب کے مکاتیب کتابی شکل میں شائع ہوئے، شمس العلماء نذیر احمد کے مکاتیب ان کے صاحبزادہ بشیر الدین احمد صاحب کے نام موعظۂ حسنہ کے نام سے مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے بقیہ تین حضرات کے مجموعہ مکاتیب بعد وفات ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے جمع کرا کر شائع کرائے ان میں مکاتیب شبلی سب سے زیادہ ضخیم اور دو جلدوں پر مشتمل تھے۔ مجموعہ مکتوبات آزاد مختصر تھا۔ اور مولانا حالی کے مکاتیب کا مجموعہ باعتبار ضخامت ان دونوں کے بین بین ہے۔

(۱۲) مکتوبات کے ساتھ ساتھ مقالات و مضامین کے مجموعے بھی دو صاحبان مولانا شبلی و مولانا حالی کے شائع ہوئے۔ مقالات شبلی ایک جلد میں اور رسائل شبلی تو مولانا کی حیات ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ وفات کے بعد ان مقالات کو مختلف عنوانات مذہبی، تاریخی و ادبی و فلسفیانہ وغیرہ کے تحت دار المصنفین اعظم گڈھ نے آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔ مولانا حالی کے مقالات اور مضامین

اُردو دو فارسی شاعری پر ان کے حیرت انگیز عبور اور ان کے اعلیٰ ذوقِ تنقید کی شہادت دیتے ہیں۔ اردو شعرا کے تذکرہ اور ان کے کلام پر نقد کے لحاظ سے آزاد کی آبِ حیات کو شرف تقدم اور نمایاں درجہ حاصل ہے جا بجا تاریخی تسامحات کے باوجود اس کا ادبی اسلوب اس درجہ دلآویز ہے کہ ہاتھ میں لینے کے بعد اسے چھوڑتے نہیں بنتا۔ فارسی شاعری اور ادب کی خدمت مولانا شبلی نے شعر العجم کی پانچ جلدات کے ذریعہ انجام دی۔ اور آزاد نے بھی سخندان فارس اور نگارستان فارس کے ذریعہ دوسرے رنگ میں یہ خدمت انجام دی۔ مگر افسوس کہ ان دونوں کتابوں کو شعر العجم کا سا حسن قبول حاصل نہ ہو سکا۔

(۱) مولانا شبلی اور مولانا نذیر احمد نے اپنی تصانیف سے مذہب کی خدمت کا بھی خوب حق ادا کیا۔ مولانا نذیر احمد کا ترجمۃ القرآن۔ الحقوق والفرائض اجتہاد۔ ادعیۃ القرآن۔ رویائے صادقہ توبۃ النصوح اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ توبۃ النصوح اور رویائے صادقہ ہیں تو ناول لیکن ان کے مطالعہ سے مذہب کی طرف خصوصی رغبت وکشش پیدا ہو کر رہتی ہے مولانا شبلی کی سیرت النبی، اور ان کی کلامی تصنیفات علم الکلام، الکلام اور مقالات شبلی کی بعض جلدیں۔ تو ان کی مذہبی تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تاریخی و سوانحی کتابوں کا تو ایک خاص مقصد اسلام اور مسلمانوں پر غیروں کے اعتراضات کے حملوں کا جواب و دفاع ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ مولانا حالی نے بھی عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے جوابات میں بعض کتابیں تریاق مسموم اور تاریخ محمدی (مولفہ چودھری محمد علی)

لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مولانا حالی نے بھی ایک کتاب مجالس النساء لکھی تھی جس پر انھیں محکمہ تعلیمات پنجاب کی طرف سے چار سو روپیہ کا انعام بھی ملا تھا۔

(۱۵) کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولانا حالی نے کچھ عرصہ ایک رسالہ اتالیق پنجاب (لاہور) کی اڈیٹری بھی کی تھی۔ یہ رسالہ محکمہ تعلیم پنجاب کی طرف سے نکلتا تھا۔ کچھ عرصہ شمس العلماء آزاد بھی اس کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے تھے۔ مولانا حالی کے مضامین اور نظمیں بھی وقتاً فوقتاً ملک کے اخبارات و رسائل میں نکلتی رہیں۔ مضامین نثر جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا۔ زیادہ تر رسالہ تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ایم اے او کالج میگزین علی گڑھ میں نکلے اور کچھ مضامین رسالہ مخزن لاہور، اخبار رفیق ہند، رسالہ معارف (پانی پت۔ زیر ادارت مولوی وحید الدین سلیم)، عصر جدید (میرٹھ)، زمانہ (کانپور) میں بھی نکلے۔

مولانا شبلی ایم اے او کالج میگزین جس کا قدیم نام علی گڑھ منتھلی تھا کے شعبۂ اردو کے اڈیٹر اپنے زمانہ پروفیسری علی گڑھ میں رہے اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے نکلنے والے مشہور و معروف ماہنامہ الندوہ پر مدیر کی حیثیت سے انکا نام سالہا سال تک درج ہوتا رہا اور ان کے بہت سے معرکے کے مضامین اس رسالہ میں نکلے۔ ان کی سیاسی رنگ کی نظمیں مولانا ابوالکلام کے نامور ہفتہ وار الہلال میں بھی شائع ہوکر بہت مقبول ہوئیں۔

(۱۶) مولانا حالی اور مولانا شبلی دونوں کی وفات ایک ہی سنہ یعنی ۱۹۱۴ء میں دسمبر اور نومبر کے مہینوں میں ہوئی احسن مارہروی مرحوم نے ایک بہت ہی پر درد مرثیہ کسوف نشمین (غم شبلی و ماتم حالی) کے نام سے لکھا تھا جو اسی زمانہ میں برابر

کے نام سے دو مجموعے شائع ہوئے۔

(۳) سیرت نبوی پر مولانا شبلی کا تصنیفی کارنامہ سیرت النبی جس کا اتمام ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی نے کیا۔ تو مشہور و معروف ہستی ہے۔ شمس العلماء آزاد نے بھی ایک مختصر کتاب کائنات عرب کے نام سے اس موضوع سیرت پر لکھی تھی۔ اور مولانا نذیر احمد نے آخری دور میں امہات الامۃ کے نام سے ایک کتاب ازواج مطہرات کے حالات پر لکھ کر عیسائی پادریوں کے ان الزامات و اتہامات کی تردید کی تھی جو وہ آنحضور صلعم پر تعدد ازدواج کے سلسلہ میں عائد کرتے رہتے تھے۔ اور مولانا حالی نے بھی اپنی نثری تالیفات کے زمانہ آغاز میں ایک مولود شریف پرانے قسم کی عبارت میں لکھا تھا جو ان کی وفات کے عرصہ بعد خواجہ سجاد حسین پانی پتی نے بطور تبرک شائع بھی کرا دیا تھا۔

(۴) تعلیم و تدریس کے موضوع پر مولانا حالی، شمس العلماء آزاد اور مولانا نذیر احمد تینوں نے قلم اٹھایا تھا۔ فارسی زبان کی تعلیم و تحصیل پر آزاد مرحوم نے قند پارسی اور آموزگار پارسی کے نام سے دو رسائل لکھے تھے مولانا حالی نے فارسی صرف و نحو پر محکمہ تعلیم پنجاب کے انعامی اعلان کے مطابق ایک کتاب اصول فارسی لکھی تھی لیکن وہ غیر مطبوعہ ہی رہی۔ شمس العلماء نذیر احمد نے بچوں کے لئے چند پند اور منتخب الحکا اور لڑکیوں کے لئے مراۃ العروس اور بنات النعش کہیں عربی علم صرف کے لئے ایک رسالہ مایغنیک فی الصرف لکھا۔ اسی طرح کا ایک رسالہ نحو عربی پر بھی لکھا تھا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا۔ مگر صرف والا رسالہ شائع ہو کر اپنے وقت میں بہت مقبول ہوا۔

اکبر الٰہ آبادی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
ایم اے پی ایچ ڈی

سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو بارہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پدر بزرگوار سید تفضل حسین صاحب ایک عالم باعمل اور صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ اسی تصوف اور مذہب کے ماحول میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔ مذہب اور تصوف کا رنگ شروع ہی سے ان پر ایسا چڑھ گیا کہ آخر دم تک قائم رہا۔

اکبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی سے حاصل کی۔ ذہن اور حافظہ بلا کا تھا۔ تیزی و طراری فطری تھی اس لئے دس سال کی عمر تک عربی فارسی میں کافی استعداد حاصل کر لی۔ اس کے بعد جمنا مشن اسکول الٰہ آباد میں داخل اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان میں آفتاب انقلاب طلوع ہو رہا تھا۔ انگریزی تعلیم مخالفت کے باوجود مقبول عام ہوتی جا رہی تھی۔ اکبر فطرۃً قدامت پسند تھے۔ بچپن ہی سے آثار قدامت پسندی ظاہر ہونے لگے تھے۔ اسکول کا ماحول ان کے لئے سوہان روح سے کم نہ تھا۔ تیرہ برس کے سن ہی میں اسکولی تعلیم ختم کر دی۔ اس طرح تیرہ برس کی عمر میں اکبر کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ذوق مطالعہ اور ہنگامی تعلیم تھا۔ جس نے اکبر کو

کے نظامی پریس سے شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

سال پیوستہ ہجری میں رہی تھی اک شب
کہ ہوئی شبلی مرحوم کی جنت سے طلب
عیسوی سال بھی ہونے لگا رخصت نہیں عجب
دے گئے حالی مغفور غم و رنج و تعب
نسبت یک جہتی کر گئے ظاہر دونو
سال آخر کی طرح ہو گئے آخر دونو

ہوئے۔ یہ بیماری موت کی بیماری تھی دس بارہ دن علیل رہ کر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جمعہ کے دن پہنچے شام ۷۵ سال کی عمر میں یہ ہنسانے والی ہستی سب کو رلا کر ہمیشہ کے لئے اُٹھ گئی۔

آ گئی فصل خزاں اکبر گئی دل کی بہار
ساتھ اپنے لے گیا وہ اپنی محفل کی بہار

بزم ادب سونی ہو گئی۔ دنیائے علم و ادب میں صف ماتم بچھ گئی۔ تاریخ وفات اکبرؔ سے تاریخ وفات نکلی۔

اکبر فطری شاعر تھے۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ سترہ برس کی عمر کے کلام میں زندگی و پختگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے حضرت وحید الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ رسم اور مذاق زمانہ کے بموجب اکبر بھی ابتداءً قدیم رنگ میں غزلیں کہتے تھے۔ اشعار میں تو شستگی ضرور تھی مگر صفائی۔ زور طبیعت ہر شعر سے ظاہر ہے۔ ابتدائی اشعار اس قسم کے ہوتے تھے۔

چشم عاشق سے گریں لخت دل بیتاب دو اشک
آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب و اشک
وہ آئے بھی لب بالیں تو ایسے وقت میں آئے
کہ فرط ضعف سے ہم کر نہیں سکتے اشارہ تک

لیکن قدرت نے ان کو غزل گوئی، عشق بازی اور حسن پرستی کے لئے نہیں پیدا کیا تھا بلکہ ان کو مجسمۂ ظرافت و ذہانت بنا کر قوم و ملت کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اس لئے غالب کی طرح

مذہب و تصوف، قانون و سیاست کا نیر تاباں بنا دیا۔ اور علم و ادب کے اس درخشاں آفتاب نے اپنے زریں خیالات کی شعاعوں سے دنیا کے گوشہ گوشہ کو منور کر دیا۔

اکبر متوسط طبقہ کے فرد تھے۔ حالی کی طرح آغاز شباب سے ہی فکر معاش دامن گیر ہو گئی۔ متعدد معمولی جگہوں پر کام کرنے کے بعد مختاری کا امتحان پاس کیا۔ پھر نائب تحصیلدار بنے اور احباب و شہر سے دور ایک قصبہ میں بھیجے گئے۔ اکبر اس دوری احباب و وطن کو برداشت نہ کر سکے چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

نہ پروانے سے محفل اور نہ بلبل سے چمن چھوٹا
مجھی سے جلسۂ رنگین یاران وطن چھوٹا

آخر نائب تحصیلداری جلسۂ رنگیں یاران وطن پر قربان کر کے چلے آئے۔ کچھ عرصہ بعد اپنے ایک عزیز کی کوششوں سے ہائی کورٹ میں مثل خواں ہو گئے۔ مثل خوانی سے انگریزی قابلیت اور قانون دانی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ سات برس تک وکیل ہائی کورٹ رہے وکیل سے منصف بنے اور ترقی کرتے کرتے جج ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب خود انہیں کے قول کے بموجب عشق تیغ ابرو کے صلہ میں عطا ہوا۔

عاشقانہ داد یہ اچھی دی مجھ کو چرخ نے
تیغ ابرو کا تھا عاشق خان بہادر کر دیا

آنکھوں کی شکایت نے ۱۹۰۳ء میں ریٹائر ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸ برس یعنی ۱۹۲۱ء تک پنشن حاصل کرتے رہے۔ آخر اگست ۱۹۲۱ء میں بخار و تشنج میں مبتلا

نہیں ہے تاہم وہ ضرورت سے آگاہ کرنے سے فرض عمر بھر ادا کرتے رہے۔

سمجھو اکبر سے کچھ ہی پیام رازِ انقلاب
یہ بات معلوم ہے لیکن نہیں ادا ہوئی۔

اکبر کی طبیعت پر مذہب، تصوف اور کسی حد تک قدامت پرستی کا رنگ غالب تھا وہ ہر تبدیلی پر آنکھ بند کر کے صاد کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ قدیم سرمایہ کو محفوظ رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، بدولت گورنمنٹ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے شعر و شاعری کے ذریعہ سے یہ فرض انجام دیا۔

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اکبر کی شاعری کے کم از کم چار دور کئے جا سکتے ہیں:-

۱- پہلا دور [illegible] یعنی ۲۰ سال کی عمر تک ہے۔ ابتدائی کلام ہے پختگی کم ہے مگر برجستگی، شوخی، روانیٔ طبع اور لطفِ زبان موجود ہے۔

۲- دوسرا دور [illegible] یعنی ۴۰ سال کی عمر تک ہے۔ کیفیتِ شباب کلام میں ظاہر ہے۔ رنگِ تغزل غالب ہے۔ عشق و عاشقی کی گھاتیں بھی ہیں اور ہجر و وصال کی باتیں بھی۔ اظہارِ محبت میں شوخی و ظرافت کی چاشنی موجود ہے۔

۳- تیسرا دور [illegible] یعنی ۶۰ سال کی عمر تک ہے۔ تقاضائے عمر کے ساتھ ساتھ کلام میں سنجیدگی اور متانت پیدا ہوتی گئی۔ اخلاقی اور روحانی آمیزش، فطری ظرافت کے ساتھ نمایاں ہے۔ رنگِ شاعری شوخ و طنز آمیز ہے۔ منظومات، قطعات اور رباعیات کی طرف رجحان زیادہ ہوتا گیا۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اکبر کے بیان کے لئے بھی وسعت بحر بیکراں درکار تھی۔ میدان غزل سے نکل کر نظم، قطعات اور رباعیات میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ قوم و ملت کی اصلاح کر کے منصب امامت پر فائز ہو گئے۔

اکبر کی شہرت ان کی ظرافت، خوش طبعی اور طنز کی وجہ سے ہے۔ ان کی ظرافت محض خوش طبعی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا میدان بہت وسیع ہے۔ جس میں کسی نہ کسی مذہبی علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی و سماجی تاریخی اور روحانی حقیقت کا انکشاف کیا جاتا ہے حالات معاشرہ اور سیاست، مذہب و اخلاق، مغربی تعلیم و تہذیب، پردۂ نسواں اور تعلیم نسواں وغیرہ خاص مباحث ہیں۔ ان کی طنز کا مطمح نظر ہمیشہ اصلاحی پہلو رہا ہے اسی لئے ان کا مزاحیہ کلام ادبیات عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے

اکبر کی شاعری ان کے عہد اور ماحول کی پیداوار ہے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات سے تعلیم و تہذیب، اخلاق و معاشرت میں جو انتشار پیدا ہو رہا تھا اور ہندوستانی جس تیزی کے ساتھ مغربی اثرات قبول کرتے جا رہے تھے۔ غرض ہند قبضہ کے علاوہ، بیرون ہند، تہذیب و تمدن کا غلبہ بھی تھا۔ تقلید مغربی ہی کو اپنی عزت عظمت ترقی و بلندی کا سرچشمہ سمجھ کر جس طرح حصول منصب و جاہ و حشمت، کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر کی دور بین اور حقیقت شناس نگاہوں سے وہ پوشیدہ نہ تھا ان کی شاعری ان سب حقائق کی ترجمان ہے اور بدلتے ہوئے نظام سے خبردار کرتی ہے۔ اس لئے ان کا کلام یادگار انقلاب ہے۔ گو وہ جانتے تھے کہ آنے والی ہوا چلتی

ان الفاظ کا استعمال انتہائی شوخ، بیباک اور کسی حد تک عریاں ہے۔

اکبر کو خواہ قدامت پرست کہیے یا تنگ نظر، ریفارمر سمجھیے یا شاعر، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے موجودہ مغربی تعلیم و تہذیب، اخلاق و معاشرت کے پر جو شکوک ظاہر کئے تھے۔ وہ حرف بحرف صحیح نکلے۔ اظہار بیان کے لئے ظریفانہ رنگ ہی سب سے زیادہ مناسب تھا اس لئے اسی پیرایہ میں انھوں نے سب کو کھری کھری باتیں سنائیں باوجود اس احتیاط کے گورنمنٹ کی نظر عنایت سے وہ بچ نہ سکے اور ان کو حکم زبان بندی دے دیا گیا۔ خود فرماتے ہیں کہ

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترک سخن
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

لیکن:۔

بنا لیتا ہے موج خون دل سے خود چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

اکبر کی آزاد طبیعت نے موج خون دل سے اپنا علٰحدہ ایک چمن بنا ہی لیا اور اپنے زمانہ کے تمام سیاسی، تعلیمی، اخلاقی ماحول کو ہنسی ہنسی میں اس خوبی و خوش اسلوبی سے بیان کیا کہ بڑے بڑے رہنمایان قوم و ملک منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کی بات کا جو اثر دلوں پر ہوتا تھا وہ کسی وعظ یا رہبر قوم کو نصیب نہ تھا سچ ہے:۔

بار خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد برا
دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

۴۔ چوتھا دور۔ ۱۹۲۱ء یعنی آخر عمر تک ہے۔ اس دور میں غزلیات برائے نام ہیں۔ قطعات و رباعیات اور منظومات زیادہ ہیں۔ عارفانہ و فلسفیانہ مضامین غزلوں میں بھی بیان کئے ہیں۔ طبیعت کی آمد، جدت مضامین، ندرت قافیہ اور بلندی تخیل ہر ہر شعر میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور عارفانہ نظمیں اور قطعات زیادہ ہیں۔ آخر میں جوان بیٹے ہاشم کی موت نے دل شکستہ کر دیا اور کلام میں بے ثباتی دنیا، یاس و افسردگی، رنج و الم کا عنصر غالب ہو گیا تھا۔

اکبر کی شاعری کے بے انتہا موضوع ہیں۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا رہ گیا ہو جس پر انھوں نے کچھ نہ کہا ہو۔ حالات حاضرہ۔ سیاست، مذہب، اخلاق، مغربی تعلیم و تہذیب۔ علوئے نفس، روحانیت پردۂ نسواں، تعلیم نسواں، اسلام، انقلاب زمانہ، بے ثباتی دنیا، تصوف، فلسفہ، مادہ پرستی، فیشن۔ معاشرت ہر ایک پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسلوب بیان میں شوخی و ظرافت طعن و طنز سنجیدگی و متانت، درد و اثر سب کچھ موجود ہے۔ زبان نہایت شستہ و پاکیزہ ہے اور روزمرہ اور محاوروں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے تشبیہات و تلمیحات میں ندرت و جدت ہے۔ عامیانہ اور کم درجہ کے ہزاروں الفاظ انھوں نے استعمال کئے مگر برمحل اور حسب موقع استعمال سے ان میں چار چاند لگ گئے ورنہ کلو، بدھو، جمن، بفاتی، خیراتی، اونٹ، گائے، بکری وغیرہ کو کلام میں کون جگہ دیتا۔ اسی طرح سیکڑوں انگریزی کے الفاظ اشعار میں استعمال کئے ہیں الفاظ کی بندش اور ترکیب استعمال میں مناسبت و موزونیت کی وجہ سے ان میں جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ البتہ بعض جگہ

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی قائم رکھا
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

رنگ باطن نکھرتا کیسے جبکہ نئی تعلیم ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی قائل ہے

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب؟

مشرقی تعلیم میں انسان کا رشتہ خدا سے ملتا ہے اور مغربی تعلیم میں بندر سے

بولا منصور کہ خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
مجھ سے کہنے لگے میرے اک دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یہی وجہ ہے کہ مغربی تعلیم سے بہیمیت اور حیوانیت بے شرمی اور عریانیت بڑھتی جاتی ہے اور اس کے روکنے کے لئے کہیں کہیں جزو مذہبی تعلیم نصاب میں شامل کی گئی ہے جناب اکبر کی نظر میں اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

تعلیم نسواں اور پردۂ نسواں پر اکبر نے بہت کچھ لکھا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار اس قدر شد و مد کے ساتھ کیا ہے کہ اکثر حضرات انہیں تعلیم نسواں کا مخالف ہی سمجھنے لگے حالانکہ یہ بات نہیں ہے وہ مغربی تعلیم کے اثرات سے لڑکیوں کو بچانا چاہتے تھے۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

یوں تو اکبر کے ناوک ظرافت نے زمانہ کا کوئی صید نہ چھوڑا لیکن ان کا خاص موضوع مغرب اور مشرق کی کشمکش ہے جس پر انھوں نے ناصح مشفق اور امام طنزیات بن کر نکتہ چینی کی ہے مغربی تعلیم و تہذیب نے مشرقی تہذیب و معاشرت، تعلیم و تربیت اور مذہب و اخلاق کا جنازہ نکال دیا۔ اکبر کے اندیشہائے دور دراز حرف بحرف صحیح اور صحیح ثابت ہوئے۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

مغرب کی تعلیم نے ایک دو نہیں سیکڑوں خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مثلاً نیا نصاب تعلیم باپ کی عزت کرنا نہیں بتاتا بلکہ خبطی سمجھنا سکھاتا ہے اس لئے اکبر مرحوم اپنی رائے ظاہر فرما رہے ہیں۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ کر کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ایسی تعلیم و تربیت والدین کے لئے وبال جان ہو تو کیا ہو اس لئے اس عہد میں باپ نہ ہونا ہی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے برتھ کنٹرول کے بد بگڑے کے لئے یہ نسخہ نہایت مجرب و موثر ہے۔

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دام بلا ہے
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے

باپ نہ بننے کی ایک وجہ خاص یہ بھی ہے۔

ہوگیا ہے۔

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک لقمے میں
نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

شکم پرستی ملاحظہ ہو:۔

شکم سے حضرت انسان نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

یہ شعر حال کے عالمی مقابلہ حسن اور مس ورلڈ کے انتخاب کی یاد دلاتا ہے۔

ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر
اگر فیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

مذہب سے بچنے کے لئے یہ دلیل کتنی تری ہے کہ

انکار نہیں نماز روزے سے مجھے
لیکن یہ طریقہ اب ہے فیشن کے خلاف

اور فیشن کے انتظام صفائی بھی ملاحظہ ہو۔

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بے شک مگر جناب
فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

مہذب انسان شیطان اور خدا دونوں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔

مئے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی مسجد میں دو
شیخ بھی خوش رہیں شیطاں بھی بے زار نہ ہو

شمع انجمن بننے کے لئے پہلی شرط انگریزی تعلیم کی تھی اور دوسری شرط ہے پردگی کی :-

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

اور جب تعظیم علم ہی کے لئے پردہ اٹھا تو بحث مباحثہ کی گنجائش کہاں ؟

غریب اکبر نے بحث پردے پہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہکر کہ کرہی لیگا مرا موا کیا

نقاب الٹ کر اور مردوں کی عقل پر پردہ ڈال کر میاں بیوی دونوں مہذب بن گئے ۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اس کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا !

مہذب اور ترقی یافتہ بننے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے ۔

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں

اکبر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ چاہتے تھے کہ

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

نئی تعلیم و تہذیب اخلاق کو کھوکھلا کر دیتی ہے ۔ عریانیت ۔ فیشن پرستی نام و نمود ۔ مادہ پرستی ۔ شکم پرستی اور خود غرضی ہی کا نام تہذیب و اخلاق

ڈیوڈ ہیوم کے آخری وقت کے تاثرات

مولانا سید اختر علی صاحب تلہری

یوں تو ایک مشہور ہندوستانی شاعر کی زبان میں موت "دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا"! یعنی اس کے نزدیک ہستی سے عدم تک کی منزل میں صرف نفس چند کا فاصلہ ہے لیکن شاعر کے انداز تخییل کا راستہ اور ہے، حقائق کے شناسا کا راستہ اور۔ موت حقیقۃً ایک جانی بوجھی منزل سے ایسی غیر معلوم منزل میں قدم رکھنے کا نام ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں اس لئے شاعر کی اس خوش خیالی کو چھوڑ کر دنیا سے ہٹ کر اس سفر میں بالعموم ہزاروں وحشتیں ہزاروں دہشتیں انسان کو گھیرے رہتی ہیں۔

مسافر عمر کے ایک حد پر پہنچ جانے کے بعد زندگی کے سفر کا خاتمہ ناگزیر ہوا کرتا ہے خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے ہر سانس لینے والے کو مرنا ہی پڑتا ہے مگر مرنے کے بعد جو جانے کیا پیش آئے گا گونا گوں خوفوں اور ڈروں کے سایہ میں وہ یہ سفر ہمیشہ طے کرتا ہے۔ رابرٹ براؤننگ انیسویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی شاعر ہوا ہے انسانی فطرت کے مظاہر کے اس قدر مانتے اپنی محبوب شریک حیات کی دائمی جدائی سے متاثر ہو کر ایک بہت ہی عمدہ نظم لکھی ہے prospice (پراسپیکے) براؤننگ

خدا پرستی اٹھتی جا رہی ہے اور مادہ پرستی بڑھتی جا رہی ہے۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

نئی یا مغربی تہذیب کے دلدادوں کا انجام یہ ہوتا ہے۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

میں نے اکبر کی بحر ظرافت کے یہ چند قطرے پیش کر دئے وقت کوتاہ نہ ہوتا تو ان کے فلسفیانہ اور عارفانہ کلام کے بھی چند اشعار پیش کرتا چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا — جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

وہ چشم ہوں کہ جو ہے محو جلوہ توحید
وہ دل ہوں جس میں تجلی ہو نور عرفاں کی

آخری شعر ہے رنگ تغزل میں تاثیر حسن و عشق ملاحظہ ہو۔

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی
تاثیر حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی

اکبر کا مجموعہ کلام تین کلیات میں شائع ہوا ہے۔ قطعات و رباعیات علاوہ سے بھی شائع ہو چکے ہیں، نثر میں خطوط اکبر اور نیوجرات و سلام کا ترجمہ یادگار ہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

کہ وہ نہایت اطمینان سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکے۔

چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

موت اس کے لئے کوئی ڈراونی چیز نہیں رہتی. لیکن اس بلند مقام کا حاصل ہونا بہت ہی سخت مرحلہ ہے. زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی تعلیمات رسمی طور سے زبان سے دہرائی جاتی ہیں لیکن وہ دل میں نہیں اترتی ہیں. اس مرتبۂ رسوخ کے حاصل نہ ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مرتے وقت بیشتر دل کی گھبراہٹیں یاس آمیز قنوطی کلمات کی شکل میں زبان سے ٹپکنے لگتی ہیں اور بڑے سے بڑا بہادر اس منزل پر پہونچ کر بزدل بن جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موت کی منزل سے آشنائی جب تک خاص مذہبی مذاق میں اور مخصوص مذہبی ڈھنگ میں نہ ہو اس اطمینان کی کوئی منزل ہی حاصل نہیں ہو سکتی صورت واقعہ یہ ہے کہ اس نفسی سہارے کا حصول صرف اس بات پر موقوف ہے کہ کسی نہ کسی نہج سے ہماری موت کی منزل سے اجنبیت دور ہو جائے یا ہم خود شدت کے ساتھ اسے محسوس کر لیں کہ ہماری اجنبیت دور ہو چکی ہے. ایسی حالت میں یہ نفسی سہارا ان لوگوں کو بھی مل سکتا ہے جو کسی مذہبی نظام سے رسمی طور پر وابستہ نہیں ہیں. ممکن ہے سطحی مذاق میرے اس خیال سے مذہب کے انحراف کو لیتا ہوا سمجھے مگر حقیقت یہ نہیں ہے. مذہب کی سچائی ان باتوں کے سہارے سے بے نیاز ہے. مذہب خود ہمیں حقیقت پسند بنانا چاہتا ہے. وہ کبھی واضح حقائق سے انکار کی سرپرستی نہیں کر سکتا۔

— — — — — — — — — مذہب کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس کے دبار سے یہ سہارے بکثرت ملتے ہیں اور اچھی نوعیت کے اور

نے اس نظم کے ابتدائی دو بندوں میں اسی منزل عدم کی وحشتوں کی تصویر کشی کی ہے
مگر اس کے مقابلے کے لئے کچھ سہارے پیدا کرتے ہوئے اس نے اس منزل کو مسکن
بتایا ہے۔ ایسی ڈراؤنی رات کا جو اپنے دامن میں خوفناک تاریکیاں سمیٹے ہوئے ہے
جہاں قیامت خیز طوفانی جھکڑ غیظ و غضب کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اسی خوفناک
منزل میں انسانوں کا مہلک ترین دشمن فرشتۂ موت ہیبت انگیزیوں اور دہشت
آفرینیوں کا دل ہلانے والا لباس پہنے قیام پذیر ہے۔ اس منزل کے نشیب و فراز
سے کلی ناواقفیت ذمہ دار ہے اس تمام انسانی خوف و ہراس کی۔ اس میں قدم رکھنے
سے بڑے بڑے دل گردے والے کانپتے ہیں اور کانپنا زیادہ بجا بھی ہے۔
اس بھیانک مگر ناگزیر سفر کی وحشتیں کم کرنے کے لئے انسانی فطرت نے کچھ ایسے سہارے بھی
بنا لیے ہیں جو موت کی منزل کی طرف بڑھنے والوں کے نفس میں قوت پیدا کر دیتے ہیں
اور اس وقت کا بخشا ہوا اطمینان کبھی کبھی موت کی منزل میں قدم رکھنے والوں کے
چہروں کو بھی بشاشتوں کا نورانی رنگ عطا کر دیتا ہے۔
"فکر و نظر" میں قبلی بی کام نے کسی جگہ لکھا ہے کہ علامہ اقبال مرتے وقت یہ شعر
گنگنا رہے تھے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

بات لگتی ہوئی ہے اگر کسی کا دل بھی پیشانی کے ساتھ ایمان کے آستانہ پر جھک
چکا ہے اور مذہب کی تعلیمات نے فی الحقیقت اس کے قلب میں رسوخ پیدا کر لیا
تو پھر یقیناً نفسی حیثیت سے اسے وہ قوت حاصل ہو سکتی ہے جو اسے اتنا مضبوط بنا دے

ہے تو وہ اس سانحہ سے بہت ہی زیادہ متاثر ہوا۔ ڈاکٹر کارائل نے اس ضمن میں مسٹر بوائل کے حوالہ سے لکھا ہے: مسٹر بوائل نے جیسے ہی اس حادثہ کی خبر سنی وہ ہیوم کے کمرے میں گیا۔ وہ دونوں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ وہاں پہونچ کر اس نے ہیوم کو زار قطار روتے ہوئے بہت ہی زیادہ درد و غم میں مبتلا پایا۔ بوائل نے تعزیت ادا کرنے کے بعد ہیوم سے کہا میرے دوست تم اس غیر معمولی رنج کا اس حادثہ کی وجہ سے اس لئے شکار ہوئے ہو کہ تم نے مذہبی اصولوں کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر تم مذہبی اصولوں پر یقین رکھتے ہوتے تو اس سانحہ کا تم پر اتنا اثر نہ ہوتا کیونکہ تم اپنے دل کو مستحکم یقین سے تسلی دے لیتے کہ تمہاری ماں ایک بہت ہی نیک اور پاکباز مسیحی عورت تھی۔ اس لئے منصف و عادل خدا کے دربار میں وہ بہت ہی شاد و خرم ہوگی۔ ہیوم نے اس کا یہ جواب دیا کہ میں اپنے افکار و تصورات صرف حکماء و فلاسفہ اور مابعد الطبیعات میں دلچسپی رکھنے والی دنیا کی "تشحیذ ذہن" (ذہن پر دھار رکھنے) کے لئے پیش کیا کرتا ہوں۔ یہ تمہارا خیال درست نہیں ہے کہ میں دنیا کے دوسرے امور کے متعلق کوئی دوسرا خیال رکھتا ہوں۔ ان امور کے متعلق میرا بھی وہی خیال ہے جو دوسرے لوگوں کا ہے۔ ہیوم کے اس جواب سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہیوم بھی ان امور میں مذہبی دنیا سے الگ کوئی عقیدہ نہیں رکھتا تھا لیکن کیا فی الحقیقت یہ ٹھیک ہے؟

ہکسلے نے ہیوم پر جو کتاب لکھی ہے وہ اس سوال سے اس میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ڈاکٹر کارائل ہیوم سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور اس کے بیانات ہیوم کے متعلق معتبر بھی ہیں لیکن بات تو یہ ہے کہ اگر ہیوم نے اس کا ذکر ڈاکٹر کارائل سے

مستحکم اور پائدار قسم کے۔

ڈیوڈ ہیوم اسکاٹ لینڈ کا مشہور متشکک فلسفی تھا۔ اسے مذہب سے کبھی عقیدت مندانہ رابطہ نہ رہا تھا۔ بشپ برکلے نے مادہ پرست فلسفیوں کے "مادہ" کا وجود حکیمانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ باطل کر کے "روح برتر" خدا کا وجود ثابت کیا تھا۔ مگر اسی ہیوم نے اس کی تعمیر کی ہوئی "روح برتر" کی عمارت کو "نظریۂ تعلیل" causation کا گولہ چلا کر گرا دیا تھا۔ اور اپنے "فلسفۂ تشکیک" کی بنیاد اس کی جگہ قائم کر دی تھی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے ایسا گمراہ شخص بھی اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں مطمئن ہی رہا۔ اس نے جب محسوس کر لیا کہ اس کی بیماری مرض الموت ہے اور اب جانبری کی کوئی صورت نہیں ہے اور اب وقت آ چکا ہے کہ عناصر کے باہمی امتزاج و ترکیب کے توسط نے اس کی مخصوص ہستی کی جو لہر پیدا کی تھی وہ ختم ہو کر پھر انہیں عناصر میں تبدیل ہو جائے تو اس نے اپنے حالات زندگی قلمبند کرنا شروع کر دیئے اور زندگی کے ختم ہوتے ہوتے اس نے انہیں ختم کر ڈالا وہ حالات "my own life" کی شکل میں موجود ہیں۔

اس اٹھارہویں صدی کے مشہور فلسفی کا آخری بیان ذیل میں پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ جواں مرد چھیاسٹھ سال کا حکیم کن تیوروں سے موت کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ معاد کا قائل نہیں۔ وہ موت کو مخصوص شکل اختیار کئے ہوئے عناصر کے انتشار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مگر چونکہ اسے اپنے خیال پر اعتقاد پختہ اور ایمانی اعتماد ہے اس لئے اسے نفسی سہارا موت کے مقابلہ کے لئے مل گیا۔ اور وہ فلسفیانہ اطمینان کے ساتھ حکیمانہ سکون کے ساتھ فنا کی منزل کی طرف بڑھا۔

یہیں ایک نقطہ نظر بھی کا اور کر دینا ضروری ہے۔ ہیوم کی ماں کا جب انتقال

گزرنے کو سب سے زیادہ پسند کروں گا تو میری نظر انتخاب زندگی کے اسی آخری دور پر پڑے گی۔ مطالعہ کا جذبہ میں اب بھی وہی جوش باقی ہے اور دوستوں کی صحبت سے مسرت اندوزی کا وہی رجحان موجود ہے۔ ہاں اب تو میں شدت سے یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ چھیاسٹھ برس کا شخص اپنی موت سے ضعف اور انحطاط ذہنی کی مزید چند برسوں کا صرف خاتمہ کرتا ہے۔ اگرچہ میں بہت سی نشانیاں ایسی دیکھ رہا ہوں کہ میری ادبی اور علمی شہرت مزید چمک اور جگمگاہٹ کے ساتھ بالآخر دنیا میں چاروں طرف سرعت سے پھیلنے والی ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس شہرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے مجھے چند ہی سال اور مل سکتے ہیں۔ زندگی کے بے ہنگی اور اعتدال جو مجھے آج حاصل ہے اس سے زیادہ کا حصول بہت دشوار ہے۔ اپنی عام سیرت و کردار کے متعلق مجھے اتنا کہنا ہے کہ میں اپنے عادات و اطوار اور مزاج کے لحاظ سے ایسا شخص ہوں (نہیں بلکہ تھا) کیونکہ اپنے متعلق کچھ کہتے ہوئے مجھے اب یہی اسلوب بیان اختیار کرنا چاہیئے۔

ہاں تو میں اپنی عام مزاجی رفتار کے لحاظ سے معتدل میلانات والا بے ہنگی کی صلاحیت رکھنے والا۔ اپنے مزاج پر قابو رکھنے والا۔ کسی کے خلاف دشمنی رکھ سکنے کے لئے نا اہل۔ اپنے تمام جذبات میں اعتدال کا مالک، کشادہ دل، ملنسار اور خوش مزاج انسان تھا۔ یہاں تک کہ علمی و ادبی شہرت حاصل کرنے کے ذوق و شوق نے بھی جو میرے یہاں سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ تھا کبھی میرے مزاج میں تلخی نہیں پیدا کی، باوجودیکہ مجھے اپنے اس شوق کی تکمیل کے راستے میں بارہا ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ میرے حلقۂ صحبت میں نوجوان اور رند مشرب لا ابالی لوگ بھی اسی طرح خوش

کر دیا ہوتا تو وہ اسے ضرور بیان کر دیتا۔ اس لئے کاروائل سے اس واقعہ کو بوائل ہی نے بیان کیا ہوگا۔ اگر بوائل مل جاتا تو اس سے جرح کی جاتی اور یہ پوچھا جاتا کہ ہیوم کے اصلی لفظ کیا ہیں اور کس سلسلے میں کہے گئے ہیں۔

ان باتوں پر اطمینان حاصل کرنے کے بعد ہی اس گفتگو کے الفاظ کو بعینہ قبول کیا جا سکتا ہے اگر بوائل نے ان حوادث اور سوانح کے ظہور پر بڑے بڑے مستحکم مذہبی عقائد رکھنے والوں کو درد و کرب کے بستر پر تڑپتے نہیں دیکھا ہے۔ تو نوع انسانی کے متعلق اس کا تجربہ بہت ہی محدود ہے۔ ہیوم بوائل کے مذہبی اصولوں کا منکر نہیں تاہم وہ بڑا راستباز کھلے ہوئے دل کا صاف گو شخص تھا۔ اس لئے وہ آخری شخص ہوتا جو اپنے دوستوں میں غیر مبہم الفاظ استعمال کرتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ کہ وہ اپنی ماں کی حلاوت آمیز، تلخ، ماتمی یاد میں بوائل کی خواہ مخواہ کی مداخلت کو اس جواب کے علاوہ کسی اور طرح نہ ٹال سکتا ہو۔

کھلے کے اس بیان سے ہیوم کے مذہبی ہونے کا خیال غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ آئیے اب دیکھیں کہ اپنے آخری لمحات زندگی میں یہ مشکک لامذہب فلسفی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لرزتے ہاتھوں سے کیا لکھ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اب میں ہوں اور برق رفتاری کے ساتھ میرے وجود کی تحلیل اپنی بیماری سے بہت کم میں نے روحانی اذیت اٹھائی ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اجزائے ہستی کے اس قدر تیزی کے ساتھ گھلنے کے باوجود میرے دلوں میں ایک لمحہ کے لئے ذرا سی تھکاوٹ نہیں پیدا ہوئی بلکہ صورت حال تو یہ ہے کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں اپنی زندگی کی کس منزل سے

ظریف لکھنوی کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ

——— نادم سیتاپوری

میر مقبول حسین ظریف لکھنوی (۱۸۷۰ء — ۱۹۳۷ء) کو جنھوں نے صرف پڑھا ہے دیکھا نہیں شاید انھیں مشکل سے یقین آئے گا کہ ظریف اتنے "مرنج و مرنجاں" قسم کے انسان تھے ان کو دیکھ کر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا سنجیدہ، متین اور مہذب شخص بھی ایسا منفرد طنز گو اور "طنز کار" ہو سکتا ہے؟ پہلی بار میں نے جب ظریف کو دیکھا تو مشاعرے کا "کریاکرم" کر رہے تھے۔ ایرانی ٹوپی، منڈھی ہوئی شیروانی، چوڑی موری کا پائجامہ ——— اور گھنی مونچھوں کے پیچھے ڈھکی چھپی ایک پرسکون متانت! اور زانو بیٹھ کر ہزل شروع کی: "محل ہوا، ساحل ہوا ...." ہر طرف سے داد و تحسین کا شور بلند تھا۔ اس زمانے تک "تالیاں بجا کر داد دینے کا دستور صرف مکارم نگر" کے زنانوں تک محدود تھا۔ اس لئے معاملہ "آہ واہ" سے آگے نہ بڑھا۔ زور سے ٹھٹھے لگا کر ہنسنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اس مشاعرے میں صفی، محشر، عزیز، ثاقب، یاس (عظیم آبادی) برق (شاہجہانپوری)، دل (شاہجہانپوری)، جگر بسوانی اور خدا جانے کون کون شریک تھا

رہتے تھے جس طرح ادبی و علمی ذوق رکھنے والے سنجیدہ، زحمت کش محنتی اور ذمہ دار طلبہ مجھے با حجاب عزلت پسند خواتین کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں خاص مسرت محسوس ہوتی تھی۔ میرا ان نسوانی حلقوں میں جس ذہنیت سے استقبال ہوتا تھا اس کے لئے میرے پاس خفگی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

(مختصر لفظوں میں) اگرچہ بہت سے متاثر ادیبوں کو اس کی نوبت آئی ہے کہ وہ اپنے خلاف بہتان طرازی اور تہمت سازی کی شکوہ سنجی کریں۔ لیکن میری سیرت کے دامن پر کبھی ان تباہ کن اتہامات کی گرد تک نہیں پڑی۔ اگرچہ میں نے بیباکی کے ساتھ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے غیظ و غضب کے مظاہرے کے لئے اپنے کو پیش کیا۔ لیکن میرے مقابلے میں یہ لوگ ان اسلحہ کو عادت کے باوجود استعمال نہ کرسکے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے متعلق اس "ذاتی خطابت" میں جس کا مظاہرہ کر رہا ہوں فخر و مباہات کا کوئی شائبہ نہیں ہے لیکن مجھے اس کی امید ہے کہ یہ خطابت بے موقع اور غیر مناسب ثابت نہ ہوگی اور اصل میں تو یہ وہ واقعاتی حقیقت ہے جس کے متعلق آسانی سے یقین حاصل کیا جا سکتا ہے"۔

رسوم کی اپنے بارے میں "ذاتی خطابت" سنجیدہ ہے۔ اس میں بعض امور کا اپنے متعلق بہادرانہ اعتراف ہے مگر اس پورے بیان میں جو ٹھہراؤ کی کیفیت ہے وہ بے جگری کی کیفیت نہیں رکھتی۔ اس میں آمد نہیں۔ آورد معلوم ہوتی ہے لفظ لفظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑھاپے کے جھریاں پڑے ہوئے منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں: "جو مرگ آید تبسم بر لب اوست" کی شگفتگی کا رنگ اس میں نہیں ہے شاید فلسفہ کا تپایا ہوا سہارا یہ مسکراہٹ بخش بھی نہیں سکتا [illegible] موت کے بعد والی نامعلوم کیفیتوں سے زیادہ سے زیادہ بیزار و غیر متعلق رہا سکتا ہے اور وہ موت کا [illegible] ہے بڑھ سکتا ہے لیکن مرتے وقت مسکراتے ہوئے ٹھنڈے پن کی شگفتگی مذہب کے بخشے ہوئے سہارا [illegible]

مندوستان کے سب سے بڑے طنز گو شاعر کے قریب بیٹھا ہوں۔ لکھنوی لب و لہجے میں ڈھلے ہوئے مہذب و شائستہ فقرے۔ بہت ہی سنجیدہ اور ستھرا انداز گفتگو، متانت ایسی کہ بعض وقت "زاہد خشک" کا دھوکا ہونے لگتا ــــ لیکن ایک دن جو دیکھا نہ وہ "مسائل تصوف" تھے نہ "بیان غالب"! مہاراجہ پارک (محمود آباد) کی ائش میں لہک لہک کر لاؤڈ اسپیکر پر اپنا تصنیف "آلہا" سنا رہے تھے۔ پلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ "ظریف لکھنوی" ہو سکتے ہیں، یقیناً کوئی "پنڈت ...ج بھوشن" قسم کے مہاشے ہوں گے ــــ مگر جب آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا تو یہ مقبول حسین ظریف لکھنوی ہی تھے ــــ اور اسی پوربی لب و لہجے کے ساتھ جو خاص اودھ کے دیہاتوں کا حق و حصہ ہے۔

دیسی ریاستوں میں "بھوپال" نے بھی ظریف کی قدر افزائی میں کبھی کوئی نہیں کی۔ یہاں کے سرکاری مشاعروں میں کئی بار شریک ہوئے۔ کلیات ریف (دیوان جی) میں بھوپال کے مشاعروں کی کچھ غزلیں بھی شامل ہیں بھوپال میں ظریف کے قدر دانوں میں "جسٹس سلام الدین" خاص طور پر قابل کر ہیں۔ جسٹس سلام الدین ریاستی دور میں بھوپال ہائی کورٹ کے چیف جج تھے ن سے اور ظریف سے براہ راست خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور کبھی سید د عسکری وکیل بھوپال کی وساطت سے بھی نامہ و پیغام ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ن خط و کتابت پر ایک اچھا خاصا جود طاری ہو گیا چنانچہ ظریف مرحوم نے سید محمد عسکری وکیل کو خط لکھا جس میں ایک قطعہ تھا ــــ

ہزل ختم پر تھی۔ ظریف جب اس شعر پر پہونچے تو لاشعوری طور پر ان کی نگاہیں دل شاہجہانپوری طرف اٹھ گئیں جو ظریف کو بڑی فراخدلی کے ساتھ داد دینے میں مصروف تھے۔ شعر پڑھا ظریف نے۔!

جسم کے پنجرے میں مرغ روح نے روز ازل
ایک انڈا دیدیا تھا نام جس کا "دل" ہوا

دل مرحوم اس شعر کے بعد کچھ ایسا چپ ہوئے کہ ظریف کی پوری ہزل صبر سے گذار گئی اور انھوں نے چوں نہ کی۔

ایسا ہی دلچسپ لطیفہ محترمی پروفیسر آغا اشہر لکھنوی کے ایک مشاعرے کا ہے واقعہ سنہ ۱۹۲۴ء کا ہے "معین ادب" کے مشاعروں کا زور تھا اشہر صاحب کی طرف سے ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ مصرعہ طرح خود اشہر صاحب کا ایک مصرعہ تھا ——— "قلب اشہر اور تمنا اس بت خودکام" کی۔

مشاعرہ منعقد ہوا ظریف بھی شریک مشاعرہ تھے۔ جب ان کی باری آئی تو طرح میں ہزل شروع کی ——— لیکن جب نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ مقطع پڑھا تو ایک سناٹا سا چھا گیا مصرعہ طرح پر گرہ لگا دی تھی مقطع میں۔

فعل کتنا یہ خلاف "وضع فطری" ہے ظریف
قلب اشہر اور تمنا اس "بت خودکام" کی

میں نے ظریف مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مرنے سے چند سال قبل سرکار محمود آباد سے وابستہ ہوگئے تھے۔ قلعہ محمود آباد کے اندر "برزخی کوٹھی" میں رہتے تھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ

حسرت کا اردوئے معلّٰی

محمد شمس تبریز خاں

حسرت کے دل میں اردو ادب کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا اور اسی جذبہ سے بیخود ہو کر بی اے کے امتحان کے فوراً بعد علیگڑھ کے آسمانِ ادب سے اردوئے معلّٰی کی شکل کا درخشندہ ستارہ طلوع کر دیا جس کی ضو فشانیوں سے قدیم و جدید ادب کے دھندلے گوشے جگمگا اٹھے۔ حسرت کے ماہوار رسالے میں قدیم و جدید ادب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ نہ انھوں نے پرانی روش سے چھیڑ چھاڑ کیا اور نہ نئی قدروں سے احتراض۔ ان کے دل میں دونوں کے لئے جگہ تھی۔ اردوئے معلّٰی سنہ ۱۹۰۳ء کی پہلی جولائی کو منظرِ عام پہ آیا تھا۔ اور حسرت کی مقبولیت دیکھئے کہ اسی وقت سے انھیں مشاہیر ادبا و شعرا کا تعاون حاصل ہو گیا۔ جو نوزائیدہ رسالوں کے لئے کسی قدر بعید ہے۔ اس شمارے کی ترتیب اس طرح تھی :-

ٹائیٹل پہ یوں لکھا :- ان فی ذالک لذکریٰ لاولی الالباب

"تذکرۃ الشعراء" از :- حسرت

تکالیف حیات از :- رشید احمد صالم

اگر پوچھیں کبھی تم سے مجھے جنس سلام الدین
بعد تعظیم یہ کہنا کہ اے عالی مقام الدین
سلام شوق کہنا ہے بعد آداب حضرت کو
ظریف لکھنوی مقبول[1] میم الدین و لام الدین

ظریف کا یہ قطعہ ان کے کلیات "دیوان جی" میں شامل نہیں ہے اور ظریف کے "غیر مطبوعہ کلام" کی ایسی اہم کڑی ہے جسے مستقبل کی تاریخ والہانہ طور پہ تلاش کرے گی۔

---

[1] مقبول حسین ظریف

حصہ نظم میں صرف اس قسم کی نظمیں شائع کی جائیں گی جن کے انداز بیان میں کوئی خصوصیت ہو۔ ان نظموں کے متعلق طرز قدیم و جدید کی قید نہ ہوگی" اس مقصد اصلی کے علاوہ چند اور ضمنی مقاصد بھی ہیں مثلاً قدر دانی اہل کمال و امداد زبان اردو.... اس سلسلے میں نایاب دواوین کا انتخاب اور تذکرۃ الشعراء کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا) "مضامین کے لئے معقول معاوضہ دیا جائے گا اس کے متعلق نیز دیگر امور کے متعلق خط و کتابت اڈیٹر کے نام سے ہونا چاہیئے جواب کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

حسرت کا رسالہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۸ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ مارچ میں حسرت نے انگریزی سامراج سے بغاوت کے طور پر انگریزوں کے جری دشمن مصر کے قومی رہنما مصطفےٰ کامل کی یاد میں اردوئے معلےٰ کا ایک نمبر نکالا۔ مضمون باغیانہ قرار دیا گیا۔ اور گویا یہ علیگڑھ کی وفاداری پر غداری کا دھبہ تھا، خود کالج کے لوگوں نے مخالفت کی کیونکہ وہ مجبور تھے۔ نواب وقار الملک وغیرہ بھی خلاف تھے۔ عابد رضا بیدار صاحب نے لکھا ہے:۔ "مضمون حسرت کا نہ تھا، مولانا سہیل مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ مضمون انکا لکھا ہوا تھا۔ لیکن مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا مقدمہ چلا اور اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر کو ۲ سال کی سزا ہو گئی، اردوئے معلیٰ بند ہو گیا"

ہماری زبان ۸ر فروری ۵۸ء

حسرت نظر بند تھے مگر اردو ادب کی خدمت بار بار یاد آ رہی تھی۔ رہا ہوئے اکتوبر ۱۹۰۹ء تھا پھر رسالہ دوبارہ جاری کر دیا۔ دوسری بار کب تک چلا معلوم نہ ہو سکا۔ بیدار صاحب نے لکھا ہے۔ دوسری بار یہ کب تک چلا مجھے اس کا صحیح نہ چل سکا

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبۂ علمی } از :- امجد علی صاحب اشہری
زبان اردو کی اصلاح اور تدوین }
پولیٹیکل سائنس از :- قاضی تلمذ حسین صاحب گورکھپوری
انتخاب بیاض مولانا مولوی سید آل حسن صاحب و بیاض جناب منشی مسعود احمد ضمیر مینائی لکھنوی۔
سلسلۂ افسانہائے مکمل و مختصر۔ نمبر (۱) از شاہد۔ حرماں نصیب
حصہ نظم :- سید مہدی مجروح، وفا رامپوری، حسرت موہانی ۔۔۔ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور آخر میں لکھا تھا ۔سعید احمد کے اہتمام سے مطبع احمدی علیگڑھ میں طبع ہو کر شائع ہوا۔

چونکہ پہلا پہلا شمارہ تھا تعارف ضروری تھا اس کی تلافی پشت پر چھپے ہوئے قواعد و ضوابط سے ہو جاتی تھی ۔ ملاحظہ ہو کہ کتنا مکمل و منظم رسالہ تھا، خاص خاص قواعد یہ تھے:۔ "جن حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ بلا درخواست حاضر ہوگا۔ ان سے تقاضائے قیمت کبھی نہ ہوگا اگر وہ حضرات از راہ قدر دانی و ہمت افزائی عنایت فرمائیں گے تو عین کرم ہوگا ورنہ اردوئے معلی کے لئے یہی معاوضہ کافی ہے کہ وہ ان کی نگاہ سے گذرتا اور اس باریابی پر فخر کرتا رہے۔"

اس رسالے کا مقصد صرف ایک ہے یعنی درستی مذاق چنانچہ اس لحاظ سے امور مندرجہ ذیل کی پابندی کی جائے گی ......
مضامین نثر ہر قسم کے شائع ہوں گے یعنی سوانحی، تاریخی، علمی، فلسفی، اخلاقی، تمدنی، ادبی، تنقیدی و متعلق افسانہائے مکمل و مختصر۔

مرزا سلطان احمد مقتدی خاں شروانی۔ فرزند مولانا حبیب الرحمن مرحوم۔ اثیر امیری شعرا کی فہرست یہ ہے:۔ میر مہدی مجروح (تلمیذ غالب) وقار رامپوری۔ شبلی نعمانی فصیح الملک داغ دہلوی۔ شاد عظیم آبادی۔ ریاض خیرآبادی۔ منشی امیر اللہ تسلیم عزیز لکھنوی۔ وحشت کلکتوی، صفی لکھنوی۔ اثر عظیم آبادی۔ شوق وغیرہ حسرت مرحوم سیاست میں کانگریس کے زبردست حامی تھے۔ اس لئے بارہا انہیں (علیگ) ہوتے ہوئے بھی علیگڑھ کی سیاست سے اختلاف کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں آغا خاں مرحوم ہی مسلم ڈیپوٹیشن وائسرائے ہند سے ملا تو ہلکی تنقید کے بعد اسے بہت سراہا تھا۔ حسرت حق بات کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے جسے غلط سمجھتے اس کی پوری مخالفت کرتے اور جو مستحسن معلوم ہوتا اسے سراہتے بھی تھے۔ اردوئے معلی میں جا بجا "مسلمان اور کانگریس" اور "اسلام اور کانگریس" کے عنوان سے مضامین حسرت اور دوسروں کے بھی ملتے ہیں۔ اس وقت ملک میں یہی ذہنیت ہی تھی جیسا کہ مولانا آزادؒ نے ایک رسالہ لکھا تھا "مسلمان اور کانگریس"۔ مولانا محمود حسنؒ نے لکھا تھا "شرکت کانگریس کا جواز" اس لئے حسرت کو بھی لکھنا تھا۔

۱۹۰۳ء میں اردوئے معلی میں مطبوعوں، اخبارات و رسائل کے اشتہارات بھی چھپنے لگے تھے۔ حسرت ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اپنے رسالہ کے ذریعہ دو قومی نظریہ کی یکسر تغلیط فرماتے تھے۔ اسی اتحاد کے پیش نظر حسرت نے مولانا شرر کی انجمن اتحاد کا اشتہار شائع کیا تھا۔ ناظرین اندازہ کریں گے کہ کیسا عالی ظرفیت کا ثبوت ہے:۔ عنوان ہے۔

انجمن اتحاد

اگرچہ ہندوستان میں اور مختلف مذہبوں کے لوگ بھی آباد ہیں مگر ہندوستانی

کم از کم ۱۹۱۳ء تک یہ ضرور نکل رہا تھا۔ اور رشید صاحب کا کہنا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں جب وہ علی گڑھ آئے تو حسرت یا اردوئے معلے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

(علی گڑھ کی صحافت) ہماری زبان ۱۹۵۸ء حسرت ایک محب وطن تھے ملک کی ابتری دیکھی نہ جاتی تھی، وہ بھی میدان سیاست میں کود پڑے اور ابوالکلام، ڈاکٹر انصاری گاندھی جی، علی برادران، اجمل خاں کے ساتھ ہو لئے۔ اور بار بار قید فرنگ کی آبلہ پائی کے مزے چکھے۔ اور سنت یوسفی بڑی سرگرمی سے انجام دی۔ جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد ملک کے اکثر لیڈر گرفتار ہو چکے تھے اب حسرت کی باری تھی ۱۹۱۶ء میں ان کی آرزو بھی پوری ہوئی جنگ کے خاتمہ پر رہائی ہوئی۔ ڈیڑھ دو سال کا عرصہ گزرا تھا کہ پھر تقاضائے دل کو دعوت مژگان زنجیر کے لئے پیش کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں قید ہوئے مگر خدمت اردو ہمیشہ یاد رہی بارہا جیل جانے کے باوجود اردوئے معلے کو تیسری بار ۱۹۲۵ء میں کانپور سے نکالا ۱۹۲۶ء میں سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے فروری، مارچ، اپریل، مئی کے شمارے نہ نکل سکے۔ اور ایک شمارہ ذ قربان علی بسمل نے ترتیب دیا۔ ۱۹۳۶ء میں جولائی، اگست، ستمبر کے شمارے نکلے جو ۲۷ویں جلد کے ۷، ۸، ۹ نمبر تھے۔ بیدار صاحب نے لکھا ہے جو اس کے بعد ممکن ہوں چند پرچے اور نکلے ہوں لیکن غالباً زیادہ دن نہیں چلا ہے۔ آخری پرچہ کب نکلا اس کے تعلق میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ علی گڑھ کے اصحاب کہنہ سے اس قسم کی معلومات نہیں مل سکیں۔ اردوئے معلی دور اول کے لکھنے والوں میں ممتاز ادبا، صاحب طرز نثار، مشاہیر شعرا کا اجتماع نظر آتا ہے۔ مثلاً نثاروں میں اسلم جیراجپوری، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، جب کرم مولانا آزاد مرحوم، امیر احمد علوی، کشن پرشاد کول، مولوی عبدالحق، سجاد حیدر یلدرم

مرزا محمد ہادی صاحب بی اے اور خود حسرت شریک ہیں۔ مذکورہ مضمون اردو شاعری میں امیر صاحب نے گویا اچھا خاصہ تقابل و توازن کیا ہے انگریزی و اردو شاعری کا۔ اور اردو شاعری پر سے ہر ایک رد کو اٹھاتے چلے گئے ہیں۔ اعتراضات اس وقت کی نئی تعلیم سے منور ذہنوں کی پیداوار تھے۔ اور انگریزی شاعری کی نیچریت سے مرعوب ہو جانے والوں کے لئے۔ منشی صاحب نے ایک شعر عنوان کے طور پر لکھا ہے ؎

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　سعدی از خویشتن فریاد

کہا جاتا ہے کہ اردو شاعری مخرب اخلاق ہے اس میں فطری جذبات اور بلند خیالات کا پتہ نہیں۔ وہ خلاف قیاس تشبیہوں اور بیہودہ استعاروں سے معلو ہے فلسفیانہ مضامین اور کارآمد فنون کا اس میں ذکر نہیں اور وہ یورپ کی سچی نیچری اور دلچسپ شاعری کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اردو شاعری کو برا کہنے، گالیاں دینے اور اس پر ہر طرح کے الزامات لگانے کا تمہیں اختیار ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ انگریزی نظموں میں وہ کون سے جوہر ہیں جو تمہارے یہاں تلاش سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے اور تمہاری شاعری کی کیا برائی ہے جس کا نمونہ انگلستان میں موجود نہیں ہے"۔ پھر ہر موضوع پر انگریزی شاعروں سے اردو شاعروں کا موازنہ کرتے چلے گئے ہیں۔ "صبح" کے عنوان پر انگریزی کے تین شاعروں کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر میر انیس کی جولانیٔ طبع کو سراہا ہے اور آخر میں تینوں شاعروں کی خامیاں دکھائی ہیں میر انیس کا شعر ہے۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح　　گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح الخ

پبلک میں سب سے بڑے غالب گروہ ہندو مسلمانوں کے ہیں جن میں بد قسمتی سے روز بروز مخالفت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اگر اور چند روز یہی حالت رہی تو ہندوستان کی تباہی یقینی ہے۔ اس مصیبت کے دفع کرنے کے لئے فی الحال انجمن اتحاد کے نام سے ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے جس کا سب سے اہم فرض یہ ہوگا کہ ان دونوں گروہوں میں اتفاق کرائے ان کی رنجشوں کو دور کرے اور جہل کی نفرت انگیزیوں کو شائستگی کے ساتھ دبائے۔ انجمن اتحاد کی ممبری کے لئے نہ کسی فیس کی ضرورت ہے نہ کہیں آنے جانے کی حاجت صرف مراسلت کے ذریعہ تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔ مختلف شہروں میں لوکل سوسائٹیوں کا ہونا وہاں کے ممبروں کے جوش پر منحصر ہے۔ سردست صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جن ہندو یا مسلمان حضرات کو اس خیال و غرض سے اتفاق ہے انجمن کی ممبری قبول فرمائیں اور اجازت دیں کہ انکا نام انجمن کے ممبروں میں شامل کر لیا جائے بعد کی کارروائیوں سے انہیں بذریعہ رسالہ اتحاد اطلاع دی جایا کرے گی۔ المختصر۔ محمد عبدالحلیم شرر ایڈیٹر اتحاد دو گنداز لکھنؤ گولہ گنج۔

اب آپ جستہ جستہ اردو سے معلے کے معیار اور مضامین و اشعار کی افادیت کا اندازہ کرتے چلیں۔ جلد اول کا تیسرا شمارہ یعنی ستمبر ۱۹۰۳ء کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے

۱۔ اردو شاعری۔ امیر احمد بی اے۔

۲۔ بیاض۔ انتخاب بیاض مولانا فخر الحسن موہانی

۳۔ دوران خون اور ہماری صحت جسمانی۔ لطافت حسین

۴۔ جدید شاعری۔ محمد یعقوب۔

۵۔ حصۂ نظم۔ جس میں۔ شاد عظیم آبادی۔ وفا رامپوری۔ خیال شاہجہانپوری

جلد دوم کا جنوری کا شمارہ یعنی جنوری ۱۹۰۹ء کے عنوانات ملاحظہ ہوں ۔

(۱) تذکرۃ الشعرا (قائم)

(۲) قوم عاد کی تاریخ ۔ محمد علیم ردولوی

(۳) فن طب ۔ حیات الحسن ۔

(۴) موت ۔ سید محمد علی اُمید امیٹھوی

(۵) ریاضی و حالی ۔ از (تنقیہ)

(۶) حصہ نظم ۔ (شاد، حسرت، امید، جلیل، روحی)

قائم کے تذکرے میں حسرت لکھتے ہیں ۔ اور یہ غزل مذکور ہے ؎

بیداد ہو فرہاد سے نسبت مجھے دینا　　آخر یہ جگر کاری ہو وہ کوہ کنی تھی

قائم کا مقطع ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

کہ مقطع دعوے اور غزل اس کا ثبوت اور حقیقت میں قائم کا دعوے بجا زیبا ہے ۔ کیونکہ یہ ان شعرائے قدیم میں سے ہیں جن کے نام ابتدائے غزل طرازی نسبت فخر سے ممتاز ہیں ۔ یہ صاحب کمال چاند پور مضافات سنبھل مراد آباد کے رہنے والے تھے ۔ مگر فن شعر میں کامل تھے ۔ انکا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے ۔ مگر کیا کیجئے قبول عام اور چیز ہے ۔ شہرت نہ پائی جناب آزاد نے ان کے کلام کے متعلق یہ رائے لکھی لیکن راقم الحروف کہتا ہے کہ ان کے مشہور نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے کلام میں مقبول ہونے کی قابلیت نہ تھی بلکہ اس کا کچھ اور ہی سبب ہے ۔ یعنی یہ کہ انھوں نے بہت سے اساتذہ

پھر برسات کے مضمون پر شیکسپیر اینڈ ورڈزورتھ کے خیالات لکھے ہیں اور میرانیس کے
شے سے متعلق خیالات کا جائزہ لیا ہے۔

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی

جدید شاعری کے عنوان کے تحت بھی اردو شاعری پر اعتراضات کے جواب
دئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا الزام تھا کہ نیچرل شاعری کا وجود نہیں اس کے رد میں
لب کے اشعار پیش کئے ہیں ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

نیر کے اشعار لکھے ہیں ؎

رت ہے برسات کی بہت پیاری — موجزن جھیلیں ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — زرد، اودی، سنہری، زنگاری الخ

حصۂ نظم میں حسرت کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بجز طرف حرم کی آرزو کیوں ہو گدا میرا — سر کوئے بتاں تک ہے در پیر مغاں تک ہے؟
کہاں لیلائے بے پروا کا محمل اور کہاں مجنوں — رسائی کب ہے بیت اس کی تو گردِ کارواں تک ہے؟

سی ردیف و قافیہ میں وفا رامپوری کی غزل ہے۔

تر دس تلخ کامی کا رنگ ذوق بیاں تک ہے؟ — جسے دل میں چھپایا تھا رہی کا شمار زباں تک ہے؟
ذرا دل سے تو پوچھو خوف رسوائی کہاں تک ہے — تمہاری یاد رسائی بس تمہارے پاسباں تک ہے؟
کوئی اپنی زباں میں بلبل ہندوستاں ہوگا — مرے مضمون کا چرچا ہے وفا اقلیم جاں تک ہے؟

دھر وہ یار سے دفن پہ میرے ہاتھ رکھے ادھر میں بار احسان سے دبا جاتا ہوں کفن میں
ہ آباد رکھے وہ قاتل میں ہو امن ایسا ہزاروں پاؤں پھیلاتے ہوئے سوتے ہیں کفن میں
پتے ہو جو تم زنار میں تسبیح کے دانے جلیل اچھا ہے، نسخہ جوڑ دو غنچہ دہن میں

عید کے قافیے میں حسرت کا شعر ؎

خاطر غمدیدۂ حسرت ہے محو غم ہنوز کر چکے ہیں بارہا ہم امتحان روز عید

اب آپ جلد سوم یعنی ۱۹۰۷ء کے شمارہ نمبر ۵ اور ۶ کے عنوانات ملاحظہ کرتے چلیں، جن سے رسالہ کی افادیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) رند — از امیر احمد علوی بی اے
(۲) تقریر و تحریر کا ڈھنگ — مقتدا خاں
(۳) مسلمان اور کانگریس
(۴) تنقید و ریویو۔
(۵) جیل کی سرگذشت — از ریاض خیرآبادی
(۶) حصہ نظم (داغ، قمر، شفق عمادپوری۔ احسن مارہروی، وہبی، اثر وغیرہ)

پہلا عنوان سید محمد خاں رند کے تذکرہ میں ہے۔ منشی امیر احمد نے لکھا ہے
"با بلند مرتبہ، دلکش، دلچسپ سوسائٹی میں انھوں نے پرورش پائی یہ اسی فیض تھا کہ جو دور طفلی ہی سے شعر و سخن پر مائل تھے۔ اور ہوش سنبھالتے ہی بات اتفاقاً نہ یاد کرنے۔ انکو سمجھنے اور ان سے لطف پانے لگے تھے۔"

غرض اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں شاعری کا جو طرز پسند کیا جاتا ہے

قدیم کی مانند مشغلۂ سخن کو ایک مشغلہ لطف کے طور اختیار کیا تھا، بحیثیت ایک فن کے۔ "جب فن نہ سمجھا تو انھوں نے دوسروں کو شاگرد بھی کم بنایا اور جب شاگرد کم ہوئے تو شہرت بھی کم ہوئی۔" قائم کے مرتبہ پہ تبصرہ کرتے ہوئے حسرت لکھتے ہیں: "راقم حروف کی بھی یہی رائے ہے کہ اگر قائم سودا کے برابر ہیں تو ان سے کچھ بہت نیچے بھی نہیں ہے۔ یہ رائے سودا کی کوشش اصلاح زبان اور ان کے فیض شخص کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے ورنہ استادی سے قطع نظر کرکے قائم کی شاعری سودا کی شاعری کے برابر ضرور ہے۔"

ریاض و حالی کے عنوان کے تحت مذکور ہے: "ریاض الاخبار میں حکیم برہم صاحب کی جانب سے مولانا حالی کے کلام پر چند بجا اعتراض کئے گئے تھے جن کی بنا پر پیسہ اخبار کے ایک نامہ نگار صاحب کو اس قدر غصہ آیا کہ انھوں نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۳ء کے پرچے میں ۴ صفحوں کا ایک مضمون مع بقیہ آئندہ کے شائع کیا ہے۔ یہ مضمون جس لہجہ میں لکھا گیا ہے وہی اس امر کا ثبوت ہے کہ ریاض الاخبار نے چونکہ سچی بات کہی تھی اس لئے وہ 'مریدان حالی' کو حد سے زیادہ ناگوار گزری، اور انھوں نے دفع اعتراض برہم کے بجائے حضرت ریاض کی شاعری پر خواہ مخواہ بیجا حملے کرکے اپنے دل کا بخار نکالنا چاہا۔"

حصہ نظم میں شاد کے چند شعر قابل ذکر ہیں ؎

ہم پیشہ حسن اور ہوا عشق کرشمہ ساز کا — شکوہ کریں کیا کریں جان بہانہ باز کا

ہجر میں جو ہوا ہمیں اب اسکا ذکر کیا — لب ہلانا منع ہے تجھ سے امین راز کا

جلیل کے اشعار ؎

(۳) ڈیش، واوین، بند، وقفوں کا استعمال ۔

تنقید کے زیر عنوان حسرت نے اقبال کے ایک لکچر قومی زندگی مطبوعہ مخزن لاہور پر تنقید کی ہے۔ "شرائط تبدیل ہو گئیں" کی جگہ "ہو گئے" چاہیئے (۲) کیا موجودہ انسان ابتدا سے ہی ایسا تھا (۳) "ابتدا ہی" سے چاہیئے (۴) "پرواہ" کو "پرداہ" لکھا ہے ـــ وغیرہ

حصہ نظم میں داغ کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خود ہی مجھے بلا کے پھر بات بھی نہ پوچھی   وہ انجمن میں اپنا مہمان کر کے بھولے

مقطع ہے ؎

اے داغ اپنا احسان رکھے گا یار تا کے   وہ اور میری مشکل آسان کر کے بھولے

مولانا شفق عماد پوری کے اشعار ؎

وہ سوختہ قسمت ہوں کہ شاخِ گل تر پر   بیٹھا بھی نہ تھا کہ گری برق چمن میں
وہ ذرہ ہوں ڈھونڈا جو نکیرین نے مجھ کو   جز تار کفن کچھ نہ ملا خاک کفن میں

جلد ۳ کا آخری شمارہ یعنی دسمبر ۱۹۴۳ء کے قابل قدر عنوانات دیکھئے!

(۱) دمشق ۔ حیات الحسن موہانی
(۲) مسلمان اور پالیٹکس ۔ ترجمہ ہندوستان ریویو۔
(۳) براہین ثلاثہ   شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی
(۴) املائے اردو   شاد عظیم آبادی
(۵) مسلمان اور کانگریس   نظامی کبیر الدین بیرسٹر ایٹ لا بمبئی

اس کے دیکھتے ہوئے آتش کے شاگردوں میں رند کا نمبر اول ہے اور اگر اس کو فوق استاد کہیں تو بیجا نہیں۔ چند اشعار ؎

مدت ہوئی نہیں دیکھا دلدار کو یا رب | تدبیر کچھ نہیں بنتی کیا موت ہے علامت ہے
کیا کہتا ہے ہر بار تجھے قتل کروں گا | اک جان ہے میری اسے تو لے کہ خدا لے
تاب نظارۂ دیدار نہ لاؤ گے کلیم! | پردے پڑ جائیں گے آنکھوں پہ جو پڑی نظر
بن پڑا کچھ نہ علاج تپ فرقت اس سے | ہاتھ دل کو مرے بالیں سے مسیحا اٹھا
ضعف سے کہتے ہیں سینے سے لبوں تک آتے | سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اٹھا
یہ بھی احسان ہے تیرا جو دیا دوزخ بھی | میرے اعمال کی تو یہ بھی مکافات نہ تھی

تقریر و تحریر کے ڈھنگ میں مقتدا خاں نے تحریر کیا ہے۔ انسان اور قوت گویائی کی خلقت کی تاریخ بالکل ایک ہے آدم کا سب سے پہلا کلام خدا تعالیٰ کے ساتھ تھا۔ تقریر و تحریر کا ڈھنگ جاننے کے لئے ہمارا پہلا اصول یہ ہے کہ جو کچھ تم کہنا چاہو پہلے خود اسے خوب سمجھ لو۔ دوسرا اصول یہ ہے اسے کہہ ڈالو۔ تیسرے اور ہمیشہ اپنی ہی زبان استعمال کرو۔ "لمبے لفظ سے چھوٹا اچھا ہے۔"

مسلمان اور کانگریس کے تحت مندرج ہے:۔ ہم نے ماہ ستمبر [illegible]ء میں اس مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی اور ثابت کیا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ اور حق شناس مسلمان کو مقاصد کانگریس سے اختلاف رکھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ مسلمانوں کے روز افزوں جوش۔ روشن خیالی۔ تعلیم یافتگی اور واقفیت کے مقابلہ میں کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی کمی تعداد اور کمیشن وغیرہ کی بزدلی کا ذکر کرنا ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسا کہ نورنجار د توپوں کے مقابلہ میں

اور احمد آباد میں نواب زادہ نصر اللہ خاں نے اپنے حقوق طلب کرنے کے لئے انجمنیں قائم کیں، کیا معاذ اللہ یہ سب کے سب باغی ہیں! اگر یہ لوگ باغی نہیں تو کانگریس والے کیوں باغی ہیں؟ اور کانگریس کے تمام اعتراضات کے جوابات اسی انداز سے دیتے چلے گئے ہیں۔

حصہ نظم میں شاد کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جو ۲۵ اشعار کی طویل غزل ہے ؎

بہت سے تنکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی

وہ اٹھی اٹھی نگاہ ان کی جھکی ہوئی پردۂ حیا میں
اس سے دل چھین لیں گے سب کے یہی نشانِ جاں ستاں رہے گی

گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر بجز خموشی کے دم نہ مارا
شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی

ہزار کھنچ کر جدا ہو ہم سے ہزار دامن بچا ہو میرے تیرے
جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے ترے درمیاں رہے گی

جلیل کے اشعار ؎

میں شکر عنایات سے غافل نہیں قاتل ہر تیر پہ اک آہ نکلتی ہے جگر سے
دربارِ محبت کے ہیں آداب نرالے آتے ہیں یہاں لوگ کفن باندھ کے سر سے

شفق کے دو شعر ؎

موجِ دریا تک نہیں آزاد قیدِ عشق سے طوق گردن میں پڑا ہے حلقۂ گرداب کا

(۶) حصۂ نظم، دشاد عظیم آبادی۔ جلیل۔ شفق عماد پوری۔ مرشد، سوا لکھنوی)

• دمشق کے تحت سفرنامہ ابن بطوطہ کے ایک باب کا ترجمہ شائع ہوا ہے
مسلمان اور پالیٹکس کے اندر مسلمانوں کے زوال کا سبب سیاست سے علیحدگی
بتایا ہے، ایک تراشہ ملاحظہ ہو: — میرا روئے سخن مسلمانان ہند کی جانب
ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے ملکی معاملات سے کیوں اس قدر بے خبر ہیں؟
اور انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت پر کیوں تلے ہوئے ہیں"؟ اور آگے لکھا
ان کا یہ فعل (یہ مخالفت) دانشمندی اور دور اندیشی کے سراسر خلاف ہے
ہر ایک ہندوستانی کا اہم ترین فرض اور پہلا فرض۔ ہندوستان کے لئے اچھی
گورنمنٹ حاصل کرنا ہے۔ اور انڈین نیشنل کانگریس کا بالکل یہی مقصد ہے؛
شرم! اے مسلمانان ہند اگر تم ایک ایسے گروہ کا ساتھ نہ دو۔ شرم! اے
مسلمانان ہند! اگر تم کانگریس کے پاک مقاصد اور شریفانہ آرزوؤں کو حقارت
کی نظر سے دیکھو، شرم! اے مسلمانان ہند! اگر تم حب الوطنی کے طریقوں کو
چھوڑ دو۔"

"مسلمان اور کانگریس" کے زیر عنوان "قاضی کبیر الدین نے لکھا تھا، کیا
گورنمنٹ سے اپنی حاجتیں اور حقوق مانگنا داخل بغاوت ہے؟ کیا گورنمنٹ
سے مانگنے میں غرور پایا جاتا ہو یا نہ مانگنے میں؟ کیا ہم گورنمنٹ سے کچھ نہیں مانگتے؟
کیا سرسید احمد خاں مرحوم اپنے حقوق گورنمنٹ سے طلب نہیں کرتے تھے؟ کیا
انھوں نے اس کام کے لئے ایک ایسوسی ایشن نہیں قائم کی تھی۔ جو آخر میں چل
چلا نہ سکی اور پھر جو ختم ہو گئی، کیا اب ممالک شمالی و مغربی میں نواب وقار الملک

پسندیدہ اشعار

محمود نقوی

جب سے تو مدعائے شوق ہوا　　پھر کوئی اور مدعا نہ رہا
آپ کو اب ہوئی قدر وفا　　جبکہ میں لائق جفا نہ رہا

کس قدر سبز و تر ہو کشت خیال　　گریہ انتظار سے شاداب

وہ بگڑے بہت بدگمانی کے باعث　　نہ تڑپے جو ہم ناتوانی کے باعث

عشق کی روح پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر
جان کو محو غم بنا دل کو وفا　　کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر
غمزۂ دل فریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکر ناز حسن پہ رنگ حیا زیاد کر

ہے ہجر بھی وصال زہے خوبیٔ خیال　　بیٹھے ہیں انجمن میں تری انجمن سے دور
پھرتی رہتی ہے آدمی کو لئے　　خوار، دنیا میں، آدمی کو ہوس

ابر دریا بار ہے ہر قطرۂ اشک رواں — ہوتا خوش منظر ہے نالہ دل بیتاب کا

رسوا کی غزل ہے ؎

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ناز و کرشمہ کیا ہے
قتل کی اپنے بتادوں تمہیں ادائیں کیونکر
وصل کی رات ہے پہلے یہ بتا دو ہم کو
تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیونکر
نہ سہی عشق مروت بھی ہے آخر کوئی شے
رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

آخری شعر پر سر دھنیے — داد دیجئے — یہ تھا اردوئے معلیٰ کے دور اول کا مختصر جائزہ ورنہ بعد کے رسائل میں قسم قسم کے جواہرات اور نوادرات کا خزینہ ہوتا تھا — ع

دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

صحنِ گلستاں

محمود عشقی

گزر بھی گیا وہ تو لہرا کے داماں
دکھاتا رہا پھر بھی صحنِ گلستاں

چمکتی رہی مانگ میں تیری افشاں
میں سمجھا شبِ ہجر ہے مجھ پہ خنداں

میں خود ہی لگاتا ہوں غم کو گلے سے
مرا حال ہے حالِ زلفِ پریشاں

تم آتے، سہانا سا منظر دکھاتا
شبِ ہجر تھے زخمِ دل کے غزلخواں

تمہارے اشارے پہ چلنا پڑا ہے
ستم ہے کہ محکوم انساں کا انساں

سفینہ ہمارا جو لہرا کے نکلا
رہا دیر تک خود بھی سکتے میں طوفاں

جو پاسِ حیا چپ رہے وہ تو کیا غم
زمانہ ہے تیرا تو عشقی ثنا خواں

دیکھ لیں شمع کو تاثیرِ وفا کے منکر
جل بجھی خود بھی جلایا تھا جو پروانے کو

مرے اصرارِ مضطر میں پنہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے تیرا انکار پیدا ہے

بیکار ڈراتے ہیں سب مجھے قیدِ ستم سے
واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی

ترے خیال سے باتیں ہزار ہم کرتے
غمِ فراق کو کیوں تو گوارا ہم کرتے

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
تری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

دیکھ اے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت میں
بنتے ہیں بدشوار وہ مٹتے ہیں بہ آسانی

بڑے عذاب میں ہے جانِ میکشاں ساقی
نہیں شراب تو ذکرِ شراب رہنے دے

بھلا پھولا رہے گلزار یارب حسن وخوباں کا
مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی۔

کلی مرجھا گئی

(افسانہ) ——— نسیم بستوی

دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے مہ جبین کی جھیل کی طرح حسین آنکھیں تھک گئیں۔ وہ خدا جانے ان خلاؤں میں کیا ڈھونڈھ رہی تھی کسی کو بھی خبر نہیں تھی ——— اس حالت پر اس کی زندگی کے سیکڑوں لیل ونہار نہایت خاموشی کے ساتھ گزر گئے۔ اس کے باپ نے ایک مہلک بیماری میں گرفتار ہو کر چارپائی پکڑلی تھی۔ معاشی حالت کی رفتار نہایت سست تھی۔ چھوٹا بھائی بھی خود ماں باپ کے ناتواں کندھوں کا بوجھ بنا ہوا تھا۔

اچانک مہ جبین کے گلشن حیات میں بہار کی رعنائیاں داخل ہو گئیں۔ ارمان بھرے دل کی آرزوؤں نے احساس کے تاروں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ حسن و شباب کے سرور آ گئیں تقاضوں نے زندگی کا ایک نیا باب کھول کر نگاہوں کے سامنے کر دیا ——— لیکن مہ جبین اپنی جگہ پر خاموش سوچ رہی تھی . . . !

" کیا یہ عہد بہار ہے جس نے زندگی و مسرت دینے کے بجائے اس کی رگوں کا بچا کھچا خون بھی نچوڑ لیا۔ فکر والم کی تاریکیاں اپنے نقطۂ عروج سے

شوق سجدہ

حسین ریحانی

ہمارے دل سے اے ساقی زباں تک بات آ پہنچی
کہاں سے تشنہ کامی میں کہاں تک بات آ پہنچی

نہ جانے شوق سجدہ میں کہاں میں سر جھکا دیتا
خدا کا شکر تیرے آستاں تک بات آ پہنچی

سمجھ کر کیا جلایا تھا نشیمن تو نے اے صیاد
اٹھا اب دام اپنا گلستاں تک بات آ پہنچی

خدا جانے انھیں کیا دشمن سمانی باتوں میں
سر محفل ہماری داستاں تک بات آ پہنچی

نہ کوئی کر سکا تفسیر ان کے حسن رنگیں کی
غزالی کے قلم سے "بوستاں" تک بات آ پہنچی

ترے وارفتگان قامت و گیسو جہاں پہنچے
وہاں دار و رسن کے امتحاں تک بات آ پہنچی

بہار آنے سے بھی رنگ چمن بدلا نہ ریحانی
گلوں کی آہ ذرہی میں خزاں تک بات آ پہنچی

— لیکن ممتا کو سکون نصیب نہیں ہوا "نہیں بیٹی تو چھپا رہی ہے" بوڑھی ماں نے روتے ہوئے کہا— "تمہارے سر کی قسم ماں! کوئی ایسی ویسی بات نہیں یوں ہی بیٹھے بیٹھے ابا جان کی طویل بیماری سے دل بھر آیا تھا جس سے آنکھوں میں آنسو آگئے" مہ جبین نے ماں کو مطمئن کرتے ہوئے کہا— "اچھا تو پھر کوئی بھی نہیں کی رٹ کیوں لگا رکھی تھی" ماں نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مہ جبین ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولی "وہ یونہی میری زبان سے نکل گیا تھا— اس سے بوڑھی تجربہ کار سعیدہ کو تسلی تو نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی سب کچھ سمجھ کر وہ خوب جانتی تھی کہ مہ جبین پر کیا گزرتی ہوگی اس ویران گھر میں جہاں دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی مشکل ہے گھر کے چھوٹے بڑے سامان اور زیورات بک بکا کر شکور کی بھیانک بیماری کے نذر ہو چکے تھے۔ اب صرف خالی خالی سنسان گھر پڑا ہے جس کے در و دیوار سے حسرت و یاس ٹپک رہی ہے۔ جس کی بے رونق فضاؤں میں شور ماتم گونج رہا ہے۔ صرف ایک کرایہ کے مکان سے ۲۵ روپے ماہوار ملتے ہیں مگر ان میں سے زیادہ روپے بیمار شکور کے دوا علاج میں صرف ہو جاتے ہیں ننھا رشید یتیم خانہ میں تعلیم پا رہا ہے وہ باپ کی موجودگی میں بھی یتیموں سے کہیں بدتر غمناک زندگی بسر کر رہا ہے۔

ادھر محلے کے لفنگوں کا سرغنہ زاہد اپنے ساتھیوں کلو، نیاز، عاقل اور قدرت سے مل کر ایک خطرناک سازش کر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بجے یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوئے زاہد نیاز کی گردن میں اپنا ہاتھ ڈال کر سرگوشی

ہم کنار ہیں۔۔ کسی جانب بھی تو روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دم گھٹ رہا ہے۔ اُف توبہ! یہاں پہونچکر وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑانے لگی، نہیں نہیں یہ عہد بہار نہیں فصل خزاں ہے جس کی آتشیں ہواؤں نے آرزو کے پھولوں کو جلا کر خاکستر بنا دیا ہے۔ جذبات کی حرارت پر جیسے کسی نے برف کی سل رکھدی ہو۔ فکر دالم کی پیہم یلغار نے زندگی کے تار و پود کو۔ بکھیر کر رکھدیا ہے۔ آہ اتنی وسیع دنیا میں کوئی بھی تو اس کے اندرونی جذبات و احساسات سے باخبر نہیں ہے۔۔ کوئی ایسا ناخدا نظر نہیں آتا جو شکستہ سفینۂ حیات بھیانک طوفان سے بچا کر ساحل سے ہم آغوش کردے۔ کہ غم کے انگاروں پر تڑپتی ہوئی لاشوں کو نکالنے والا کون ہے؟!۔۔ کوئی بھی نہیں! کوئی نہیں!! کوئی۔۔۔!!!

مہ جبین کی دل خراش آواز دھیرے دھیرے بلند ہو کر سارے گھر میں پھیل گئی یہ آواز جس جس کے کانوں سے ٹکرائی آشفتگی و سراسیمگی کی حالت میں ہڑبڑا کر اس کی طرف دوڑ پڑا۔ اباجی جو سب سے بھی زیادہ مجبور و لاچار بڈھا شکور اپنی لاٹھی کے سہارے چارپائی سے کھڑا ہو کر ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دیکھنے لگا مغموم سیدہ بیٹی کی آواز پہچان کر اس کی طرف لپکی۔ مہ جبین کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ یاس زدہ چہرہ پر غم کی اندوہناک تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں ۔۔۔ اس منظر کو دیکھ کر ماں کی ممتا تڑپ اٹھی اضطراری حالت میں مہ جبین کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا پھر بولی۔

"کیا ہوا بیٹی ۔۔۔۔۔ مہ جبیں بول! نصیب دشمناں تجھے کیا ہوگیا ہے؟"

مہ جبین نے سسکیوں کے درمیان کہا "کچھ بھی تو نہیں اماں! میں بالکل اچھی ہوں

تھر تھر کانپ رہی تھی۔ عمران اس کی یہ حالت دیکھ کر غصہ سے بے تاب ہو کر بولا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ کن بدمعاش کمینوں کی ذلیل حرکت ہے.... صبح ہونے دو میں ان بدمعاش انسانوں کو بتا دوں گا کہ ایک غریب کی آبروریزی کا ارادہ ان کو صرف ذلیل و رسوا ہی نہیں۔ بلکہ تباہی و بربادی کے بھیانک غار میں پہونچا دے گا ــــ اگر ان کی یہی ذلیل حرکتیں ہیں تو اس محلہ میں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی!!

ایک ٹھیکیدار صاحب نے زہد و تقویٰ بگھارتے ہوئے کہا ــ شکور ہم لوگوں کی عزت بھی خاک میں ملائے گا۔ یہ بے غیرت لڑکی کی کہیں شادی کیوں نہیں کر دیتا ــ نوجوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھنا کون سی عقلمندی کی بات ہے۔ گھر کے سامنے جب بیر کا پیڑ لگایا ہے تو اس میں آنے جانے والوں کا دامن کسی نہ کسی دن ضرور الجھ کر رہے گا۔

ایک دوسرے صاحب بولے ــــ اجی صاحب! شادی کر دے گا تو روٹی کیسے ملے گی..... عمران ان کی اس بدگمانی پر گرجا ــ چپ رہو تم لوگ ان پیشہ ور ذلیل غنڈوں سے بھی بدتر ہو جو کھلے بندوں ایک پاکباز کے دامن عفت پر بدنما داغ لگا رہے ہو ــ جاؤ پہلے اپنے گھر کی خرابیاں دور کرو۔ کیا تم اپنی اس لایعنی بات کا ثبوت دے سکتے ہو ــ نہیں! نہیں!! تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکتے صرف کسی کو بدنام کرنا آتا ہے ــــ عمران کی ان باتوں سے سارا ہجوم دیکھتے دیکھتے کائی کی طرح چھٹ گیا۔ بوڑھا شکور اپنی آنکھوں میں اشکوں کا طوفان لئے ہوئے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس

کے انداز میں کہنے لگا۔ "دیکھو یارو اب دیر کرنا ٹھیک نہیں بس اس وقت چلو اور مہ جبین کو اس حکمت سے قبضہ میں کر لو کہ اس کے گھر والوں کو ہلکی سی آہٹ بھی محسوس نہ ہو اور اگر کسی نے خبر پا کر کچھ مزاحمت بھی کی تو اس کو وہیں ڈھیر کر دو۔" پھر ایک کے ہونٹوں پہ شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی اسی اسی حالت میں سب اپنی جگہ سے اٹھ کر مہ جبین کے مکان کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔ افلاس و عسرت کے مارے ہوئے انسانوں کی آنکھوں سے نیند بھی غائب ہو جاتی ہے۔۔۔ رات کے ۱۲ بجے بھی مہ جبین کے ویران گھر میں ایک ہلکی جھلکی روشنی میں جلنے والا چراغ گھر کی دبیز تاریکیوں کا دامن تار تار کر دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔۔۔ شکور چھت پر نگاہیں گاڑے ہوئے بہت دور ماضی کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔۔۔ سعیدہ کو اپنے پچھلے زمانے کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔۔۔ رشید خدا جانے کیوں بار بار بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔۔۔ غریب مہ جبین اوندھے منہ ٹوٹی چارپائی پر پڑی ہوئی اپنی بے رونق زندگی کی صبح و شام پر خون کے آنسو بہا رہی تھی جسے میلا کچیلا تکیہ اپنے اندر جذب کرتا جا رہا تھا۔۔۔ اتنے میں اسے ایک طرف سے کچھ آہٹ محسوس ہوئی پھر چند لمحوں کے بعد چند انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی مہ جبین مارے خوف کے کانپ اٹھی اور زور سے چیخنا شروع کر دیا: "چور! چور!"

آواز گھر کی چار دیواری سے پھلانگ کر آس پاس کے گھروں میں پہنچ گئی اور دیکھتے دیکھتے لوگوں کا ایک ہجوم سا ہو گیا۔۔۔ مہ جبین اب بھی

ان کی کوئی بات بھی نہیں سنی چند لمحے کھڑا رہ کر نہایت بد اخلاقی کا مظاہرہ
نے ہوئے اس کی جانب سے منہ پھیر کر گھر میں چلا گیا— عمران کی طرف
ے خیال بدلے کر... عمران کو اس کا شدت کے ساتھ احساس ہوا مگر وہ
ن غنڈوں (جن سے محلہ کے تمام رہنے والے لرزتے تھے) سے ذرا بھی مرعوب
ہونے والا انسان نہیں تھا — آج اس نے عزم مصمم کر لیا تھا کہ خواہ
س سلسلہ میں اسے جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے لیکن جیتے جی
جبین کے دامن عفت پر کوئی ہلکا سا داغ بھی نہیں آنے دے گا —
یا سمجھ رکھا ہے ان کمینوں نے ان کی ساری شیطنت خاک میں ملادوں گا
علوم ہوتا ہے ابھی کسی مرد سے پالا نہیں پڑا ہے ان کو..... دوسرے
ن رات میں عمران اپنی دوکان بند کرکے آرہا تھا راستے میں ایسی جگہ جہا
اس وقت سڑک سنسان پڑی تھی یکایک اس پر ڈنڈوں کی بارش
نے لگی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو زاہد نیازی اور قدرت تینوں
معاش ڈٹے ہوئے ہیں اس کی جان لینے کے لئے — زاہد بری طرح
!لیاں بک بک کر دل کی بھڑاس نکال رہا تھا— "سالہ بڑا آیا ہمدردی
سانے کے لئے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تجھے تنکور کی چھوکری سے
ت ہے۔ اپنا گھر نہیں دیکھتا کہ بڈھا کھوسٹ باپ دن رات رنڈیوں کے
لا خانوں پر شراب پی کر پڑا رہتا ہے"— بیچارا سب کچھ سنتا رہا مار
کھاتا رہا یہاں تک کہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا غنڈے اس کو مار پیٹ کر
رار ہو گئے......!

کو تسلی دیتے ہوئے واپس اپنے گھر جا رہا تھا!

رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ جبین یوں ہی چارپائی سے ٹیک لگا کر سوچ رہی تھی۔ کتنے ظالم ہیں۔ اس زمانے کی انسان۔ اف! الٰہی توبہ!! ؎

کتنے گلشن ہیں پھولوں سے ویران ابھی کتنے انسان ہیں غم سے پریشاں ابھی
راز کتنے ہیں سینوں میں پنہاں ابھی کتنے دل ہیں گرفتار طوفان ابھی

زندگی کے تقاضوں سے محروم ہیں
زندہ رہ کر بھی دنیا سے معدوم ہیں

سنتے ہیں کہ آزادی کی بہار آ گئی ہے۔ لیکن اے میرے پروردگار یہ آزادی کے لیل و نہار، یہ مسرت کے شام و سحر کیسے ہیں کہ ابھی تک غریبوں کے زخموں سے خون رس رہا ہے۔ ان کے احساس پر روٹی کپڑے کا سوال اب بھی کچو کے لگا رہا ہے ؎

بہار تو آ گئی چمن میں مگر ابھی منتظر ہیں آنکھیں
گلوں کے چہرے نہیں گے رنگ حیات سے نور بار کب تک

پھر یکایک اس کے پردۂ تصور پر عمران کی ہمدرد و غم گسار بھولی بھالی صورت کہکشاں کی طرح جگمگا اٹھی ساتھ ہی اس کی تسلی بخش گفتگو بھی یاد آ گئی۔ ہاں یہی وہی ایک شخص ہے جس نے اپنی انسانیت کا کچھ ثبوت دیا ورنہ سب انسان نہیں درندے ہیں! حد درجہ سنگدل و ظالم۔۔۔۔!!

عمران رات کے واقعہ سے متاثر تھا ہی صبح کے وقت وہ زاہد کے گھر گیا اور اسے نرمی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن زاہد نے

ہے اس کا ؟! مہ جبین تیخ میں بول پڑی "عمران"! اس کے بعد سعیدہ نے کہا
س کو محلے کے غنڈوں نے راہ میں کہیں تنہا پا کر بڑی طرح مار اپیٹا تھا سنا
ہے وہ آج ہسپتال سے واپس آیا ہے خدا رکھے اپنے باپ سے بالکل جداگانہ
بیعت پائی ہے اس نے۔"

مہ جبین کو اس خبر سے بڑا دکھ ہوا وہ اپنے تاثرات ماں کے سامنے
چھپانے میں تو قریب قریب کامیاب ہو گئی لیکن ماں سے جدا ہوتے ہی تنہائی
میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ پڑے وہ شاید دل
ہی دل میں عمران کی پرستش کرنے لگی تھی ــــ اس کے نرم و نازک حساس
دل کی دھڑکنوں میں عمران کی یاد ہلکے بس گئی تھی ــــ ذہن کے اُفق پر
صرف عمران کی صورت کہکشاں کی طرح جگمگا رہی تھی وہ عمران کو اپنی زندگی
کا خدا جانے کیوں ابھی سے مالک سمجھنے لگی تھی پاگل کہیں کی ......!

"بڑا بے غیرت ہے تو بھی نیاز" زاہد نے مشتعل کرنے کے انداز میں کہا۔
نیاز نے حیرت سے پوچھا "کیسی بے غیرتی یار کچھ صاف صاف کہے گا
یا یوں ہی اشارے اشارے میں بکو اس کئے جائے گا" زاہد بولا ــــ
ارے وہ سالا جولاہوں کا دادا بنا گھومتا ہے سنا ہے اس چھوکری کو اپنی
راہ پر لگانے کی کوشش کر رہا ہے ــــ" نیاز غصہ سے لال پیلا ہو کر بولا
لگا دو سالے کے گھر میں آگ وہ بھی یاد کرے گی کہ اسی عشق کا سودا
بڑا مہنگا ہوتا ہے ایک مکدمہ (مقدمہ) تو چل ہی رہا ہے دوسرا بھی چل
جائے گا۔ اور کیا ہو گا ــــ زاہد نے نیاز کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

صبح کے اخبار میں اس خبر پر عمران کے محلہ والوں کی نظر جم کر رہ گئی۔ کہ گزشتہ رات میں ایک شخص جو اپنا نام عمران بتاتا ہے اور محلہ کا وزیرآباد بیہوشی کی حالت میں بنی روڈ پر پایا گیا ہے اس کے جسم پر کئی زخموں کی تازہ گہرے نشان موجود ہیں۔ اس کے بیان دینے کے مطابق اس کے محلہ کے تین غنڈوں زاہد، نیاز، اور قدرت کو پولیس تلاش کر رہی ہے!

جب یہ اندوہناک خبر عمران کے ماں باپ اور بھائیوں تک پہ تو سب پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے اس اسپتال پہونچے جہاں عمران زخم کی ٹیس سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ دولت مند باپ نے بیٹے کی صحت کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا —— عمران ایک ہفتے کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور دوسرے ہفتہ تک اسے مکمل صحت ہو گئی .....!

زاہد، نیاز اور قدرت موقع واردات سے بھاگ کر اسی رات بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن ہوشیار سی، آئی، ڈی پولیس نے انھیں چین سے نہیں رہنے دیا اور ایک ماہ کے اندر اندر وہاں سے گرفتار ہو کر اپنے شہر واپس آئے۔ عمران کا ان کے متعلق بیان ہو ہی چکا تھا وہ سب آتے ہی حوالات میں بھیج دیئے گئے پھر کسی نہ کسی طرح ان کی ضمانت منظور ہو جانے کے بعد مقدمہ چلنے لگا۔

بیٹی! تو نے کچھ سنا بڑا غضب ہو گیا —— کیا ہوا اماں! مہ جبین نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ وہ جو اس رات میں ایک بھولا بھالا لڑکا کیا نام

صبح ایک سڑک پر زاہد کی لاش اور مہ جبین زخموں سے نڈھال پائی گئی .... دونوں کو پولیس نے ہسپتال میں پہونچایا جہاں مہ جبین کو ہوش میں لانے کی کوشش ہونے لگی۔ عمران امید و بیم کے تاثرات لئے ہوئے نہایت مضطرب ہو کر مہ جبین کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا ـــ ایک گھنٹہ کے بعد دل خراش آہ کے ساتھ مہ جبین نے آنکھ کھولی تو اس کی پہلی نگاہ عمران پر پڑی۔ عمران کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھل گیا اور رگوں میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی ..... لیکن پھر چند لمحوں کے بعد اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ نہایت نحیف آواز میں عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ

اچھا عمران! خدا ..... حافظ ...... باہر خزاں کی تیز و تند ہوائیں چل رہی تھیں جن کی آتشیں لہروں سے پھول پژمردہ اور کلیاں مرجھا رہی تھیں ـــ عمران خون جگر جلا جلا کر دن رات ایک کہانی صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہے جس کا عنوان اس نے رکھا ہے "کلی مرجھا گئی"۔ اور اس کے نیچے کسی شاعر کا مشہور شعر نہایت واضح خطوط میں درج ہے ـــ

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سامان رشتہ باقی امیرے بہادر مردوں کی یہی سامان رشتہ باقی ہوتی ہے۔

آنے والی رات کے دس بجے غریب مہ جبین کا ٹوٹا پھوٹا مکان شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ بوڑھا شکور اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑا ہوا یہ منظر دیکھ کر اپنی جگہ تڑپنے لگا کمزوری کے باعث حرکت کرنے کی قوت بھی سلب ہو چکی تھی ـــ اس کی بوڑھی بیوی اپنی بیٹی کی طرف بھاگی اور جب مہ جبین کی چارپائی پر نگاہ ڈالی تو اس کی رگوں کا خون خشک ہو گیا ـــ ایک تری ہیکل آدمی اس کی بیٹی کو اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے پچھلی دیوار سے کودنے کی کوشش کر رہا تھا مہ جبین اس سے رہائی حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں، پیروں کو نہایت تیزی سے ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ سعیدہ چیخی مگر اس کی آواز جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کے بعد وہ دیوار کی طرف لپکی لیکن دوسرے لمحے زاہد کے چھلانگ لگانے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

جب سارا مکان قریب جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا تو محلہ والے ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوئے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ عمران بھی وہاں پہونچ گیا اور چند لمحوں کے بعد آگ بجھانے والی موٹر بھی مگر اب اس کا کوئی کام بھی نہیں رہ گیا تھا ـــ مکان کے اندر تلاش کرنے پر صرف تین چھوٹی بڑی جلی ہوئی لاشیں ہاتھ آ سکیں جو ہزار کوشش کے بعد بھی پہچان میں نہیں آ سکیں ـــ عمران کی نگاہیں ادھر ادھر مہ جبین کو تلاش کر رہی تھیں نہ جانے کیوں اسے مہ جبین کے جلنے کا یقین نہیں آ رہا تھا

یکم دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء سے ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء تک

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کے شائع کردہ ناولوں میں

پانچ آنہ فی روپیہ اور کرایہ ڈاک کی رعایت

نئے سال کی خوشی میں ذمہ داران ادارۂ فروغ اردو نے طے کیا ہے کہ وہ اپنے مطبوعہ ناولوں پر پانچ آنہ فی روپیہ کمیشن دے اور ڈاک خرچ بھی اپنے ذمہ لے۔ اسلئے آپ ماہنامہ کے آخر میں درج شدہ ناولوں کے آرڈر دیکر اس عظیم الشان رعایت سے فائدہ اٹھائیے۔ اس رعایت سے خاطر خواہ فائدہ خریداران ماہنامہ فروغ اردو بھی اٹھا سکتے ہیں

"منیجر"

قصائد مومن مع شرح اردو

نظیر احمد صدیقی کا تازہ ترین ادبی کارنامہ جلد ملاحظہ فرمائیے

قیمت فی جلد چار روپیہ آٹھ آنہ للعہ

ملنے کا پتہ۔ ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ

ہماری چند جدید شایع کردہ کتابیں

نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز کی نادر تحقیقات کا مجموعہ جو برسہا برس کی عرق ریزیوں کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت: ۲عار

قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی دہلی کالج دہلی کسی تعارف کے محتاج نہیں انھوں نے بڑی محنت اور کد و کاوش کے بعد قصائد مومن کی شرح عام فہم زبان میں کردی ہے کہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت للعہ

ادبی نقوش شاہ معین الدین ندوی، رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ کی وہ ادبی تنقیدی۔ علمی نگارشات جن کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے لائبریری کے لئے اس کی زینت بنانا ضروری ہے قیمت ۵

الفت آنجہانی خان محبوب طرزی کی زندگی کی آخری پیش کش جو کہ بقول ناول نگار نہایت ہی دلچسپ اور درد ماں سے بھرپور ہے۔ جلد خریدیئے۔ قیمت: پانچ روپیہ آٹھ آنہ (۵٫۸)

حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی کی تازہ ترین ناول جو کہ گوناگوں خوبیوں اور دلچسپیوں کے لحاظ سے بڑی ہی عجیب ناول ہے قیمت للعہ

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اُردو امین آباد پارک لکھنؤ

مجذوب ورا کا کلام رضا انصاری [illegible]

دہلی کا یادگار مشاعرہ " [illegible]

ہندی کے مسلمان شعراء نورانی ۱۲/

شبلی کی تصانیف

دستہ گل فارسی کلام منظوم ۶/

برگ گل " " ۶/

بوئے گل " " ۶/

شعر العجم (کامل) [illegible]

خلاصہ

خلاصہ روح تنقید ۱۲/

" حیات جاوید [illegible]

" قواعد اردو [illegible]

اردو عروض یعنی خلاصہ جواہر العروض [illegible]

شمع و شاعر ۳/

خضر راہ مع ترجمہ [illegible]

ناولیں

حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی کا [illegible]

سید سالار مسعود غازی و حشمی محمود آبادی [illegible]

زینب ساحرہ " [illegible]

پیغام ڈاکٹر طاہر دیال پوری سے

قطرے سے گہر ہونے تک (اصلاحی)

صالحہ عابد حسین [illegible]

عذرا " [illegible]

رخسار سحر النصر کریم قدوائی [illegible]

الفت خان محبوب طرزی [illegible]

مجبور " [illegible]

ایک جان تین قالب " [illegible]

دوشیزہ قاف " [illegible]

جمیلہ بوائری " [illegible]

شہید محبت بوٹا سنگھ " [illegible]

نغمہ کوہسار " [illegible]

امین آباد " [illegible]

مصنوعی چاند " [illegible]

دلربا " [illegible]

فریدہ (جاسوسی) " [illegible]

نیاز دستہ " [illegible]

یاقوت " [illegible]

آنجہانی سحر " [illegible]

مقدمہ شعر و شاعری حالی عہ/
ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن للعہ/
پسینہ اور پرچھائیں " ۱۲/
سرت موہانی کے افسانے مرتبہ عبدالشکور سے/
مطالعہ حالی ناظر کاکوروی شجاعت علی للعہ/
مطالعہ شبلی " " للعہ/
ذوق و جنوں دیوان آل احمد سرور سے/
مثنویات حالی شجاعت علی ۱۲/
ہندوستان شاہراہ ترقی پر منظر سلیم ۱۲/
بزم نامہ عبدالماجد دریابادی سے/
امراؤ جان ادا مرزا رسوا سے/
طلسم اسرار (ڈرامہ) " ۱۲/
فلسفہ اقبال سید نقوی دریابادی ۱۲/
بہادر شاہ ظفر امیر احمد علوی سے/
تذکرہ رند " ۸/
تنقیدی اصول اور نظریے شارب ردولوی سے
ہماری اردو زبان کا ارتقا اختر امروہوی
نورس۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ
[illegible]

ادبی کتابیں

روح آزاد محمد یونس خالدی عہ/
ایجادوں کی باتیں مصطفےٰ احسن رضوی عہ/
فن خطابت کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ صہ/
فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ناظم تیاوری ۱۲/
مہاراج بلی یعنی خلاصہ سیر کوہسار عہ/
آتش گل جگر مرادآبادی صہ/
پردیسی کے خطوط مجنوں گورکھپوری سے/
یادگار انیس امیر احمد علوی سے/
اردو شاعری " ۱۲/
فروغ جام دیوان نشور واحدی ۱۲/
جلوے معین الدین دردائی ۱۲/
نقوش انتخاب کلام فانی عہ/
ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی سے/
سنہرا حلقہ " ۸/
ایک نا صبور ناچ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی عہ/
ادبی خطوط مرزا عسکری للعہ
شرح دیوان غالب طباطبائی للعہ
[illegible]

باقیات فانی ۵ر	حکایات صحابہ مولانا محمد زکریا ۱۲ر
فروغ جام نشور واحدی ۲ر	اپنی پچاس سالوں میں پیدا ہونے والے
نغمائے حبیب بہزاد لکھنوی ۴ر	لوگوں کی قسمت کا حال اعجاز فاروقی ۴ر
لڑکے بردار حامد اللہ افسر ۲ر	طالب علم کی زندگی مقصد کیا ہونا چاہیے
اچھی نظمیں انگر مشتاق ۵ر	غلام الثقلین ۶ر
مرثیہ غالب ۲ر	بانیٔ اسلام ۔ علامہ محی الدین خیاط کی
مسٹر فاکی نوٹ بک جعفر ملک ۱۲ر	تاریخ کا اردو ترجمہ ۱۲ر
اردو شعرا کے متعلق منظوم مناظرہ ۱۲ر	میزان القرآن ۹ر
مجذوب اور انکا کلام رضا انصاری ۴ر	بہشتی ثمر خلاصہ بہشتی زیور
تاریخ	حصہ اول دوم ۴ر
شاہان مالوہ امیر احمد علوی ۴ر	زکوٰۃ انجلی ۵ر
سیر و سیاحت	ہمارا جھنڈا حامد اللہ افسر ۴ر
ساحل اور سمندر احتشام حسین ۱۲ر	میٹھے بول شجاعت علی سندیلوی ۴ر
ہوائی ہفتہ پاکستان میں عبدالماجد دریابادی ۴ر	جواہرات اسمٰعیل ″ ۴ر
متفرق	راکھی ″ ۴ر
ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی ″ ۴ر	اچھی کہانیاں ″ ۴ر
حیوانات قرآنی ″ ۱ر	بشریت انبیا عبدالماجد دریابادی ۴ر
سفر حجاز ″ ۵ر	ملنے کا پتہ ادارۂ فروغ اردو
گاندھی جی کہتا تو حامد اللہ افسر ۴ر	امین آباد پارک لکھنؤ

قیامت صغریٰ خان محبوب طرزی للعہ
لب بام عادل رشید عہ
موسم گل " سے
نوروز مائل ملیح آبادی للعہ
معمار " للعہ
سفر " سے
غزنی دروازہ " للعہ
فلسفی ابن رشد " للعہ
لال قلعہ " سے
پاگل خانہ " سے
محبوبہ کربلا جرجی زیدان للعہ
حجاج بن یوسف " للعہ
اسپین شہزادی صادق سردہنوی للعہ
پھولوں کا انبار منظر سلیم للعہ
سیاحت زمین محمود اعظم عہ
معرکہ روم و یونان صادق سردہنوی سے
جادو کی آنکھ ڈاکٹر اختر بلگرامی سے
(جاسوسی ناول)
شکست کی آواز قاضی عبدالستار سے

جھلنی محمد علی واحدی مع عارف
شوکت تھانوی عہ

افسانے

ٹھیکرے کی مانگ افسانوں کا مجموعہ
صدیقہ بیگم سیوہاروی عار
ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی سے
چوتھی بہن اور دیگر افسانے
مسیح الحسن رضوی عار
جگ ہنسائی قیصر تمکین عار
ابوالخیر مجنوں گورکھپوری ۶ر

مزاحیہ

زمیشوں کا بادشاہ حکیم بانا
علی عباس حسینی سے
اپنی موج میں آوارہ عار
گفت گلفروش غلام احمد فرقت سے
صید و صرف " عار
اردو ادب میں طنز و مزاح (کامل)
غلام احمد فرقت عنہ

منظومات

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰ لائسنس نمبر ۵۵/۳۹۶ ٹیلیفون نمبر ۲۱۲۵

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کا علمی ادبی تنقیدی

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

مئی سنہ ۱۹۶۲ء

ترسیل زر کا پتہ

(۱) ۳/۷ امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

(۲) مبارک بکڈپو بندر روڈ متصل ڈینسو ہال کراچی (پاکستان)

اپنی باتیں

از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو یوپی بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ نے اردو میں جوابات لکھنے کے سلسلہ میں پراسپکٹس میں ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ جس کی اطلاع اب اپریل ۱۹۶۲ء میں تعلیمی اداروں کو دی گئی۔ یہ ترمیم پراسپکٹس کے صفحہ ۷ کے فٹ نوٹ نمبر ۱۱۱ میں کی گئی ہے اور ایک دفعہ ۱۱۱ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر ۱۱۱ میں یوپی بورڈ کے چیرمین نے ڈسٹرکٹ انسپکٹرس آف اسکولس کو یہ اختیار دیا ہے کہ جن طلبا کی مادری زبان اردو ہے انھیں بورڈ کے امتحانات میں اردو میں جوابات دینے کی اجازت دے دیں۔

دفعہ ۱۷ تعلیمی اداروں کے پرنسپل یا امتحانات کے سپرنٹنڈنٹ یا ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس جن طلبا کو اردو میں لکھنے کی اجازت دیں گے ان کے متعلق سکریٹری کو بھی مطلع کریں گے۔ یہ حکم ۱۹۶۲ء کے امتحانات کے لئے بھی ہے۔ بورڈ کی یہ رعایت حسب معمول تاخیر میں آنے کی وجہ سے ۱۹۶۲ء کے امتحانات میں طلبا اردو میں جوابات دینے سے محروم رہے اس طرح ایک سال دفتری مہربانیوں کی نذر ہو گیا۔ اردو کے سلسلہ میں جو ۱۰۰۰ کتابوں کی طباعت کا

شمارہ نمبر ۱ | مئی سنہ ۱۹۶۲ء | جلد نمبر ۹

ترتیب

(۱) اپنی باتیں ... ۳

(۲) عمر خیام کی رباعیات — جناب [illegible] علی سندیلوی ... ۴

(۳) [illegible] — جناب [illegible] ... ۱۴

(۴) [illegible] اور [illegible] — [illegible] ... ۱۵

(۵) منتخب شعر و ادب ... [illegible]

(۶) مطبوعات (فروغ اردو)

سید اعجاز حسین پرنٹر و پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

اس سلسلہ میں طلباء اور ان کے سرپرست اپنے اپنے متعلقہ تعلیمی اداروں کو مجبور کریں کہ اردو زبان میں تعلیم دی جائے، یہ ان کا جمہوری اور پیدائشی حق ہے۔

مادری زبان میں تعلیم نہ دیئے جانے کی وجہ سے اردو طلباء کے ذہن و دماغ بالکل مفلوج ہو گئے ہیں۔ ان کی علمی صلاحیتیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔

اس ماہ میں لسانی کمیٹی کی نشست ہوئی اور متعدد گواہیاں گزریں معلوم نہیں کمیٹی اپنی رپورٹ کب پیش کرے گی اور کب اردو کی حق تلفیاں دور ہوں گی۔ موجودہ طریقہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ کمیٹی کے ممبران موقع پر جا کر تحقیقات کرتے اور اردو کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ کہ کس طرح وہ ہر جگہ سے ختم کر دی گئی ہے۔ اس طرح کمیٹی کا کام بھی جلد ختم ہو جاتا اور ممبران کو بھی اطمینان ہو جاتا۔

اس شمارے سے فروغ اردو اپنی نویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے اس آٹھ سال کے اندر اس نے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ قارئین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آئندہ بھی اردو زبان کی خدمات اسی طرح انجام دیتا رہے گا۔

مسئلہ ہو یا کسی اور قسم کی رعایت کا محکمہ تعلیم اس پر مستقل مزاجی اور پابندی کے ساتھ عمل کرتا آیا ہے کہ جس قدر تاخیر کی جا سکے بہتر ہے۔ ہر سال کتابیں جولائی کے بجائے اگست۔ ستمبر میں آتی ہیں۔ طلبا اور سرپرست پریشان ہوتے ہیں۔ یو نیل ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت بیسک اسکولوں میں اول تو اردو پڑھانا مہا پاپ سمجھا جاتا ہے اور اگر کہیں کسی اسکول میں اردو پڑھانے کی اجازت ہوتی بھی ہے تو کتابوں کے نہ ملنے سے طلبا مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اردو چھوڑ دیں۔ مذکورہ بالا رعایتی سرکلر بھی اردو والوں کے لئے اس سال بالکل بے کار رہا۔ آئندہ سال بھی یہ زیادہ مفید اس لئے نہیں ہوگا کہ جب مضامین کی کتابیں ہندی میں ہونے کی وجہ سے ذریعہ تعلیم ہندی ہی ہے اور طلبا باوجود مادری زبان اردو ہونے کے اردو میں جوابات دینے سے محروم رہیں گے۔ اس لئے فی الحال کم از کم یہ انتظام کیا جائے کہ

(۱) جملہ مضامین کی کتابیں اردو میں بھی شائع کرائی جائیں۔

(۲) ممتحن اور اساتذہ کے لئے پہلے کی طرح اردو جاننا لازمی قرار دیا جائے تاکہ وہ اردو میں لکھے ہوئے جوابات پڑھ سکیں۔

(۳) امتحانات کے فارموں میں یہ خانہ بڑھایا جائے کہ امیدوار جوابات کس زبان میں لکھے گا۔

(۴) امتحانات کے پرچے بھی اردو میں شائع کئے جائیں۔

(۵) جملہ تعلیمی اداروں سے یہ اعداد و شمار فراہم کئے جائیں کہ ان کے یہاں کتنے طلبا ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔

عمر خیام کی رباعیاں

شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی
رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی۔ یو۔ پی

مولانا ماہر القادری نے فاران کی حالیہ اشاعت میں مولانا ناطق گلاؤٹھوی کی
بس میں علیل کے تبصرہ کے ضمن میں فرمایا تھا:۔

"عمر خیام رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہے حالانکہ وہ ایک شاعر سے زیادہ فلسفی اور فن ہیئت کا عالم تھا۔ شاعری کا فن تو اس نے تفریح تفنن کے لئے اختیار کیا تھا اس کی ساری زندگی تو ہیئت اور فلسفہ کی وادی میں گزری ہے۔"

یہ تبصرہ لفظاً و معناً کسی طرح بھی مستوجب نکتہ چینی نہیں تھا مگر ناطق صاحب نے تو اس پر لفظی گرفت فرمائی بعد ازاں اس کی تاریخی صحت کو غلط قرار دیا اور انتہائی تیانہ انداز میں فرمایا:۔

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ جہاں سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ عمر خیام ایک عالم ہیئت اور فلسفی تھا وہیں آپ نے یہ کیوں نہ دیکھ لیا کہ وہ شاعر بھی تھا اور رباعی نگاری میں واحد تھا۔"

اس کے [illegible] تحقیق نے کیا [illegible] عمر خیام کا انبار لگا دیا۔ فرماتے ہیں:

امام اہل سنت کی وفات

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ امام اہلسنت والجماعت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے سانحۂ ارتحال پر انتہائی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا کی ذات گرامی اس دور میں اہلسنت والجماعت کے لیے شمع ہدایت تھی۔ مولانا کی مذہبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا جو علمی وتصنیفی کام اپنی زندگی میں انجام دے گئے ہیں وہ مذہبی حلقوں میں اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے بظاہر اس کا پر ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

ضروری اطلاع

اسلامیہ۔ دینی تعلیم۔ جمعیۃ العلماء مکاتب اور بیسک اسکولوں کی جملہ اردو زبان کی مطبوعات اور امتحانات السنہ شرقیہ الہ آباد بورڈ اور جامعہ اردو علی گڈھ کے نصاب کی جملہ کتابیں

اور حل پرچہ جات امتحان

ادیب ۱۹۵۴ء و ۵۵-۱۹۵۶ء

۳ر عمر

ملنے کا پتہ

انوار بک ڈپو امینہ آباد لکھنؤ

ایک سال پہلے جو مجھ سے ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو یہ بتایا کہ اب خیام کے مجموعہ میں تقریباً ستر ایسی رباعیاں بھی ہیں جو مجھے کہیں اور نہیں ملی ہیں میں نے کہا ثبوت کے لئے دس رباعیاں بھی کافی ہیں۔ اب آپ اس پکھ (؟) ڈالئے۔ تو جواب دیا کہ ابھی جلدی کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ بچے چھوٹے ہیں اور لکھنؤ جاکر ان کے ذخیرے میں تلاش کرنے کی مجھے ہمت نہیں ہوتی۔ ورنہ خیام کی ایک ایک رباعی کا ماخذ سامنے آجاتا۔"

(سبع سیارہ صفحہ ۱۱۰-۱۱۲)

خیام کی وفات کو ساڑھے آٹھ سو سال سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ آج تک کسی مورخ تذکرہ نگار، ادیب محقق نے اس قسم کے دعوے کی جرأت نہیں کی مگر مولانا ناطق نے ماہر صاحب پر تعقب فرمانے کی دھن میں یہ جدت کر ہی ڈالی عمر خیام کی رباعیات "ایک محسوس اور ناقابل تشکیک حقیقت ہیں۔ اسی لئے غالباً ماہر القادری صاحب نے اسے مجذوب کی بڑسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مگر حال ہی میں جب ناطق صاحب کا یہ مضمون اس کے مجموعہ مضامین (سبع سیارہ) میں شائع ہوا تو بعض حضرات اس سے شک میں پڑ گئے اور اخبارات میں اس قسم کے متعلق استفسارات آنے لگے۔ اور ایک مستفسر نے یہاں تک لکھا :-

"چونکہ مولانا ناطق اور نیاز صاحبان کی رائیں ادبی مباحث میں مستند مانی جاتی ہیں اس لئے ممکن ہے اس کتاب (سبع سیارہ) کا پڑھنے والا غلط فہمی کا شکار ہو جائے لہذا محققین اور ادیبوں سے التماس ہے کہ وہ اس پر روشنی ڈالیں"۔

بنابریں اس بارے میں حقیقت پر روشنی ڈالنا ضروری ہو گیا اگرچہ یہ ع

لیجئے کان کھول کر سن لیجئے۔ عمر خیام نے شاعری کی ہی نہیں اور یہ جو رباعیاں اس سے منسوب کی جاتی ہیں عمر خیام کی نہیں۔ یقیناً وہ ایک بہت بڑا عالم ہیئت فلسفہ اور منطق تھا۔ حسن ابن صباح مولانا نجم الدین نیشاپوری اور دیگر کئی مشاہیر اس کے ہم جماعت رہے اور ہم عصر تھے۔ جو سب کے سب عمر خیام کی فضیلت کا لوہا مانتے تھے۔ اس کے مشاغل علمی کا ذکر تو بیان متقدمین میں آپ کو بہت ملے گا۔ لیکن مشاغل شعری کا بیان شاید کہیں نہ ملے۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ جس شخص نے اتنی بلند پایہ رباعیاں لکھیں اسکا کہیں ایک شعر بھی دیگر اصناف سخن میں موجود نہیں اور ایسا بھی ثبوت نہیں کہ عمر خیام نے کبھی کسی کو کوئی رباعی بھی اپنے نام سے کہکر سنائی ہو۔ عمر خیام کی خود نوشتہ کوئی ایسی تحریر بھی نہیں ملی جس سے معلوم ہو سکے کہ رباعیاں اس کی تصنیف ہیں۔ عمر خیام اپنے ذوق علم اور ذوق سلیم کے مطابق متقدمین کی بہتر سے بہتر رباعیاں چن کر ایک بیاض میں جمع کرتا گیا جو اس کے بعد ملیں اور لوگوں نے اس کی مسلمہ قابلیت پر خیال کر کے رباعیوں کو اسی سے منسوب کر دیا۔ اٹھارہ بیس سال کا عرصہ ہوا مجھے ایک فارسی شاعر کے دیوان میں جس کا زمانہ خیام سے مقدم ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی نظر آئی تو میں اسے لکھنؤ لے گیا اور مولانا آسی مرحوم کو بتایا۔ مجھے اس وقت یہ خیال ہوا تھا کہ رباعی مطبع کی غلطی سے ادھر ادھر ہو گئی ہے مگر مولانا آسی نے یہ بتایا کہ عمر خیام کی ایک اور رباعی بھی انھوں نے فارسی کے کسی پرانے شاعر کے دیوان میں دیکھی ہے۔ اور کہا کہ اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ اب میں مزید تلاش کروں گا چنانچہ انھوں نے اسی دن سے کوشش کرنا شروع کی۔ اور تقریباً ایک سال کے بعد مجھے لکھا کہ عمر خیام کی اور بھی کئی رباعیاں دیگر متقدمین کے مجموعوں میں مل گئی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ آسی صاحب کے انتقال کے

عظمت اور تبحر فی الحکمۃ کے باب میں مورخین و تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں
چنانچہ آج سے ایک ہزار سال پہلے مشہور اندلسی مورخ فلسفہ سلیمان بن حسان
المعروف بابن جلجل المتوفی ۳۴۴ھ نے لکھا تھا:-

"ابو یوسف یعقوب بن اسحاق ابن الصباح الکندی... کان عالماً بالطب والفلسفة وعلم الحساب والمنطق وتالیف اللحون والهندسة وطبائع الاعداد والهیئة وعلم النجوم. ولم یکن فی الاسلام فیلسوف غیره احتذی فی تالیفه حذو ارسطاطالیس وله تالیف کثیرة فی فنون العلم۔"

(طبقات الاطباء والحکماء لابن جلجل صفحہ ۷۳)

اسی طرح قاضی صاعد اندلسی (المتوفی ۴۶۲ھ) نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے

"فمن اشتهر منهم باحکام العلوم والتوسع فی فنون الحکمة یعقوب بن اسحاق الکندی فیلسوف العرب .... ولم یکن فی الاسلام من اشتهر عند الناس بعلوم الفلسفة حتی سموه فیلسوفاً غیر یعقوب وله فی اکثر العلوم تالیف مشهورة من المصنفات الطوال والرسائل القصار"　(طبقات الامم صفحہ ۸۰-۸۲)

عہد حاضر میں گولڈ زیہر کندی کے بارے میں لکھتا ہے:-

"الکندی (۲۶۰ھ وفات) ایسے عربی فلسفی کے نام سے مشہور ہے جس نے اس دائرے میں ارسطاطلیسیت کے راستے میں سب سے پہلا قدم اٹھایا۔"

(قرون وسطیٰ کا اسلامی فلسفہ صفحہ ۲)

باایں ہمہ کندی شاعر بھی تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کے متعدد اشعار

آفتاب آمد دلیل آفتاب

سے زیادہ کسی جوابی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ بہرحال

ا۔ جس طرح ان کا یہ استدلال نرالا ہے کہ

"عمر خیام نے شاعری کی ہی نہیں اور یہ جو رباعیاں اس سے منسوب کی جاتی ہیں عمر خیام کی نہیں۔ یقیناً وہ ایک بہت بڑا عالم ہیئت فلسفہ اور منطق تھا۔"

ب۔ اسی طرح ان کا اندازِ استشہاد بھی انوکھا کہ

اس کے مشاغل علمی کا ذکر تو بیان متقدمین میں آپ کو بہت ملے گا۔ لیکن مشاغل شعری کا بیان شاید کہیں نہ ملے۔"

بلکہ غالباً ان کی سطحی معلومات اور قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے [تفصیل آگے آرہی ہے]

ج۔ اور اس سے زیادہ عجیب ان کی یہ "نئی دریافت" ہے کہ

عمر خیام اپنے ذوق علم اور ذوق سلیم کے مطابق متقدمین کی بہتر سے بہتر رباعیاں چن کر ایک بیاض میں جمع کرتا گیا جو اس کے بعد میں اور لوگوں نے اس کی مسلمہ قابلیت پر خیال کر کے رباعیوں کو اسی سے منسوب کر دیا۔

مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) خدا جانے مولانا ناطق نے شعر و سخن کا بلا شرکت اجارہ دار انہیں حضرات کیسے سمجھ لیا جو

بہت بڑے عالم ہیئت فلسفہ اور منطق

ہوں۔ کیا فلسفہ دانی اور تبحر فی الحکمۃ صلاحیت سخن سنجی کے منافی ہے۔

(۱) یعقوب کندی جسے اسلامی فکر کا پہلا فلسفی اور "فیلسوف العرب" کہا جاتا ہے، فلسفیانہ

باایں ہمہ وہ شعر بھی کہتا ہے چنانچہ ابن ابی اُصیبعہ نے ومن شعر ابی نصر الفارابی کے عنوان سے اس کے متعدد اشعار نقل کئے ہیں:۔

فما الدار دار خلود لنا — ولا المرء فی الارض بالمعجز
وھل نحن الا خطوط وقعن — علی کرۃ وقع مستوفز

اور "خمریات" کے ضمن میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں:۔

اشرب ما اقتنیت راحا — لھا علی راحتی شعاع
لی من قواریرھا ندامی — ومن قراقیرھا سماع

(۳) اور یہ شیخ بو علی سینا ہے اسلامی فلسفہ کا محقق اعظم بقول متاخرین "المعلم الثالث" اور بقول بیکن

Prince and leader of philosophy

اس کا "ارجوزہ فی الطب" تو خیر منظوم طبی رسالہ ہے لیکن اس کا قصیدہ

ھبطت الیک من المحل الارفع — ورقاء ذات تعزز وتمنع

عربی ادب میں مشہور ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی تصانیف میں "عشر قصائد واشعار فی الزہد" کا بھی ذکر کیا ہے۔ رضا قلی خاں ہدایت نے "مجمع الفصحا" میں اس کی متعدد رباعیوں کو نقل کیا ہے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض منحول ہوں لیکن بہرحال اتنا متحقق ہے کہ باہمہ تفلسف شیخ فکر سخن کے لئے بھی وقت نکال لیتا تھا۔

(۴) ابو ریحان البیرونی اسلامی تاریخ کا عظیم ترین ہیئت داں اور ماہر ریاضیات ہے۔ اس کی "قانون مسعودی" اپنے موضوع پر دنیا کی ادبیات عالیہ

ونائل سوالك واقبض يديك — وفي تعريتك فاستجلس
وعند مليكك فابغ العلو — وبالوحدة اليوم فاستأنس
فإن الغنى في قلوب الرجال — وإن التعزز بالانفس ... الخ

اور مندرجہ ذیل اشعار کی تعریف تو ابن قتیبہ (المتوفی ۲۷۶ھ) نے بھی کتاب فرائد الدرر میں کی تھی:-

وفي اربع مني حلت منك اربع — فما انا ادري ايها هاج لي كربي
اوجهك في عيني ام الطعم في فمي — ام النطق في سمعي ام الحب في قلبي

(۲) تاریخ اسلام کا دوسرا مشہور فلسفی و حکیم ابو نصر فارابی (المتوفی ۳۳۹ھ) ہے جو اپنی عظمت فکر کی بنا پر "المعلم الثانی" کہلاتا ہے چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے طبقات الامم (صفحہ ۸۳-۸۴) میں لکھا ہے:-

"ومنهم ابو نصر محمد بن نصر الفارابي فيلسوف المسلمين بالحقيقة ... فبذ جميع اهل الاسلام فيها واربى عليهم في التحقيق بها ... وله كتاب في اغراض فلسفة افلاطون وارسطاطاليس يشهد له بالبراعة في صناعة الفلسفة والتحقق بفنون الحكمة"

اسی طرح ابن القفطی "اخبار العلماء باخبار الحکماء" (صفحہ ۱۰۲) میں لکھتا ہے۔

محمد بن محمد بن طرخان ابو نصر الفارابي الفيلسوف من الفاراب احدى بلاد الترك فيما وراء النهر فيلسوف المسلمين غير مدافع ... برز في ذلك على اقرانه واربى عليهم في التحقيق وشرح الكتب المنطقية واظهر غامضها وكشف سرها وقرب

ولا یعون اکناف الھونیا   اذا احلو او لا رد ض المدٰن

خود مولانا ناطق کو اس کے ذوقِ سلیم کا اعتراف ہے (تفصیل آگے آرہی ہے)

(ب) مولانا ناطق کو بیانِ متقدمین میں خیام کے مشاغلِ علمی کا ذکر تو بہت ملتا ہے لیکن مشاغلِ شعری کا بیان کہیں نہیں ملا۔"

ناطق صاحب کی یہ مبہم ادعائیت ادعائے محض ہے۔ انھوں نے یہ دعویٰ کرتے وقت اس ذمہ داری اور احتیاط کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھا جو اربابِ تحقیق سے بجا طور پر امید کی جاتی ہے۔ ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خیام کے سلسلے میں متقدمین کا کوئی بیان دیکھا ہی نہیں ہے اور صرف اظہارِ شخصیت کے لئے یہ دعوائے باطل فرما ڈالا ہے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

خیام کا سالِ وفات ۵۱۷ھ ہے جسے آج ساڑھے آٹھ سو سال ہو چکے ہیں۔ اس ساڑھے آٹھ سو سال کی طویل مدت میں سے پہلے دو سو سال کے اندر جو مصنفین گزرے ہیں وہ یقیناً "متقدمین" کے مصداق ہیں۔ لہٰذا ذیل میں صرف انھیں "متقدمین" کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔

(۱) اس دو سو سال کی حد کے سرے پر حمداللہ مستوفی کی تاریخِ گزیدہ ہے جس کا سالِ تصنیف ۷۳۰ھ ہے (یعنی خیام کے پورے دو سو سال بعد) اس میں خیام کے مشاغلِ علمی کے ساتھ اس کے مشاغلِ شعری کا بھی ذکر ہے۔ نیز اس کی ایک رباعی بھی نقل کی ہے۔

خیام، ابو عمر بن ابراہیم در اکثر علوم خاصہ در نجوم سرآمدِ زمانِ خود بود ..... در سائل خوب داشعارِ نیکو دارد ودرین اشعارہ

میں محبوب ہوتی ہے اور بجا طور پر بطلیموس کی المجسطی کا نعم البدل سمجھی جاتی ہے۔ وہ بو علی سینا سے زیادہ خشک مزاج ہے جیسا کہ اس کی کتاب "الآثار الباقیہ" کے اسلوب نگارش سے اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یاقوت نے معجم الادبا میں اس کا تذکرہ مشاہیر ادبا کے دوش بدوش کیا ہے اور لکھا ہے۔

"وکان یقول شعراً"

اور متعدد اشعار نقل کئے ہیں مثلاً

ومن حام حول المجد غیر مجاہد — تولی طاعما للکربات وکاسیا
ومات قریر العین فی ظل راحۃ — ولکنہ من حلۃ المجد عاریا

صنعت تجنیس میں کہتا ہے ؎

تنغص بالبنا مد طیب عیشی — فلاشیٔ امر من الفراق
کتابک اذ عذا الفرح المرجی — اطب لما الم من الفراق

غرض حکما و فلاسفہ کی شعر گوئی و سخن سنجی کی داستانوں سے دفاتر معمور کئے جا سکتے ہیں اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا تفلسف و حکمت تپ دہی اور مشاہدہ افلاک و انہماک فی الریاضیات ان کے لئے فکر سخن سے کبھی مانع نہ بن سکا۔ تو پھر خیام ہی کو کیوں "اپنی" جمالیاتی حس" کی تسکین کا نا اہل سمجھا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ اکثر ادبی مباحث میں دلچسپی لیا کرتا تھا بیہقی جو اپنے بچپن میں عمر خیام کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ "تتمہ صوان الحکمۃ" (صفحہ ۱۱۶) میں لکھتا ہے کہ اس نے (خیام نے) اس سے حماسہ کے مندرجہ ذیل شعر کو پوچھا تھا۔

(۴) اس سے پہلے خیام کے نوّے سال بعد نجم الدین رازی نے ۶۲۰ھ میں "مرصاد العباد" کے اندر خیام کے علم و فضل کے ساتھ اس کی رباعیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

یکے را از فضلا کہ نزد ایشاں بفضل و حکمت و کیاست و معرفت مشہور است و آں عمر خیام است ..... ایں بیت می باید گفت

در دائرہ‌ای کآمدن و رفتن ماست ۔۔۔ آں را نہ بدایت نہ نہایت پیداست

کس می نزند دمے دریں عالم راست ۔۔۔ کایں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

(۵) اس سے پہلے خیام کے کوئی ساٹھ سال بعد شہرزوری نے نزہتہ الارواح و روضۃ الافراح میں جہاں خیام کے "مشاغل علمی" کا ذکر کیا ہے کہ

وکان عالماً بالفقہ واللغۃ والتواریخ ..... واما اجزاء الحکمۃ من الریاضیات والمعقولات فکان ابن بجدتہا"

وہیں اس کے "شغل شعر و سخن" کے متعلق بھی لکھا ہے۔

ولہ اشعار حسنۃ بالفارسیۃ والعربیۃ

اور اس کے بعد اس کے عربی کلام کے نمونے دیئے ہیں۔ مثلاً

تدین لی الدنیا بل السبعۃ العلیٰ ۔۔۔ بل الافق الاعلیٰ اذا جاش خاطری

اصوم عن الفحشاء جہراً و خفیۃ ۔۔۔ عفافاً و افطاری بتقدیس فاطری

(۶) اس سے پہلے خیام کے بیالیس سال بعد عماد الدین کاتب اصفہانی نے ۵۷۲ھ میں "خریدۃ القصر و جریدۃ اہل العصر" کے اندر جہاں اس کے علمی کمالات کے متعلق لکھا ہے کہ

کان عدیم القرین فی علم النجوم والحکمۃ

هر ذره که بر روی زمینی بودست   خورشید رخی زهره جبینی بودست
گرد از رخ آستین بآزرم فشان   کان هم رخ خوب نازنینی بودست

(۲) اس سے پہلے عطا ملک جوینی نے خیام کے کوئی سوا سو سال بعد "تاریخ جہانگشا" (سال تصنیف ۶۵۸ھ) کے اندر مرو کے قتل عام کے سلسلے میں لکھا تھا کہ لاشوں کے شمار کے وقت سید عز الدین نسابہ نے خیام کی یہ رباعی پڑھی تھی۔

درین حالت رباعی عمر خیام که حسب حال بود بر زبان رانده است

ترکیب پیاله که درهم پیوست   بشکستن آن روا نمی‌دارد مست
چندین سر و پای نازنین از سر دست   از مهر که پیوست و بکین که شکست

(۳) اس سے پہلے ابن القفطی نے خیام کے سو سوا سو سال بعد "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں خیام کے مشاغل علمی کے ساتھ اس کے "مشاغل شعری" کی بھی تفصیل دی تھی:-

عمر الخیام امام خراسان وعلامة الزمان ..... وقد وقف متأخرو الصوفیة علی شیء من ظواهر شعره فنقلوها الی طریقتهم ...... وکان عدیم القرین فی علم النجوم والحکمة ..... وله شعر طائر

اذا رضیت نفسی بمیسور بلغة   یحصلها بالکد کفی وساعدی
امنت تصاریف الحوادث کلها   فکن یا زمانی موعدی او مواعدی
الیس قضی الافلاک فی دورها بان   تعید الی نحس جمیع المساعد
فیا نفس صبرا عن مقیلک انما   تخر ذراه بانقضاض القواعد

ظہیر الدین ابوالحسن بیہقی کی تتمہ صوان الحکمہ کو قرار دیا جس کا سال تصنیف انھوں نے سنہ ۵۴۹ھ متعین کیا حالانکہ یہ یقیناً سنہ ۵۵۳ھ کے بعد کی [اور غالباً سنہ ۵۹۰ھ کے بعد کی] تصنیف ہے۔ حال ہی میں فضلائے ایران نے تین قدیم ترین ماخذ دریافت کئے ہیں جو خیام کی زندگی ہی میں مرتب ہوئے تھے۔

۱۔ آقائے مجتبیٰ مینوی نے حکیم سنائی کے ایک خط کا پتہ لگایا ہے جو انھوں نے خیام کو اپنے ایک ذاتی کام سے لکھا تھا۔

۲۔ آقائے بدیع الزماں فروزاں فر کو زمخشری کی "الزاجر للصغار" میں زمخشری اور خیام کی اس وقت کی ملاقات کا حال ملا ہے جب کہ خیام جوان تھا۔

۳۔ آقائے جلال ہمائی نے عبدالرحمٰن الخازنی کی "میزان الحکمۃ" (مصنفہ سنہ ۵۱۵ھ) میں آبی ترازو کے سلسلے میں عمر خیام کا ذکر دیکھا ہے۔

ان کے علاوہ ان سے بھی زیادہ ایک اور قدیم تر ماخذ کا حوالہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے دیا ہے۔ یہ "قابوس نامہ" ہے جو خیام کی نوجوانی کے زمانہ میں تصنیف ہوا تھا۔

ان قدیم ماخذوں میں سوائے "قابوس نامہ" کے خیام کی شاعری کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن "قابوس نامہ" مطبوعہ گلزار حسنی پریس بمبئی جس کے اندر سید سلیمان ندوی مرحوم نے رباعیات خیام کا قدیم ترین حوالہ بتایا ہے مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔

باقی ماخذوں میں خیام کی شاعری کے عدم ذکر کی وجہ حسب ذیل ہے

۱ [illegible] کہ ساخت کے اصول اور علاوہ

وہیں اس کے متعدد اشعار بھی نقل کئے ہیں

یہ وہ مشاہیر و مورخین ہیں جن کے اقوال پر اعتماد کر کے نہ صرف خیام بلکہ دیگر عباقرۂ اسلام کے کمالات علمیہ کی تاریخ مرتب کی جاتی ہے مگر حضرت ناطق گلاؤٹھوی باور کرانا چاہتے ہیں کہ

"بیان متقدمین میں ... (خیام کے) مشاغل شعری کا بیان شاید کہیں نہ ملے"

یا للعجب !!!

حال ہی میں رسالہ "مسلم ورلڈ" لندن (اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء) میں عراق کے ایک عالم عبدالحق فاضل نے عمر خیام کی شاعری پر محققانہ مقالہ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ گو عمر خیام کے ہم عصر نظامی عروضی سمرقندی، زمخشری اور ظہیرالدین بیہقی نے اس کی رباعیات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عمر خیام شاعری سے بے حس تھا۔

یہ تبصرہ تفصیل کا مستحق ہے۔

روسی مستشرق ژوکوفسکی جس نے ۱۸۹۷ء میں خیام کا پہلا مبسوط تذکرہ مرتب کیا تھا خیامیات کا قدیم ترین ماخذ شہرزوری کی "نزہۃ الارواح" کو قرار دیتا ہے (جس کا سال تصنیف ۵۸۶ھ اور ۶۱۱ھ کے مابین ہے) بعد میں مسٹر براؤن آنجہانی نے "تاریخ ادبیات فارسی" کی دوسری جلد میں اور پھر مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے "چہار مقالہ" کے پیش لفظ میں خیامیات کا قدیم ترین ماخذ چہار مقالہ کو قرار دیا جس کا سال تصنیف غالباً حدود ۵۵۲ھ ہے سالہا گذشتہ قاری کلیم اللہ حسینی نے رسالہ "کلیم" حیدرآباد میں قدیم ترین ماخذ

میں التزام کیا ہے۔

۵۔ بیہقی نے "تتمہ صوان الحکمۃ" میں خیام کا مکمل تذکرہ نہیں دیا صرف بعض ذاتی حالات کا ذکر کیا ہے اور تو اور اس نے اس کی تصانیف کا بھی کوئی اشارہ نہیں کیا، حالانکہ ان میں سے بعض تصانیف اس کے فضل و کمال پر دال تھیں جیسے "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا سوا سو سال بعد محقق طوسی نے ذکر کیا ہے اور "الرسالۃ الشافیہ" میں اس کے اقتباسات نقل کئے ہیں اگر بیہقی نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ خیام کی تصنیف نہیں ہے۔ پھر بیہقی کے خیام کی شاعری کا ذکر نہ کرنے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ خیام شاعر نہیں تھا۔

بات یہ ہے کہ فضلائے عہد کے شاعرانہ کمالات کے تذکرے کے لئے بیہقی نے "وشاح الدمیہ" نام کی ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی۔ غالباً اس میں اس نے خیام کے اشعار بھی نقل کئے ہوں گے اور اس کے کمالات شاعری کا بھی ذکر کیا ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے آج یہ کتاب ناپید ہے۔ البتہ "وشاح الدمیہ" پر ابن العماد نے "خریدۃ القصر وجریدۃ اہل العصر" کے عنوان سے جو ذیل لکھا تھا اس میں خیام کے شاعرانہ کمالات کا ذکر ہے نیز اس کے عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ ابن العماد کی "خریدۃ القصر" کے بعد کے تذکرہ نگاروں مثلاً شہرزوری اور ابن القفطی نے "نزہۃ الارواح" اور "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں۔

رہا اس کی فارسی رباعیات تو عربی اشعار کے ضمن میں ان کا مذکور کیوں

ہے۔ ظاہر ہے اس منطقی اور دقیق سائنسی بحث میں شعر و سخن کے ذکر کا کوئی محل نہیں ہے۔

۲۔ حکیم سنائی کا مکتوب بنام عمر خیام انتہائی پریشانی اور ذہنی کشمکش کے زمانہ میں لکھا گیا تھا جبکہ وہ کسی الزام میں ماخوذ تھے اور بعض اوقات شرم کی وجہ سے خودکشی تک کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایسے عالم میں شعر و سخن کے ذکر کی فرصت کہاں ہو سکتی تھی ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

۳۔ زمخشری کی "الزاجر للصغار" میں خیام کا مستقل تذکرہ نہیں ہے صرف اس کے عہد جوانی کی ادبی قابلیت اور سعادت مندی کا ضمنی ذکر ہے۔

۴۔ نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے تیسرے مقالہ میں خیام کی فن نجوم میں حذاقت اور صحیح پیشین گوئیوں کا ذکر کیا ہے۔ نظامی عروضی خود نجوم سے دلچسپی رکھتا تھا اور اسی حیثیت سے وہ خیام کا عقیدتمند تھا۔ مشاہیر شعرا کا ذکر اس نے دوسرے مقالہ میں کیا ہے مگر یہ سب درباری شعرا ہیں جن کے قصائد نے ممدوحوں کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے خیام جو مدحیہ نگار قصیدہ گو نہیں تھا اس تذکرے میں کہاں بار پا سکتا تھا خیام کے علاوہ اور بھی غیر درباری شعرا ہیں جیسے شیخ ابو سعید ابو الخیر وغیرہ مگر چہار مقالہ میں ان کا ذرا سا اشارہ بھی نہیں ہے۔ خیام کے مشاغل شعری کے ذکر سے نظامی عروضی اس وجہ سے نہیں ہے کہ خیام شاعر نہیں تھا بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اس انداز کا شاعر نہیں تھا جن کے ذکر کا نظامی عروضی نے دوسرا مقالہ

فارسی کی قید لگا دی کہ اگر رباعیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں فارسی کے کچھ شعر خیام کے لکھے ہوئے موجود ہوں تو سند کے ساتھ پیش کریں۔

لیکن خیام محض شاعر ہی نہیں تھا۔ اس کی یہ حیثیت ثانوی تھی۔ اصل میں وہ فلسفی تھا۔ حکیم تھا۔ ریاضی داں تھا۔ ماہر ہیئت تھا اور نجومی تھا۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی فرصت انھیں حضرات کو ہوتی ہے جنھوں نے یا تو فانی الشعر کا درجہ حاصل کر لیا ہے یا پھر پہلوان سخن ہونے کے مدعی ہوں۔ خیام اگر تھا تو "فانی الحکمۃ" تھا۔ اس نے الہیات شفا کی بحث واحد و کثیر دیکھتے دیکھتے جان دیدی۔ چنانچہ بیہقی نے اس کے داماد سے روایت کیا ہے۔

حکی لی ختنۃ الامام محمد البغدادی انہ کان یتخلل بخلال من ذھب کان یتأمل الالہیات من الشفا۔ فلما وصل الی فصل الواحد والکثیر وضع الخلال بین الورقتین وقال ادع الازکیا حتی اوصی فوصّٰی فقام وصلّٰی ولم یاکل ولم یشرب۔ فلما صلّٰی العشاء الاخیرۃ سجد وکان یقول فی سجودہ اللہم تعلم انی عرفتک علی مبلغ امکانی فاغفرلی۔ فان معرفتی ایاک وسیلتی الیک۔ ومات"

رہا پہلوان سخن ہونا تو وہ پہلوان حکمت بننے سے بھی کتراتا تھا۔ ہمیشہ مناظرے سے بچنے کی کوشش کرتا تو کسی کے مقابلے میں قصیدہ یا مثنوی کیا لکھتا۔ پھر یوں ہی عزت و اکرام کی کیا کمی تھی جو مداحی کر کے انعام و تحسین کا طلبگار ہوتا۔ خاقان شمس الملوک والی بخارا اسے اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا تو پھر صف شعرا میں کھڑے ہو کر قصیدہ خوانی کی کیا حاجت تھی۔

ہوتا۔ ہاں جب فارسی تذکرے اور فارسی تصانیف لکھی گئیں تو ان کا بھی ذکر آنے لگا۔ اس قسم کا قدیم ترین حوالہ نجم الدین رازی کی "مرصاد العباد" میں ملتا ہے [تفصیل اوپر مذکور ہوئی]

(ج) سب سے زیادہ مضحکہ خیز مولانا ناطق کی یہ تحقیق "نیق" ہے کہ

عمر خیام اپنے زور علم اور ذوق سلیم کے مطابق متقدمین کی بہتر سے بہتر رباعیاں چن کر ایک بیاض میں جمع کرتا گیا جو اس کے بعد ملیں اور لوگوں نے اس کی مسلمہ قابلیت پر خیال کر کے رباعیوں کو اسی سے منسوب کر دیا

یہ انوکھا "انکشاف" متقدمین تو درکنار متاخرین کے یہاں بھی نہ ملے گا اور اس "اختلاق" کا شرف حضرت ناطق ہی کا حصہ ہے معلوم نہیں اس ادعائے باطل کا مقصد کیا ہے۔ خیام پر سرقہ و تلبیس کا الزام یا بعد کے تذکرہ نویسوں پر سادہ لوحی و غیر ذمہ داری کا افترا (مزید تفصیل آگے آ رہی ہے)

(د) ناطق صاحب نے اپنی تحقیق "نیق" کے ثبوت میں کچھ دلائل بھی دیئے ہیں مگر یہ انتہائی سطحی اور عامیانہ ہیں۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ ناطق صاحب نے لکھا ہے:۔

"پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ جس شخص نے اتنی بلند پایہ رباعیاں لکھیں اس کا کہیں ایک شعر بھی دیگر اصناف سخن میں موجود نہیں ہے"

مگر اوپر رباعیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن کے ضمن میں خیام کے متعدد عربی اشعار نقل ہوئے ہیں۔ جن پر مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح جب مولانا کا ادعا باطل ہونے لگا تو اپنے شاگرد کے ذریعہ اس مطالبہ میں

میں اپنی کوئی تین کتابوں کے نام گنائے ہیں مگر خیام کی کوئی ایسی تحریر نہیں ملی۔ ظاہر ہے اس سے اس کی تصانیف کی صحت انتساب میں فرق نہیں آتا۔ تو پھر رباعیات ہی کے سلسلے میں اس لزوم مالا یلزم کا مطالبہ کیوں؟

یہ ناطق صاحب نے فرمایا ہے:۔

عمر خیام... متقدمین کی بہتر سے بہتر رباعیاں چن کر ایک بیاض میں جمع کرتا گیا .... اور لوگوں نے اس کی مسلمہ قابلیت پر خیال کر کے رباعیوں کو اس سے منسوب کر دیا۔ اس نے انکشاف کے سلسلے میں بار ثبوت ناطق صاحب ہی کے ذمہ ہے اور جب تک کوئی قوی یا ضعیف ماخذ نہیں بتایا جاتا اس کی حقیقت اعجوبہ تراشی سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اس قسم کا شاعرانہ حسن تعلیل ایسے حضرات سے اور بھی قبیح معلوم ہوتا ہے جو درس نظامی کے فارغ التحصیل ہونے کے بھی مدعی ہوں ابو تمام طائی نے "حماسہ" کو شعرا سابقین کے کلام سے منتخب کیا تھا۔ مگر نہ تو اس نے حماسہ کو اپنا کلام بتایا نہ دوسروں ہی نے یہ بدمذاقی فرمائی۔ پھر خیام ہی کو اس گھناؤنی حرکت کا مرتکب کیوں سمجھا جائے کہ اس نے دوسروں کی جگر کاوی کو اپنی ملک مشہور کر دیا گیا ہوگا۔ یا بعد کے لوگوں کو اتنا بدمذاق اور شوخ چشم کیوں تصور کیا جائے کہ انھوں نے دوسروں کی ملکیت کو اس سے منسوب کر دیا ہوگا بالخصوص جب کہ اس زمانہ میں شعرائے متقدمین کے دواوین و کلیات آج کے مقابلہ میں زیادہ متداول تھے اور اس دجل و فریب کا کھل جانا یقینی تھا۔

۲۔ ناطق صاحب نے لکھا ہے۔

اور ایسا بھی ثبوت نہیں کہ عمر خیام نے کبھی کسی کو کوئی رباعی بھی اپنے نام سے کہہ کر سنائی ہو۔

گر یہ بھی پیشہ ور شعرا کا دستور ہے۔ ویسے اس کی متعدد رباعیاں ایسی ہیں جن میں خیام تخلص موجود ہے مثلاً

خیام زبہر گنہ این ماتم چیست — وز خوردن غم فائدہ بیش و کم چیست
آنرا کہ گنہ نکرد غفران نبود — غفران زبرائے گنہ آمد غم چیست
اے سوختہ سوختہ سوختنی — وے آتش دوزخ در تو افروختنی ، یا
تا کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن — حق را تو کجا رحمت آموختنی

(عمر، خیام کا نام ہے) اس قسم کی تیرہ رباعیوں کا پتہ چلا ہے جن میں سے کم از کم پانچ شک و شبہ سے پاک ہیں اور رباعیات کے تمام نسخوں میں مشترک ہیں۔

۳۔ ناطق صاحب نے فرمایا ہے:۔

عمر خیام کی خود نوشتہ کوئی ایسی تحریر بھی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ رباعیاں اس کی تصنیف ہیں۔

لیکن شعر و شاعری تو درکنار اس کی کوئی ایسی تحریر بھی نہیں ملی جس میں اس نے اپنی علمی تصانیف ہی کو گنایا ہے جس طرح دیگر فضلاء نے کیا ہے فقط امام شہرستانی نے بکتاب العمد میں اپنی کوئی نو کتابوں کے نام گنائے ہیں متاخرین میں امام الدین الریاضی (مصنف التفتیح فی الہیہ) نے تذکرہ [illegible]

"ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے!"

——— از جناب کلدیپ سنگھ اختر

مرد۔ اُف! کس بلا کا طوفان ہے۔

عورت۔ کتنی بھیانک رات ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سال بھر کی بارش نے آج ہی برسنے کی قسم کھائی ہو۔

مرد۔ بچے کیا کر رہے ہیں؟

عورت۔ سعیدہ تو آٹھ ہی بجے سو گئی تھی۔ منیر کوئی دس بجے تک پڑھتا رہا۔ اب وہ بھی سو گیا ہے۔

مرد۔ اچھا کیا۔ بچوں کو جلد ہی سو جانا چاہیئے۔ اب کیا وقت ہو گا؟

عورت۔ ساڑھے گیارہ۔ (کلاک کی ایک ٹن سنائی دیتی ہے)

مرد۔ (جمائی لیتے ہوئے) ساڑھے گیارہ۔ اب ہمیں بھی سونا چاہیئے۔

(دور سے کسی کے گانے کی آواز اُبھرتی ہے)

ع ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے — شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے۔

عورت۔ کچھ سنا تم نے؟

مرد۔ کیا؟

بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم

(مع سوانح زندگی)

از

عبداللطیف اعظمی - ایڈیٹر ماہنامہ جامعہ دہلی

بابائے اردو مولانا عبدالحق کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کے کارنامے ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے۔ عبداللطیف اعظمی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ابواب کے تحت بابائے اردو کی زندگی اور ان کی شخصیت کو اُجاگر کر دیا ہے

باب اول — سیرت و شخصیت

باب دوم — مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو

باب سوم — علمی کارنامے

باب چہارم — مکاتیب عبدالحق

ہر مضمون مستند مشاہیر کے قلم کا مرہون منت ہے۔

عنقریب

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

یہ شاہکار شائع کر رہا ہے

عورت۔ اور یہ جانا کہاں ہے۔

مرد۔ غالب کے مزار پر بھئی چلو اب بہت دیر ہو گئی۔ سونا چاہیئے۔

عورت۔ چلو!

(وہی آواز پھر ابھرتی ہے)

؎ ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے

ایک آواز۔ ذرا رک جاؤ میرے بھائی۔ میرے رفیق

درویش۔ کون! یہ کس کی آواز ہے؟

آواز۔ میری۔

درویش۔ تم کون ہو؟

آواز۔ میں کوئی بھی ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ میرے بھائی۔ کہ تم ہر پیر کو یہاں کیا کرنے آتے ہو؟

درویش۔ یہاں پر میرے آقا۔ میرے مخدوم۔ میرے مرشد کا مزار ہے۔ میں اس مزار پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھانے آتا ہوں۔

آواز۔ کون ہے تمہارا آقا؟ تمہارا مخدوم۔ تمہارا مرشد!

درویش۔ جس کی غزل میں گا رہا تھا اور ہمیشہ گاتا ہوں۔

آواز۔ میاں میں کیا جانوں تم کس کی غزل گاتے ہو۔

درویش۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ "ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے"

آواز۔ ہاں! شاعر تو وہ اچھا ہے۔ پر بدنام بہت ہے! اچھا یہ بتاؤ۔ تم

(عورت۔) میرا خیال ہے۔ وہی درویش گاتا ہوا جا رہا ہے۔ غور سے سنو۔

(آواز قریب آرہی ہے)

مرد۔ (سنتے ہوئے) ہاں وہی ہے۔ عجیب انسان ہے۔ بارش سے گھبراتا ہے نہ طوفان سے۔ ہمیشہ اسی طرح اپنی دھن میں مست گاتا چلا جاتا ہے

(آواز بالکل قریب دور ہٹتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

(عورت۔) یہ ہے کون؟

مرد۔ غالب کا پرستار

عورت۔ غالب کا پرستار!

مرد۔ ہاں۔ غالب کا پرستار۔ بس ایک ہی لگن ہے اس کو!

عورت۔ وہ کیا۔

مرد۔ غالب سے ملنے کی۔

عورت۔ واقعی عجیب انسان ہے۔ اس زمانہ میں غالب سے ملنا چاہتا ہے کیا یہ جانتا نہیں۔ کہ اس کو تو مرے ہوئے بھی قریب ایک صدی ہو چکی ہے۔

مرد۔ جانتا کیوں نہیں۔ لیکن اس کا قول ہے کہ غالب زندۂ جاوید ہے وہ مر نہیں سکتا۔

عورت۔ تو پھر پاگل ہوگا۔

مرد۔ ایسا نہ کہو۔ بڑا عالم آدمی ہے۔ کبھی اس سے بات کرو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ علم و ذہانت کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔

[redacted]

[redacted]

[redacted]

چودھری محمد اسماعیل

سُود

(۲)

ان تمام تفصیلات سے یہ واضح ہے کہ صنعت و تجارت اور زراعت کا وہ حصہ جس میں بنکوں سے قرض لیا ہوا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرا حصہ جس میں نجی سرمایہ ہوتا ہے یکساں اصولوں کے ماتحت چل رہا ہے۔ دونوں حصے یکساں طور پر ناداروں کی محنت سے سیراب ہوتے ہیں۔ جس منبع سے بنکوں کے سرمائے کا سود پیدا ہوتا ہے۔ اسی منبع سے انفرادی صنعت و تجارت اور زراعت میں منافع، بٹائی اور کرائے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا ناداروں کی قوت محنت کے منبع سے جو دولت کے دریا پیدا ہوتے ہیں وہ جب بنکنگ کے ہیڈورکس سے گزر کر سرمایہ داری کو سیراب کرتے ہیں تو اس کا نام سود ہوتا ہے۔ اور جب اسی دریائے دولت سے افراد یا خاندان اپنے سرمائے کے کھیتوں کو ثمردار بناتے ہیں تو اس کا نام بٹائی، منافع یا کرایہ رکھ لیا جاتا ہے۔ درحقیقت پانی تو وہ ایک ہی ہے۔ صرف مختلف لوگوں نے مختلف جگہوں کے لحاظ سے اس کے نام مختلف رکھے ہوئے ہیں۔

سود کی تعریف

گویہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مروجہ نظام میں صنعت و تجارت کے منافع، مکانات وغیرہ کے کرائے اور زمینداری کے حصہ میں ایک ایسی زائد رقم ہوتی ہے جس کا اصطلاحی طور پر خواہ کچھ نام رکھ لیا جائے لیکن درحقیقت وہ سرمائے کا معاوضہ یعنی سود ہی ہوتی ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر اختر لکھتے ہیں یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ "سرمائے کی خدمات کا جو معاوضہ ادا کیا جاتا ہے اسے سود کہتے ہیں۔" لیکن بعض علما منافع، کرائے اور بٹائی وغیرہ میں سود کا عنصر شمار نہ کرنے کی وجہ سے سود کی تعریف کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب سود کی یوں تعریف کرتے ہیں:

"ربٰو یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے راس المال پر زائد لوں گا۔ اس معاملہ میں راس المال کے مقابل

انڈونیشی خواتین میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے متحد و منظم ہو رہی تھیں تو ہالینڈ میں تعلیم پانے والے انڈونیشی نوجوان بھی یورپ کی مختلف تحریکات سے متاثر ہو کر ایک قومی تنظیم قائم کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور وہ نوجوان سامنے آنے لگے تھے جو آگے چل کر اپنے ملک کی تحریک آزادی کے رہنما بنے۔ اسی زمانے میں انڈونیشیا کے تجارتی مرکزوں میں چینی اور انڈونیشی تاجروں کی شدید کش مکش شروع ہوئی اور انڈونیشی تاجر امداد باہمی کے اصول پر منظم ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ انڈونیشی تاجروں کی یہ تنظیم شرکت گانگ اسلام تھی جس نے ۱۹۱۱ء میں بڑی اہمیت حاصل کر لی اور جب ولندیزیوں نے اپنے چینی کارندوں کے مراعات کو برقرار رکھنے کے لیے یہ انجمن ختم کر دی تو اس کے ایک نوجوان رہنما عمر سعید نے شرکت اسلام کے نام سے اسلامی احیاء اور آزادی وطن کی وہ عظیم تحریک شروع کر دی جو اہل انڈونیشیا کے دلی جذبات اور تمناؤں کی ترجمان تھی اور جس نے انڈونیشیا میں سیاسی بیداری پیدا کر کے آزادی کی تحریک کو ملک گیر بنا دیا۔

باعث زحمت نہ ہو رہی ہو۔

غالب۔ منشی صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا

تفتہ۔ جی ہاں!

غالب۔ اور یہ بھی جانتے ہو کہ اب اس کے دونوں بچے میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں۔

تفتہ۔ جی ہاں۔

غالب۔ ہو سکتا ہے کہ تم یہ نہ جانتے ہو لیکن خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔

تفتہ۔ جی!

غالب۔ تو برخوردار تمہارے نتائج طبع میرے مصنوعی پوتے ہوئے۔

(ہلکی ہنسی)

تفتہ۔ قبلہ میں سمجھا نہیں۔

غالب۔ جانِ من! جب ان عالم ظاہر کے پوتوں سے میں تنگ نہیں آتا جو مجھ کو کھانا کھانے نہیں دیتے۔ دوپہر کو سونے نہیں دیتے ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ تو بھلا ان مصنوعی پوتوں سے کیوں گھبراؤں۔ جن میں یہ باتیں بھی نہیں۔

(سب ہنستے ہیں)

کلیان۔ حضور ایک صاحب تشریف لائے ہیں۔ اپنا نام نہیں بتاتے۔

غالب - جیتے رہو - لاؤ بھائی یہ تم نے بڑا کرم کیا، دیکھئے میرن صاحب کیسا بنا ہے چغہ!

میرن - چشم بد دور، بہت نفیس ہے حضرت!

غالب - بھائی اس چغہ کا بھی عجیب قصہ ہے۔

تفتہ - وہ کیا حضرت!

غالب - مدت سے آرزو تھی، کہ چغہ مالیدے کا بنواؤں۔ لیکن کبھی توفیق ہی نہ ہوئی وہ تو خدا بھلا کرے حکیم احسن اللہ صاحب کا کہ میری شراب کی مقدار پر پابندی لگا کر کچھ پیسے بچا دیئے۔ جو یہ چغہ بن گیا۔ تو صاحبو آپ کو یہ پسند آیا۔

سب - جی ہاں۔ ماشاء اللہ بہت عمدہ ہے۔

غالب - (آواز دیتے ہوئے) کلیان!

کلیان - (دور سے) آیا سرکار (قریب آکر) جی سرکار

غالب - بھائی یہ چغہ کلو داروغہ کے حوالے کر دو۔ اور کہدو اسے حفاظت سے رکھے۔ ہم کل اسے پہن کر قلعے میں جائیں گے۔

کلیان - جی بہت اچھا (جاتا ہے)

تفتہ - حضرت کچھ اشعار اصلاح کے لئے حاضر خدمت کئے تھے۔ ایک مدت ہوگئی۔ ابھی منتظر ہوں۔

غالب - ہاں بھئی مرزا تفتہ اصلاح میں کچھ دیر ہوگئی۔

تفتہ - معاف کیجیے گا مجھے ڈر تھا کہ میری کثرت اشعار آپ کے لیے

دیرینہ خادم ہوں۔ آپ برخوردار کو میرے پاس بھجوا دیجیے گا۔

نووارد۔ بہت بہت شکریہ مرزا صاحب! اچھا بھئی اب اجازت چاہوں گا

غالب۔ حضرت معاف کیجیے گا۔ گستاخی کر رہا ہوں۔ یہ فرغل جو آپ پہنے ہوئے ہیں، اس کی چھینٹ آپ نے کہاں سے لی۔

نووارد۔ کیوں؟

غالب۔ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

نووارد۔ بھئی یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔

غالب۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیجیے۔

نووارد۔ اگر آپ کو اس قدر پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔

غالب۔ حضرت جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں۔

نووارد۔ تو بسم اللہ!

غالب۔ لیکن سوچ رہا ہوں کہ جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔ ارے ہاں یاد آیا.... کلیان...

کلیان۔ جی سرکار

غالب۔ کلو داروغہ سے میرا وہ مالیدے کا جبہ یہاں لے آؤ۔

تفتہ۔ کونسا جبہ حضرت! جو آج ہی بن کر آیا ہے۔

غالب۔ ہاں وہی!

کلو۔ لیجیے سرکار

غالب۔ انہیں پورے احترام کے ساتھ لے آؤ۔

میرن۔ کون ہیں حضرت!

غالب۔ بھائی جانتا نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کوئی پرانے دوست ہوں گے۔
جو اس بے تکلفی سے آنا چاہتے ہیں۔

نووارد۔ (آتے ہوئے) السلام علیکم مرزا صاحب! کہئے مزاج تو اچھا ہے۔

غالب۔ آیئے آیئے نواب صاحب! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی پرانے
ملنے والے ہیں۔ کہئے حضرت آپ تو ایسا عید کا چاند ہوئے کہ
غدر کے بعد آج صورت دکھائی۔

نووارد۔ کیا عرض کروں۔ بھائی کچھ ایسا مصائب زمانہ کا شکار ہوا کہ جینے
سے بیزار ہو گیا۔

غالب۔ اجی حضرت گردش روزگار اور حیات انسانی کا چولی دامن کا ساتھ
ہے۔ کوئی بھلا کہاں تک اس سے بچے۔ لیکن آپ کی پریشانیوں کا
سن کر دلی رنج ہوا۔

نووارد۔ بھئی مرزا صاحب ایک عرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔

غالب۔ زہے نصیب فرمایئے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

نووارد۔ بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا لڑکا ذوق سخنوری رکھتا ہے۔ میں
چاہتا تھا کہ اگر آپ اس کے سر پر دست شفقت رکھیں۔ تو
ہو سکتا ہے کہ کسی دن اس میدان میں چل نکلے۔

[illegible]

تفضل۔ کیوں حضرات!

غالب۔ بھائی اگر ہزار پانچسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا۔ تو خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔

تفضل۔ میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا۔

غالب۔ لو اور غضب! میاں میرا کلام۔ خرید شکل سے آٹھ دس روپے کی سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک ہو۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھ کو مستعار دو میں اس کو دیکھ لوں۔ پھر تم کو واپس بھیج دوں گا۔ کیا سوچ رہے ہو کیا میرا اعتبار نہیں۔ یا مجھ کو آزار دینا اور ترسانا بدل منظور ہے

تفضل۔ جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔

غالب۔ تو پھر کیا بات ہے۔

تفضل۔ میں تو اپنی تقصیر پر پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کن الفاظ میں معذرت پیش کروں۔

غالب۔ میری جان تمہاری معذرت میرے کس کام آئے گی۔ اسے تو اپنے پاس ہی رکھو اور مجھے وہ کتاب بھجوا دو۔ باللہ واللہ نقل کر کے تم کو واپس نہ دوں۔ تو مجھ پر لعنت۔ اور اگر میری قسم کو نہ مانو تو تم پر آفریں۔

تفضل۔ بس حضرت مزید شرمسار نہ کیجئے۔ مجھ سے تقصیر ہوئی۔ معذرت چاہتا ہوں۔ اور آج ہی جا کر کتاب بھجواتا ہوں۔

غالب۔ لیجئے نواب صاحب آپ اسے زیب تن فرمائیے۔ اور یہ فرغل مجھے عنایت کر دیجئے۔

نووارد۔ جیسے آپ کی خوشی۔ اچھا بھئی مرزا صاحب اجازت ہے!

غالب۔ بہت بہتر۔ خدا حافظ!

تفتہ۔ حضرت یہ آپ نے کیا غضب کیا۔

غالب۔ تم نہیں جانتے برخوردار! انھوں نے ایسے اچھے دن دیکھے ہیں کہ میں نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ آج ان کے بدن پر چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھر آیا۔ اسے اتروا کر مالیدے کا چغہ پہنانا چاہتا تھا۔ لیکن اس اندازے کہ ان کا دل نہ دکھے۔

تفتہ۔ سبحان اللہ!

کلیان۔ سرکار حکیم تفضل حسین صاحب تشریف لائے ہیں۔

غالب۔ سبحان اللہ! ان کو فوراً لے کر آؤ۔

مہدی۔ کیوں حضرت یہ فوراً چہ معنی!

غالب۔ دیکھتے رہو۔ آنے دو ان حضرت کو۔ بورا دفتر کھولنا ہے شکایتوں کا مجھ کو ان کے سامنے۔

تفضل۔ (آتے ہوئے) تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

غالب۔ جیتے رہو۔ بیٹھو! کیوں صاحب! یہ بھتیجا ہونا اور شاگردی

وہ تو [illegible] ہو گیا۔

(سب ہنستے ہیں)

علاؤالدین۔ لیکن حضور.....

غالب۔ (بات کاٹ کر) لیکن ویکن کچھ نہیں۔ علاؤالدین خاں میری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی کر دیا تھا۔ اور وہ لڑکا نہ جیا۔ بھائی مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے۔ کہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔

علاؤالدین۔ یہ تو محض وہم ہے حضرت۔

غالب۔ محض وہم! برخوردار نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ صرف تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ میاں جس کی مدح میں نے دس بیس قصیدے کہہ ڈالے وہ عدم سے بھی پرے جا

(سب ہنستے ہیں)

علاؤالدین۔ حضرت میں تو بڑی امید لے کر.....

غالب۔ سنو صاحب! دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ اسم تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے۔

(سب ہنستے ہیں)

علاؤالدین خاں ایک میری بھی فرمائش ہے [illegible]

علاؤالدین۔ بسر و چشم!

(سب ہنستے ہیں)

مہدی۔ ماشاء اللہ

میرن۔ کیا اعلیٰ ظرف ہے۔

غالب۔ میر مہدی ذرا غور سے دیکھو۔ وہ سامنے کون چلا آرہا ہے!

مہدی۔ حضرت علاؤالدین احمد خاں صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

غالب۔ ماشاء اللہ۔

علاء الدین۔ (آتے ہوئے) نیازمند تسلیمات عرض کرتا ہے۔

غالب۔ آئیے آئیے تشریف رکھئے۔ کہو مولانا نیسی آپ کا مزاج اچھا ہے

علاؤالدین۔ اللہ کا شکر ہے۔

غالب۔ کیسے تشریف لائے۔

علاؤالدین۔ حضرت ایک فرمائش لے کر حاضر ہوا ہوں۔

غالب۔ یعنی۔

علاؤالدین۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند عطا کیا ہے۔ چاہتا تھا کہ اسم تاریخی آپ نکال دیں۔ اور تاریخ ولادت بھی کہہ دیں۔

غالب۔ سنو میاں۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے طریق صید فگنی سکھاتا ہے۔ لیکن جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ بھئی تم ماشاء اللہ سخنور ہو گئے ہو۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو اسم تاریخ کیوں نہ نکالو۔

غالب۔ بس صرف برسات تک۔ برسات گذر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی
پھر صاحب میم اور بابا لوگ اپنے اسی قدیم مسکن میں آ رہیں گے

(سب ہنستے ہیں)

علاؤ الدین۔ (ہنستے ہوئے) بہت بہتر آپ خاطر جمع رکھئے۔ انشاء اللہ
سب انتظام ہو جائے گا۔

غالب۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ (بات بدلتے ہوئے) صاحبو! کچھ
مرزا حاتم علی بیگ کی خبر سناؤ۔ وہ آج کل کس حال میں ہے۔

تفتہ۔ حضرت سنتے ہیں۔ ابھی تک اپنی محبوبہ چنا جان کی وفات کا
سوگ منا رہے ہیں۔

غالب۔ بھائی کوئی ان سے کہدو کہ ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ میاں
کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک
فشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی۔ بھائی خدا کے لئے۔ اس کو سمجھاؤ
کہ آزادی کا شکر بجا لائے اور غم نہ کھائے۔

میرن۔ لیکن وہ حضرت مانیں بھی۔

غالب۔ تو اگر ایسے ہی وہ اپنی گرفتاری سے خوش ہے تو بھی کیا
مشکل ہے۔ چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔

(سب ہنستے ہیں)

نہیں میاں یہ دل لگی نہیں حقیقت ہے۔

میرن۔ یہ حقیقت ذرا وضاحت طلب ہے۔

غالب۔ میاں میں آج کل بڑی مصیبت میں ہوں۔

علاؤالدین۔ حضرت خیر باشد۔

غالب۔ بھئی محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ دیوان خانے کا حال تم دیکھ ہی رہے ہو۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہے۔ "ہائے دبی ہائے مری۔"

بیرن۔ لیکن حضرت! آپ تو مرنے سے نہیں ڈرتے۔

غالب۔ بھائی میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ لیکن فقدان راحت سے گھبراتا ہوں۔

علاؤالدین۔ بجا ارشاد ہوا۔ اس مکان کی تو باقاعدہ مرمت ہونی چاہیئے۔

غالب۔ میاں۔ مینہ کھلے تو مرمت کچھ ہو۔ اور پھر اتنے عرصے میں بیٹھا کس طرح رہوں۔

علاؤالدین۔ فرمائیے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

غالب۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ اگر تم سے ہو سکے۔ تو بھائی سے کہہ کر وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے۔ اپنی پھوپھی کے رہنے کو دلادو۔ اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں میرے رہنے کو دلادو۔

علاؤالدین۔ یہ بالاخانہ میں نہ سمجھا۔ آپ کونسا فرما رہے ہیں۔

غالب۔ میاں وہی جو الٰہی بخش خان کا مسکن تھا۔

علاؤالدین۔ اچھا سمجھ لیا۔

مہدی اور تفتہ دونوں۔ نہیں حضرت ہم لوگ بھی اجازت چاہیں گے۔

غالب۔ اچھا بھئی خدا حافظ

تفتہ۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

غالب۔ جیتے رہو۔

(غالب کی محلسرا)

امراؤ بیگم۔ آج تو آپ کو کھانے میں بہت دیر ہو گئی۔

غالب۔ ہاں کچھ دیر ہی ہو گئی۔

بیگم۔ آج کسی سالن میں چنے کی دال نہیں ملے گی آپ کو

غالب۔ کیوں؟ دال گھر میں نہیں تھی تو بازار سے منگوائی ہوتی۔ یا مجھ سے کہا ہوتا۔ میں منگوا دیتا۔

بیگم۔ نہیں دال تو گھر میں موجود ہے۔ لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی اس لئے کسی چیز میں نہیں ڈالی گئی۔

غالب۔ اوہو! یہ بات ہے پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ سنو بیوی

بیگم۔ میں نہیں سنتی۔

غالب۔ ارے سنو تو! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی۔ کہ دنیا میں جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے اور کسی پہ نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا۔ کہ ارے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا۔ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔ ارے خدا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خ د

غالب ۔ بھائی میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ اگر
مغفرت ہو گئی ۔ اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی ۔ تو ذرا غور کرو
کہ اقامت جاودانی اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی

(سب ہنستے ہیں)

بھائی میرا تو اس تصور سے جی گھبراتا ہے ۔ کلیجہ منھ کو آتا ہے

علاؤ الدین ۔ کیوں !

غالب ۔ لو اور سنو ! سچ کہتا ہوں ۔ وہ حور اجیرن ہو جائے گی ۔ پھر
تم ہی بتاؤ ۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی ۔

(سب ہنستے ہیں)

مہدی ۔ حضرت بہشت میں طبیعت کیسے گھبرا سکتی ہے ۔

غالب ۔ برخوردار ذرا اندازہ کرو ۔ وہی زمرد کا محل اور وہی طوبیٰ کی
ایک شاخ ۔ چشم بددور وہی ایک حور ۔ میں تو حاتم علی سے یہی
کہوں گا ۔ کہ بھائی ہوش میں آؤ ۔ کہیں اور دل لگاؤ ۔

(سب ہنستے ہیں)

(اندر سے دوا کی آواز آتی ہے)

کلیان ۔ میاں بیگم صاحب کہلواتی ہیں ۔ کہ کھانا یہیں بھیج دیا جائے ، یا
محل سرا میں تشریف لائیے گا ۔

غالب ۔ غالب نہیں میں وہیں آتا ہوں ۔ بھئی تم لوگ چاہو تو یہیں کھالو ۔

بیگم۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ مجھے کس چیز کی کمی ہے۔

غالب۔ میرے پاس شعر کی دولت تھی۔ بے پناہ دولت۔ لیکن تمہارے کس کام کی۔ اور اگر دیکھا جائے تو میرے بھی کس کام کی۔ میں نے آج تک جو کچھ لکھا۔ اسے خود ہی سمجھا۔ لوگوں نے کہا مہمل بکتا ہے۔ میں نے اسے بھی تسلیم کیا۔ اب تو اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔۔ رنج اور ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ ظرافت کا پردہ ڈال کر اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ تم کیا جانو جب دکھ پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں۔ غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا۔ کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ دیکھو تو ذرا۔ نجم الدولہ بہادر کو ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ہے۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیجئے۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو کہو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔

بیگم۔ (پھوٹ پڑتی ہیں) مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ میں آپ کو سمجھ نہ سکی۔

(آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ شدہ)

اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی۔

(سب ہنستے ہیں)

بیگم۔ آپ کو تو بس باتیں بنانا آتی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں۔ آپ کی زندگی میں کبھی سنجیدگی بھی آئے گی۔

غالب۔ کیا کروگی میری زندگی میں سنجیدگی لاکر۔ ایسے ہی ٹھیک ہے

بیگم۔ ایسے کب تک چلے گا۔

غالب۔ جب تک وہ چلائے گا۔

بیگم۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔

غالب۔ سنو بیگم میں ہر ایک کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں۔ اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ خدا نے سات بچے دیئے۔ لیکن سب چھین لئے۔ صبر و شکر کرکے عارف کو بیٹا بنایا لیکن وہ بھی دغا دے گیا۔ اس راحت روح ناتواں کی جواں مرگی کا داغ کیا کم ہے جو مجھے سنجیدہ دیکھنا چاہتی ہو۔

بیگم۔ (روتے ہوئے) معاف کیجئے گا۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ آپ کا دل دکھاؤں۔

غالب۔ میں جانتا ہوں بیگم۔ مت بھولو کہ میں شاعر ہوں۔ ایک حساس دل رکھتا ہوں۔ میں تمہارے جذبات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اور سچ پوچھو تو کبھی کبھی مجھ کو تم پر ترس آتا ہے۔ میں [illegible]

اُردو زبان کے بہی خواہ

سوچئے۔ غور کیجئے

نو برس میں آپ نے اپنے ماہنامہ فروغ اُردو کی

ترویج و اشاعت کے لئے کیا کیا

ظاہر ہے کچھ نہیں

اس پُر آشوب دور میں

اپنا فرض پہچانتے ہوئے بیڑہ اٹھائیے کہ آپ

ماہنامہ فروغ اُردو کے

دس خریداروں سے بیس روپیہ مہیا کرکے ہم کو

روانہ کردیں گے

سب سے زائد اردو زبان کا بہی خواہ

وہی ہے

جو

اپنے اس فرض کو پہچانے

"مینجر"

مخزون چکلکوی اور طلوع سحر

——— وحشتی سحری بختیار پوری

میں آج قارئین فروغ اردو کو ہمارے ایک غیر معروف ادیب اور شاعر سے [illegible] کرانے کی جسارت کر رہا ہوں جسے میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جو ایک اچھے تخیل، اچھے جذبات اور اچھے طرز تحریر کا مالک ہے لیکن پھر بھی وہ اور شاعروں اور ادیبوں کی طرح شہرت حاصل نہ کر سکے۔ بلکہ گوشۂ گمنامی اور کلبۂ افلاس میں اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اوروں کی طرح کثرت نویس اور پیشہ ور شاعر یا ادیب نہیں ہیں۔ جو صرف لکھتے رہنے اور چھپتے رہنے ہی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ درآنحالیکہ مخزون چکلکوی کو بہار سرکار نے ان کی پہلی تصنیف "ساز ہستی" پر [illegible] تین سو روپے انعام سے نوازا اور ہندوستان و پاکستان کے مشہور افسانہ نگار جناب ایم اسلم نے ان کی تعریف ان لفظوں میں کی۔ "خدا مجھے یہ توفیق عطا کرے کہ میں بھی آپ جیسی کتاب لکھ سکوں" اس کے علاوہ منشی پریم چند اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگوں نے بھی ان کی ہمت افزائی کی۔ ان کے افسانے اور کلام

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی جدید شایع کردہ کتابیں

خرید کر اردو زبان کی خدمت انجام دیجئے

۱۔ بنانِ حرم۔ حضرت حمید صدیقی لکھنوی کا جدید ترین نعتیہ کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲/

۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شعری کلام کا مجموعہ مع سوانح حیات

مرتبہ:۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی قیمت دو روپیہ پچاس پیسے ۲/۸

۳۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ۔ ہندوستان اپنے تیسرے منصوبہ کی تکمیل کے بعد جو ترقی کرے گا۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر۔ مرتبہ:۔ منظر سلیم جرنلسٹ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

۴۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کی علمی ادبی خدمات اور ان کی مفصل سوانح حیات مرتبہ وصی تقاوی

۵۔ امداد باہمی۔ باہمی اشتراک اور تعاون سے زندگی جس خوش اسلوبی سے گذر سکتی ہے اس کی عملی تصویر۔ مرتبہ:۔ سید مصطفےٰ حسین رضوی مدیر سرفراز قیمت ۱/۲۵

۶۔ تنقید اور عملی تنقید۔ مع اضافہ جدیدہ پروفیسر احتشام حسین کے علمی ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ قیمت چار روپیہ

۷۔ شعر نو۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن قیمت ۱/۲۵

۸۔ پیارا سپنے ڈرامے۔ جو کہ ہندوستان میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن ۳/-

۹۔ مقدمہ شعر و شاعری حالی مطابق نصاب بی اے قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ۱/۸

۱۰۔ سورج اور اس کا کنبہ از سید انصار حسین قیمت آٹھ آنہ ۸/

۱۱۔ غالب نامِ آورم۔ علامہ غالب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کی نادر تحریریں اہل ذوق کے لئے مفید ثابت ہوتی رہیں گی۔ گورنر یوپی ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے بھی اس مجموعہ کو بہت ہی پسند کیا ہے مرتبہ نادم سیتاپوری قیمت چار روپیہ پچاس پیسے ۴/۸

اور خوبیاں بھی ہیں۔ خامیاں اس لئے کہ عزیز ورن چکلوی اپنی زندگی میں کسی کو استاد بنانے یا اس کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں جیسا کہ خود انھوں نے اپنے ناول ساز ہستی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں کسی انسان کا نہیں بلکہ فطرت کا شاگرد ہوں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کے قاعدہ اور پہلی کتاب کے علاوہ کسی سے ایک لفظ سیکھا نہ پڑھا۔ پھر بھی اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی میں اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی ساز بنانے والا ساز بنا سکتا ہے تو اس کا بجانے والا بلا اعانت غیرے اسے خود بجا کیوں نہیں سکتا۔ اور دراصل یہی انھیں وہ خصوصیت ہے جس کا ان سے برتنے والا معترف ہے۔ اور سب سے بڑی بات جسے سن کر آپ کو تعجب ہوگا وہ یہ ہے کہ یہ صرف بارہ سال کی عمر میں کسی درخت سے گر جانے کے بعد بالکل مفلوج ہو گئے۔ ایک ملازم ہے جو انھیں گود میں اٹھاتا یا کسی سواری پر سوار کرکے لے جاتا ہے۔ لیکن اتنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود وہ محض گفتار ہی کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی ہیں وہ خیالی انسان نہیں بلکہ ایک عملی انسان بھی ہیں۔ سیاست سے ان کا گہرا لگاؤ ہے اور اپنے علاقہ کے وہ اچھے سیاسی لیڈر بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید پورے ہندوستان میں بھی اتنا اپاہج اور مجبور انسان مشکل سے ملے گا۔ لیکن پھر بھی ذرا ان کی ہمت و عزم کا مشاہدہ کیجئے۔ اپنے ایک مایہ غزل میں کہتے ہیں۔

جسم مجبور سہی پر دل میرا مجبور نہیں		شمع بے نور سہی آنکھ تو بے نور نہیں
مانا میں ہمرہئ عمر کی پینگ مجبور سہی		ذہن آزاد تو پرواز سے معذور نہیں

ملک کے متعدد اعلیٰ پایہ رسائل میں شائع ہوئے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ ابھر نہ سکے۔ ایک نہیں نہ جانے کتنی نظمیں اور غزلیں۔ کتنے ناول اور افسانے انھوں نے لکھے جو یا تو ادھورے رہ گئے یا فنا ہوگئے کوئی چیز لکھنے کے بعد ان کی نگاہ میں خود نہیں جنچتی۔ انھیں اعلیٰ تخلیق کی تلاش رہتی ہے۔ زمین پر رہ کر بھی وہ تاروں کی بات سوچتے ہیں۔ آسمان سے پرے کی چیزوں کے متلاشی ہیں۔ طلوع مہر کی ایک نظم "تلاش" سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے ملاحظہ ہو۔

شعر و نغمات کی ان عام فضاؤں سے پرے
حسن و عشق کی رنگین اداؤں سے پرے
فکر و احساس کی دھیمی سی صداؤں سے پرے
ایک ایسی بھی صدا ہے کہ جو معلوم نہیں
میرے ادراک کو ہے ایسی صداؤں کی تلاش

یہی نہیں اور سنئے۔

وادیٔ دہر کے پرکیف چمن زار سے دور
لالہ و گل سے الگ سبزۂ و کہسار سے دور
اس پہ نکھرے ہوئے اس مہر ضیا بار سے دور
ایک ایسی بھی ضیا ہے کہ جو معلوم نہیں
میرے ادراک کو ہے ایسی ضیاؤں کی تلاش

طلوع مہر ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں خامیاں بھی ہیں

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

موجودہ تعلیم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

مقصد تعلیم تھا تعمیر انسانی کبھی — روح کی دنیا میں اس سے تھی درخشانی کبھی
اب وہی تعلیم ہے تخریب کا سرمایہ دار — آج اس کے نخل میں پھلتے ہیں زہر آلود بار

غرض وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مادی طور پر انسان ترقی کے بہت اونچے زینے پر پہنچ رہا ہے جیسے ؎

جانتا ہوں میں کہ ایک ادنیٰ سا طفل عہد نو
علم کے میدان میں ہے عہد کہن سے تیز رو

لیکن ؎

کشت انسانی میں تخم مہر بو سکتا نہیں — بحر قلزم سے بھی دل کا زنگ دھو سکتا نہیں
اپنے دل کی آگ کو وہ خود بجھا سکتا نہیں — پردۂ بینش نظر کو خود ہٹا سکتا نہیں

پھر وہ انسانی زندگی کے لئے ایک ایسی تعلیم یا نظام چاہتے ہیں جو زندگی کو زندگی، روحانیت اور انسانیت سے قریب تر کر دے۔ مثلاً ؎

جو اٹھائے ابر اک تعلیم کے کہسار سے — اور بدل دے دشت کو انسانی سبزہ زار سے
نفرت و شہرت کے قصر و بام کو جو توڑ کر — الفت و ایثار کی اینٹوں کو پھر سے جوڑ کر
دے بنا اک زندگی کا زیبا ایوان بلند — جس کی چوٹی تک کبھی پہنچے نہ دنیا کی کمند
اپنی چشم تر سے الفت میں گہر افشاں رہو — گلشن ہستی میں مانند صبا رقصاں رہو
ہو نشاں آب جو وہ گلشن رضا بردوش — تشنگان محفل عالم میں ہو مینا بدوش
خاک میں خود کو ملا کر جو ثمر پیدا کرے — اپنے چشم تر سے اوروں کو گہر باراں کرے

چشم بیکار ہے جس میں نہیں پرواز نگہ   دل وہ بیکار ہے جو عزم سے معمور نہیں

طلوع مہر کی ایک نظم بہ عنوان "عزم" کے بھی دو شعر سنئے :-

ہے مرد مجاہد نام اسی کا کانٹوں پر جو چلتا ہے
خوشیاں بھی اسی کو ملتی ہیں جو گود میں غم کی پلتا ہے

ہاں، عزم اگر ہو راسخ تو دشوار نہیں ہے منزل بھی
طوفان سے لڑنا جو جانے ساحل بھی اسی کو ملتا ہے

اس مجموعہ میں کل بائیس ۲۲ نظمیں ہیں۔ محزون جھکوی نے اس میں محض اصلاحی تعمیری اور انقلابی نظموں ہی کو پیش کیا ہے۔ ان کی غزلیات کافی اچھی ہیں جنھیں انھوں نے الگ کر دیا ہے اس مجموعہ کو پروفیسر عبدالاحد صاحب ٹی این جی کالج بھاگل پور نے دیکھ کر کہا تھا کہ محزون کے کلام میں اقبال اور جوش کے رنگوں کی آمیزش ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا بیشتر کلام محض طرز اقبال میں ہے اور انھوں نے محض اقبال سے اکتساب کیا یا اس کی خوشہ چینی کی ہے۔

ان کی تین نظمیں خاص طور سے اس رنگ میں ہیں۔ موجودہ تعلیم، موجودہ شاعری اور موجودہ ادب۔ موجودہ تعلیم میں انھوں نے بتلایا ہے کہ اگرچہ موجودہ انسان سائنس کا شہپر لگا کر آسمان پہ پرواز کر رہا ہے۔ لیکن وہ سرزمین انسانیت سے بہت دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نظم دراصل اقبال کے ان اشعار کی تشریح کرتی ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

افلاک سے بھی دور ہو انسان کی رسائی مجھ بال شکستہ کو وہ پرواز سکھا دے

پوری کتاب پر اگر تبصرہ لکھا جائے تو کافی طویل ہو جائے گا۔ کتاب میں کچھ کتابت کی بھی خامیاں ہیں اور کچھ شاعری کی بھی۔ چند نمونہ کلام ملاحظہ ہوں

کلی سے :-

یہ چمن ہے اے کلی محروم آئین وفا بے نیاز سوز الفت درد سے نا آشنا
کیا بتاؤں تجھ کو کیا ہے اس چمن کی زندگی ابن آدم کی غلامی اہل زر کی زندگی
رات بھر کھیلے گا تجھ سے صاحب ثروت کوئی صبح دم ہو گی پڑی تو خاک پہ مسلی ہوئی

کیا چارہ گر سے

دعویٰ تو بہت تھا اے انساں! انداز مسیحائی پہ تجھے
جب تجھ سے علاج دل نہ ہوا پھر خاک مسیحا کیا ہوگا

خام ابھی سے

انساں ہو کھویا ہوا تشریح خرد میں اسرار محبت کی ہے تفسیر ابھی خام

دانشور تھا (طنزیہ) :—

دماغ میں تیرے گو ہوں روشن ہزاروں فانوس علم و فن کے
کبھی اجالا نہ کر سکے گا، نہ جانتا گر ہو کر کا فن
زباں تیری عمل کے تابع ہوئی تو تیرا وجود فانی
خلوص میں گر ابھر گیا تو، تو تیری ہستی ہے تیرا مدفن

یہ اس گمنام شاعر کا تعارف ہے جو جسمانی اور مادی دونوں طاقتوں سے محروم ہیں۔ جیسا انھوں نے خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

موجودہ شاعری میں وہ ایسے شاعر کے جویندہ ہیں یا وہ خود ایسے زندگی کے متلاشی ہیں۔ جس کے پیغام عمل سے موجودہ فرسودہ زندگی بدل جائے اور جو انسانیت کے افق پر ایک آفتاب نو کو جلوہ گر کر سکے۔ ان کی نظر میں شاعر وہ ہے۔

جو اٹھا دے چہرۂ گیتی سے یہ خاکی نقاب کھول دے جو کنہ ہستی کا یہ پیچیدہ باب
چشم باطن کو دکھا دے جلوۂ حسن ازل روح میں بیدار کر دے جلوۂ ذوق عمل
اس فضا تک لے چلے جو شہپر تخیل کو جس جگہ یہ فکر انسانی کبھی پہنچا نہ ہو

شعرا نے مختلف انداز میں مناجات یا حمد لکھے ہیں خود اقبال کی یہ دعا آج بھی ہر بچہ کی زبان پر ہے۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

لیکن محروم چکلوی کی مناجات کا انداز بالکل نرالا اور اچھوتا ہے۔ ان کی نظم دعا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے خالق عالم تجھے بندے کی قسم ہے کر میری نگاہوں میں وہ تنویر ہویدا
جو چاند ستاروں کی ضیا کا نہ ہو شکوہ دنیا میں ضیا جس کی نگاہوں سے ہویدا

بیگانہ ہے جس راز سے افکار کی دنیا وہ راز میرے قلب و نظر کو تو عطا کر
وہ ساز محبت کہ جو پنہاں ہو ابھی تک اس ساز کو یا رب! میرا ہمدوش نوا کر

انسان وہ انسان جو انساں نہ رہا ہے اسے انسان بنانے کا مجھے راز سکھا دے

فروغ اردو کی خدمت میں محزون چکلوی کی زیر تصنیف ناول کا اقتباس پیش کروں گا تاکہ وہ ان کی نثر نگاری سے بھی روشناس ہو سکیں۔

(س)

۱۳۲۔ سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۲/۰
۱۳۳۔ سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۱/۰
۱۳۴۔ سنگ گہر	سیّد احتشام حسین	۲/۰
۱۳۵۔ ساحل و سمندر	" "	۲/۵۰
۱۳۶۔ سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	علی عباس حسینی	۲/۵۰
۱۳۷۔ سرمایہ زبان اردو	جلال لکھنوی	۳/۵۰
۱۳۸۔ سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	۵/۰
۱۳۹۔ سفر حجاز	عبد الماجد دریابادی	۵/۰
۱۴۰۔ سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۱۴۱۔ سیاحت زمین (ناول)	محمود اعظم فہمی	۱/۰
۱۴۲۔ سید سالار مسعود غازیؒ	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۱۴۳۔ ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۲/۵۰
۱۴۴۔ سنہرا حلقہ	" "	۲/۵۰
۱۴۵ سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴۶۔ سوشل اسٹیڈی	احمد محسن کاکوروی	۲/۷۵

(ش)

۱۴۷۔ شعر نو (جدید تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۰
۱۴۸۔ شبلی نعمانی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴۹۔ شرح دیوان غالب (جدید اڈیشن)	نظم طباطبائی	۴/۵۰

سراج لکھنوی :-

شکست کھا کے بھی فتح و ظفر کی بات کرو — سوادِ شام کو چھوڑو سحر کی بات کرو
یہ چار دن کی حسین چاندنی ہے ننگ چمن — نہا کے خون میں گلہائے تر کی بات کرو
جب اہل ہوتا تو جلووں کا مول بھی کرتا — ابھی تو اپنی متاعِ نظر کی بات کرو
وہیں کہیں مجھے ڈھونڈو جہاں میں کھو یا تھا — گھما پھرا کے اسی رہگذر کی بات کرو

آنند نرائن ملا :-

جن چاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے
ایسوں سے نہ مل پائیں بھی اگر نادیدہ عقیدت ہوتی ہے
کیسی ہی حقیقت ہو لیکن بیکس کی زباں پر افسانہ
آتی ہے تب طاقت پر جب تب جا کے حقیقت ہوتی ہے

حبیب احمد صدیقی :-

لالہ ہے زخم خوردہ تو گل دل فگار ہے — اہل چمن کے خون سے نمودِ بہار ہے
یوں سن رہا ہوں ناصحِ مشفق کی گفتگو — ترکِ وفا پہ جیسے مجھے اختیار ہے
ہم سے نہ بت پرست ہی خوش ہیں نہ بت شکن — فکر و نظر کی بات ہر اک دل پہ بار ہے

سید صدیق حسن :-

وہ لذتِ خلشِ سینۂ فگار کہاں — ز شام تا بہ سحر جشنِ انتظار کہاں
نشاطِ غم جو نہیں ہو تو زندگی بے کیف — نہ ہو خزاں تو پھر آسائشِ بہار کہاں
ادائے ناز کو اب فرصتِ ستم ہی نہیں — شکستِ شیشۂ دل وہ بھی بار بار کہاں
گئے وہ دن کہ جنوں خیز تھی ہوائے چمن — بہار ہو بھی تو داماں تار تار کہاں

محفل شعر و ادب

گورنر گجرات نواب مہدی نواز جنگ کے اعزاز میں ۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو راج بھون کے آراستہ دربار ہال میں ایک کامیاب بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جس میں تقریباً ۲۵ ممتاز مقامی شعراء نے شرکت کی۔

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر بی۔ راما کرشنا راؤ اور گورنر گجرات نواب مہدی نواز جنگ شروع سے آخر تک شریک بزم رہے اور شعراء کے اچھے اشعار پر داد دیتے رہے۔

معززین شہر، اعلیٰ حکام، ممبران مجالس قانون ساز اور ادب دوست خواتین نے جن شعراء کے کلام کو زیادہ پسند کیا ان کا انتخاب ناظرین فروغ اردو کی ادبی دلچسپی کے پیش نظر درج ذیل ہے۔

(نمائندہ شعر و ادب)

اثر لکھنوی :-

زندگی موت پہ جو ہنستی ہے — جتنی مہنگی ہے اتنی سستی ہے
زندگی نام تھا محبت کا — یا محبت کو اب ترستی ہے
دل کہ تھا شہر آرزوؤں کا — اب وہاں صرف یاس بستی ہے
کوئی غمخوار اب کسی کا نہیں — خود پرستی ہی خود پرستی ہے

کاکل دیر سنواریں سحر نو لائیں — ہم سفر راہ میں لیکن دل ناداں بھی تو ہو
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب ختم ہوئی مشق ستم — ہائے پھر سامنے وہ چشم پشیماں بھی تو ہو

عرفان لکھنوی :-

خوشا ہنگام مستی لے خوشا آغاز میخانہ — نہ تھے دیر و حرم گونجی تھی جب آواز میخانہ
نہ وہ عنوان مینوشی نہ وہ رسم وفا کوشی — بہت بدلے ہوئے ہیں ان دنوں انداز میخانہ
جو ہوتا آشکارا بھی زمانے میں تو کیا ہوتا — نہ جانے پینے والے پی گئے کیوں راز میخانہ

ساحر لکھنوی :-

توڑ کر ہر رشتہ محکم چلے — اب ہمارے ساتھ تیرا غم چلے
زندگی نے ڈھائے ہیں کیا کیا ستم — آپ اور ہم کبھی باہم چلے
یاد جاناں اور یوں آواز دے — رخصت اے فکر زمانہ ہم چلے

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل :-

کسی صورت سے ساقی کی طرف مائل نہیں ہوتی
مری تشنہ لبی تسکین کی قائل نہیں ہوتی

بھلانے کی مسلسل کوشش ناکام کرتا ہوں
تصور سے وہ تصویرِ ستم زائل نہیں ہوتی

خلیل اس دور میں اکثر یہ دیکھا ہے زمانے میں
کسی کی راہ میں بے دانشی حائل نہیں ہوتی

عمر انصاری :-

نام رندوں سے جو مرا سرِ میخانہ سنا
لبِ ساقی سے گرا چھوٹ کے پیمانہ سنا

اس ادائے کرم پرسشِ غم کے قرباں
جب سنا حال تو جیسے کوئی افسانہ سنا

میں نہ کہتا تھا وہ آئیں گے نہ بجھ شمعِ حیات
بدنصیب آج ہی تو نے مرا کہنا نہ سنا

یوں ہی شاید دلِ بیتاب کو نیند آجائے
اے چراغِ شبِ ہجراں کوئی افسانہ سنا

امین سلونوی :-

افسانۂ وفا تو پڑھا ہے کتاب میں
لیکن وفا کہاں ہے جہانِ خراب میں

اس دورِ میکدہ میں نہ پیاسا رہے کوئی
ساقی مرا لہو بھی ملا لے شراب میں

انساں کے ہاتھ سرخ ہیں انساں کے خون سے
انسان کا ضمیر ابھی تک ہے خواب میں

محضر لکھنوی :-

مہرباں کی نگاہوں کے اشاروں پہ نہ تھی
زندگی جن سے گذری کہ سہاروں پہ نہ تھی

یہ حقیقت ہے مگر کس کو یقین آئے گا
ملی طوفاں میں وہ راحت جو کناروں پہ نہ تھی

جب کھلی آنکھ تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
زندگی ہوش میں آئی تو بہاروں پہ نہ تھی

ذوالنورین :-

درد ہے دل میں اگر درد کا درماں بھی تو ہے
زہر آلود ہے الفت جاناں بھی تو ہے

کلیاتِ ولی (مع اضافہ جدید)

اور

ولی کا دبستان شاعری (مع اضافہ جدیدہ)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی مایہ ناز دونوں تخلیقات عنقریب

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے

تاریخ کا انتظار کیجیے

عکس اور آئینے

سید احتشام حسین رضوی کے

تازہ ترین تنقیدی مضامین کا مجموعہ عنقریب

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

شائع کر رہا ہے

تاریخ کا انتظار کیجیے

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو

به ترتیب حروف تہجی مع قیمت

الف

۱	ایرانی ادب	آفتاب اختر علی تلہری	بچھتر پیسے
۲	ادب اور جدید	آفتاب اختر علی تلہری	دو روپیہ پچیس پیسے
۳	انداز نظر	صفیہ اختر	دو روپیہ
۴	ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	پانچ روپیہ
۵	آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	دو روپیہ آٹھ آنے
۶	افادات مہدی	مہدی افادی	چار روپیہ آٹھ آنے
۷	امداد باہمی	سید مصطفیٰ حسین	چار روپیہ
۸	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	دو روپیہ آٹھ آنے
۹	انار کلی	امتیاز علی تاج	دو روپیہ آٹھ آنے
۱۰	اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری	چار روپیہ آٹھ آنے
۱۱	اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	پانچ روپیہ
۱۲	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	تین روپیہ
۱۳	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا لکھنوی	تین روپیہ
۱۴	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	ایک روپیہ آٹھ آنے
۱۵	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	چار روپیہ

۳۰- اچھی نظمیں	اختر مشتاق	پانچ آنے
۳۶- اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دوجلد جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت		دس روپے
۳۷- اردو شاعری	امیر احمد علوی	ایک روپیہ آٹھ آنے
۳۸- اپنی پہچان	اعجاز احمد فاروقی	ایک روپیہ چار آنے
۳۹- اللہ کے پیارے	امیر حسن نورانی	آٹھ آنے
۴۰- ادبی معرکہ نمبر	مرتبہ فروغ اردو	بارہ آنے
۴۱- ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی	عبدالماجد دریابادی	ایک روپیہ چار آنے
۴۲- اردو عروض	کاوش بسوی	ایک روپیہ
۴۳- اسپین کی شہزادی	صادق سرو صنوی	چار روپیہ آٹھ آنے
۴۴- اسپین کا مجاہد	مائل ملیح آبادی	دو روپیہ بارہ آنے
۴۵- ایک جان تین قالب	خان محبوب طرزی	چار روپیہ
۴۶- الفت	" "	پانچ روپیہ آٹھ آنے
۴۷- آغاز سحر	" "	چار روپیہ
۴۸- امین آباد	" "	چار روپیہ
۴۹- اپنی موج میں	آزاد	دو روپیہ
۵۰- ایجادوں کی باتیں	مصطفیٰ احسن رضوی	دو روپیہ
۵۱- اردو ادب کی جدید تاریخ	نسیم قریشی	تین روپیہ
۵۲- اچھی کہانیاں	شمس الدین نوری	چار آنے

ب

۱۶	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریابادی	تین روپیہ
۱۷	اعلام القرآن یا شخصیات قرآنی	" "	دو روپیہ چار آنے
۱۸	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	چار روپیہ
۱۹	انشاء اللہ خاں انشا عہد اور فن	اسلم پرویز	چار روپیہ
۲۰	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	چار روپیہ
۲۱	ادب کیا ہے؟	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	دو روپیہ چار آنے
۲۲	ایک نادر روزنامچہ	" " "	دو روپیہ
۲۳	ادب کا مقصد	" " "	تین روپیہ
۲۴	ادب اکبر	مجنوں گورکھپوری	چھ آنے
۲۵	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	چار روپیہ
۲۶	اردو کی کہانی	سید احتشام حسین	ایک روپیہ
۲۷	ادب پارے نثر و نظم	" "	چار روپیہ بارہ آنے
۲۸	انتخاب نثر جدید	" "	دو روپیہ آٹھ آنے
۲۹	ابو الکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	چار آنے
۳۰	۱۸۵۷ء کا بہترین ادب	امداد صابری	پانچ روپیہ آٹھ آنے
۳۱	۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا	" "	چھ روپیہ بارہ آنے
۳۲	ارمغان نثر و نظم	عبداللہ خاں خلیل	تین روپیہ آٹھ آنے
۳۳	آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	دو روپیہ آٹھ آنے
۳۴	افسانہ نمبر	مرتبہ فروغ اردو	ایک روپیہ آٹھ آنے

تلوک چند محروم	جگن ناتھ آزاد	چار روپیہ
تعارف تاریخ اردو	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	تین روپیہ پچاس پیسہ
تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی	تین روپیہ
تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	تین روپیہ آٹھ آنے
تنقیدی نظریات	"	پانچ روپیہ
تنقید اور عملی تنقید	"	چار روپیہ
تاریخ ادب اردو	عبدالشکور	(زیر طبع)
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	تین روپیہ آٹھ آنے
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	دو روپیہ آٹھ آنے

ٹ

ٹیگور	نادم سیتاپوری	دو روپیہ
ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	دو روپیہ

ث

ثنائے حبیب (نعتیہ کلام)	بہزاد لکھنوی	ایک روپیہ بارہ آنے

ج

۸۱۔ جواہرات اسمعیل	شجاعت علی سندیلوی	ایک روپیہ
۸۲۔ جنگ آزادی نمبر ۱	رسالہ فروغ اردو	ایک روپیہ آٹھ آنے
۸۴۔ جنگ آزادی نمبر ۲	" "	ایک روپیہ آٹھ آنے
۸۵۔ جوئے رواں	حامد اللہ افسر	دو روپیہ آٹھ آنے

۵۳	بستانِ حرم (نعتیہ کلام)	از مرحوم حمید لکھنوی	ایک روپیہ آٹھ آنے
۵۴	بڑا سنگھ (شہید محبت)	خان محبوب طرزی	چار روپیہ
۵۵	بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	دو روپیہ آٹھ آنے
۵۶	ہماری اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر اختر اورینوی	سات روپیہ آٹھ آنے
۵۷	بوئے گل	شبلی نعمانی	چھ آنے
۵۸	باقیاتِ فانی	فانی بدایونی	تین روپیہ
۵۹	بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی کاکوروی	چار روپیہ
۶۰	بہشتی ثمر اول دوم	خلاصہ بہشتی زیور	دو روپیہ بارہ آنے
۶۱	بانیٔ اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ)		بارہ آنے
۶۲	بے ساختہ اور بے ضابطہ	وجاہت علی سندیلوی	دو روپیہ بارہ آنے

پ

۶۳	پیاری باتیں	محسن کاکوروی	تین آنے
۶۴	پتھر کی دیوار	علی سردار جعفری	دو روپیہ آٹھ آنے
۶۵	پھولوں کا انبار (ناول)	منظر سلیم	چار روپیہ آٹھ آنے
۶۶	پیسہ اور پرچھائیں	ڈاکٹر محمد حسن	دو روپیہ آٹھ آنے
۶۷	پاگل خانہ	مائل ملیح آبادی	تین روپیہ چار آنے
۶۸	پیغام	ڈاکٹر طاہر دیالپوری	تین روپیہ
۶۹	پردیسی کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	تین روپیہ آٹھ آنے

ت

۱۔ خبطی (مزاحیہ)	محمد علی واحدی	ایک روپیہ آٹھ آنے

د

۱۰۳۔ داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	چار روپیہ
۱۰۴۔ دو تذکرے	پروفیسر کلیم الدین احمد	سات روپیہ آٹھ آنہ
۱۰۵۔ دیوان صفی	صفی لکھنوی	دو روپیہ
۱۰۶۔ دلی کا یادگار مشاعرہ		ایک روپیہ
۱۰۷۔ دستہ گل (نظم)	شبلی نعمانی	چھ آنے
۱۰۸۔ دوشیزۂ قاف	خان محبوب طرزی	پانچ روپیہ
۱۰۹۔ دلربا	" "	تین روپیہ

ڈ

۱۱۰۔ ڈاکٹر نذیر احمد	انور محسن	چھ آنے
۱۱۱۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں	عبدالماجد دریابادی	دو روپیہ

ذ

۱۱۲۔ ذوق ادب و شعور	پروفیسر احتشام حسین	تین روپیہ آٹھ آنے
۱۱۳۔ ذوق و جنوں	آل احمد سرور	تین روپیہ آٹھ آنے

ر

۱۱۴۔ روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	چار روپیہ
۱۱۵۔ راگنی	شجاعت علی سندیلوی	چھ آنے
۱۱۶۔ رخسار سحر	انصر کریم قدوائی	ایک روپیہ آٹھ آنے

۸۶	جادو کی آنکھ	ڈاکٹر اثر بگرامی	تین روپیہ آٹھ آنے
۸۷	جگ ہنسائی	قیصر تمکین	دو روپیہ آٹھ آنے
۸۸	جلسے	معین (نوین درد)	ایک روپیہ بارہ آنے
۸۹	جمیلہ بو الحری (ناول)	خان محبوب طرزی	چار روپیہ آٹھ آنے
۹۰	جگر نمبر اول دوم	مرتبہ فروغ اردو	سات روپیہ آٹھ آنے

چ

۹۱	چوتھی بہن	مسیح الحسن رضوی	دو روپیہ بارہ آنے

ح

۹۲	حالی بحیثیت شاعر	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	آٹھ روپیہ آٹھ آنے
۹۳	حسرت موہانی	عبدالشکور	تین روپیہ
۹۴	حسرت تعمیر	ڈاکٹر اختر اورینوی	آٹھ روپیہ آٹھ آنے
۹۵	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	چار روپیہ آٹھ آنے
۹۶	حکایات صحابہ	مولانا محمد زکریا	دو روپیہ
۹۷	حیات سرسید	ڈاکٹر عبدالحق	چار روپیہ

خ

۹۸	خضر راہ (مع ترجمہ)	.. .. ..	آٹھ آنے
۹۹	خلاصہ روح تنقید	.. .. ..	ایک روپیہ
۱۰۰	خلاصہ حیات جاوید	.. .. ..	ایک روپیہ
۱۰۱	خلاصہ قواعد اردو	عبدالحق	ایک روپیہ

۱۳- سنہرا حلقہ	ناظر کاکوروی	آٹھ آنے
۱۳- سرسید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	چھ آنے
۱۲- سرسید احمد	" "	چار روپیہ
۱۲- سورج اور اس کا گھرانا	انصار حسین	آٹھ آنے

ش

۱۳- شعر نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	چار روپیہ
۱۳- شبلی نعمانی	انوار الحسن صدیقی	چھ آنے
۱۰- شرح دیوان غالب جدید اڈیشن	(نظم طباطبائی)	چار روپیہ آٹھ آنے
۱۲- شکست کی آواز	قاضی عبدالستار	تین روپیہ
۱۲- شاہان مالوہ	امیر احمد علوی	ایک روپیہ آٹھ آنے
۱۲- شعر العجم کامل ۵ جلد	شبلی نعمانی	اٹھارہ روپیہ
۱۲- شمع و شاعر	اقبال	چھ آنہ

ص

۱۱- صید و ہدف	غلام احمد فرقت	دو روپیہ آٹھ آنے

ط

۱- طوفان کی کلیاں	کرشن چندر	چار روپیہ
۱۲- طرزی نمبر (خان محبوب طرزی)	(مرتبہ فروغ اردو)	دو روپیہ
۱۴- طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہے	غلام الثقلین	چھ آنے
۱۴- طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	ایک روپیہ چار آنے

۱۱۷۔ روحِ آزاد	یونس خالدی	دو روپیہ
۱۱۸۔ رفتار (ناول)	وحشی محمود آبادی	تین روپیہ آٹھ آنہ

ز

۱۱۹۔ زیرِ لب	(صفیہ کے خطوط)	چار روپیہ آٹھ آنہ
۱۲۰۔ زینب ساحرہ	وحشی محمود آبادی	تین روپیہ
۱۲۱۔ زینوں کا بادشاہ حکیم بابا	علی عباس حسینی	تین روپیہ

س

۱۲۲۔ سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	تین روپیہ
۱۲۳۔ سرودِ نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	تین روپیہ
۱۲۴۔ سنگ گہر	سید احتشام حسین	تین روپیہ
۱۲۵۔ ساحل و سمندر	" "	چار روپیہ آٹھ آنہ
۱۲۶۔ سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری	علی عباس حسینی	ایک روپیہ آٹھ آنہ
۱۲۷۔ سرمایۂ زبانِ اردو	جلال لکھنوی	تین روپیہ
۱۲۸۔ سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	پانچ روپیہ
۱۲۹۔ سفرِ حجاز	عبدالماجد دریابادی	پانچ روپیہ
۱۳۰۔ سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	تین روپیہ آٹھ آنے
۱۳۱۔ سیاحتِ زمین	محمود اعظم فہمی	ایک روپیہ
۱۳۲۔ سید سالار مسعود غازی	وحشی محمود آبادی	تین روپیہ آٹھ آنے
۱۳۳۔ ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	تین روپیہ آٹھ آنے

۱۶- قدر و نظر	اختر اورینوی	چار روپیہ
۱۶- قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	دو روپیہ
۱۶- قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	تین روپیہ چار آنے
۱۶- قیامت صغریٰ	خان محبوب طرزی	تین روپیہ

ک

۱۶- کف گلفروش	غلام احمد فرقت	تین روپیہ
۱- کائنات تبسم	شوکت تھانوی	تین روپیہ آٹھ آنے

گ

۱۱- گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	ایک روپیہ آٹھ آنے

ل

۱۷- لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	چار روپیہ
۱۷- لب بام	عادل رشید	پانچ روپیہ
۱۷- لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	ایک روپیہ

م

۱۷- ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	ایک روپیہ پچاس پیسے
۱۷- میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	تین روپیہ آٹھ آنے
۱۷- معراج العاشقین	بندہ نواز گیسو دراز	دو روپیہ
۱۷- موسم گل (ناول)	عادل رشید	چھ روپیہ
۱۸- مداوی	ضیا عظیم آبادی	ایک روپیہ چار آنہ

۱۵۰۔ طرۂ امیر	امیر احمد علوی	ایک روپیہ چار آنہ

ع

۱۵۱۔ عذرا	صالحہ عابد حسین	پانچ روپیہ
۱۵۲۔ عرب (ناول)	مائل ملیح آبادی	(زیر طبع)

غ

۱۵۳۔ غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	چار روپیہ آٹھ آنہ
۱۵۴۔ غزنی دروازہ	مائل ملیح آبادی	چار روپیہ آٹھ آنہ

ف

۱۵۵۔ فن خطابت	کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ	پانچ روپیہ
۱۵۶۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	چار روپیہ آٹھ آنہ
۱۵۷۔ فریدہ (ناول)	خاں محبوب طرزی	دو روپیہ
۱۵۸۔ فلسفہ اقبال	عبدالقوی دریابادی	تین روپیہ آٹھ آنہ
۱۵۹۔ فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	تین روپیہ آٹھ آنہ
۱۶۰۔ فروغ جام (جدید ایڈیشن)	نشور واحدی	دو روپیہ آٹھ آنہ
۱۶۱۔ فغان محسن	محسن کاکوروی	تین آنہ
۱۶۲۔ فنون لطیفہ اور جمالیات	مظہر حسین	پانچ روپیہ آٹھ آنہ

ق

۱۶۳۔ قصائد مومن مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	چار روپیہ آٹھ آنہ
۱۶۴۔ قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	سات روپیہ

۱۹۸۔ نغمۂ کوہسار (ناول)	خان محبوب طرزی	چار روپیہ
۱۹۹۔ نقوش فانی	کبیر احمد جائسی	دو روپیہ
۲۰۰۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	تین روپیہ
۲۰۱۔ نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	تین روپیہ آٹھ آنے
۲۰۲۔ نوروز "	مائل ملیح آبادی	چار روپیہ آٹھ آنے
۲۰۳۔ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدید)	آل احمد سرور	پانچ روپیہ
۲۰۴۔ نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	تین روپیہ آٹھ آنے
۲۰۵۔ نیلم	انتظار حسین	تین روپیہ

ھ

۲۰۶۔ ہمارا گاؤں	علی عباس حسینی	تین روپیہ
۲۰۷۔ ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	بارہ آنے
۲۰۸۔ ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	ایک روپیہ آٹھ آنے
۲۰۹۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	ایک روپیہ آٹھ آنے
۲۱۰۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	ایک روپیہ آٹھ آنے

ی

۲۱۱۔ یاقوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	تین روپیہ آٹھ آنے
۲۱۲۔ یادگار انیس	امیر احمد علوی	تین روپیہ

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو، ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ

۱۸۰۔ مجبور (ناول)	خان محبوب طرزی	چار روپیہ آٹھ آنے
۱۸۱۔ مطالعہ حالی	ناظر کاکوروی و شجاعت علی سندیلوی	چار روپیہ
۱۸۲۔ مطالعہ شبلی	" "	چار روپیہ
۱۸۳۔ میٹھے بول	شجاعت علی سندیلوی	ایک روپیہ چار آنے
۱۸۴۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	ایک روپیہ
۱۸۵۔ مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	پانچ روپیہ بارہ آنے
۱۸۶۔ معرکہ روم و یونان	صادق دہلوی	چھ روپیہ
۱۸۷۔ مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	چار روپیہ
۱۸۸۔ مقدمہ شعر و شاعری	حالی	دو روپیہ
۱۸۹۔ مرثیہ غالب	"	چار آنے
۱۹۰۔ مجموعہ کربلا	جرجی زیدان	تین روپیہ آٹھ آنے
۱۹۱۔ معمار	مائل ملیح آبادی	چار روپیہ آٹھ آنے
۱۹۲۔ مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	چھ آنے
۱۹۳۔ مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	دو روپیہ
۱۹۴۔ مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	آٹھ آنے
۱۹۵۔ مجذوب اور انکا کلام	" "	ایک روپیہ آٹھ آنے

ن

۱۹۶۔ نقش حالی اول و دوم	احتشام حسین نور الحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی گیان چند	
۱۹۷۔ نقد و نظر	اعجاز احمد عجز	دو روپیہ

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

اعزازی مدیر

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

شائع کردہ

ادارہ فروغ اردو

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰ لائسنس نمبر ۳۹۶/۵ ٹیلیفون نمبر 26135

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کا علمی ادبی تنقیدی

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

اپریل ۱۹۶۳ء

سالانہ قیمت: دو روپیہ
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ادارت

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
صدر شعبۂ اُردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

مدیر

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایم اے پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے (مدیر)

نظامت

محمد حسین شمس قاسمی کاکوروی منیجنگ ڈائرکٹر
رضی احمد۔ آفس انچارج

ترسیل زر کا پتہ

(۱) ۷/۳ ۔ امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

(۲) مبارک بک ڈپو بندر روڈ
متصل ڈینسو ہال کراچی (پاکستان)

اپنی باتیں

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

چینی جارحیت اور فرقہ پرستی، ہندوستان کے دو بڑے دشمن ہیں، اور یہ دونوں دشمن انتہائی مکار اور عیار ہیں۔ فریب، دھوکا، وعدہ خلافی ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ چینی جارحیت بیرونی دشمنی ہے، اور فرقہ پرستی اندرونی دشمنی۔ چینی جارحیت کے مقابلہ کے لئے مادر وطن کا ہر سپوت جان کی بازی لگا چکا ہے۔ اب وہ پر فریب اشتراکیت کے دھوکے میں نہیں آئے گا۔ اور اس وقت تک دم نہیں لے گا جب تک کہ ایک ایک چپہ زمین چین سے واپس نہ لے لے۔ چین نے کولمبو تجاویز کو منظور نہ کرکے اپنی جارحانہ پالیسی بھی ظاہر کر دی ہے، اسلئے اس کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا مادر وطن کو ہلاکت و بربادی میں ڈالنا ہے۔ جرا‌سکے ساتھ ہی ساتھ فرقہ پرست عناصر کی سازشوں اور تخریبی کارروائیوں سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، جو چینی جارحیت اور ہنگامی حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ملک کی اکثریت کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور ملک کی قومی یکجہتی اور سالمیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نازک موقع پر، تیز پور کے مسلمانوں

شمارہ نمبر (۱۱ و ۱۲) | اپریل ۱۹۶۳ء | جلد نمبر (۹)

ترتیب

۱۔	اپنی باتیں	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۳
۲۔	مولانا آزاد اور شمس بنگالہ	نثار احمد فاروقی	۷
۳۔	یادِ غالب	امتیاز علیخاں عرشی	۱۴
۴۔	مری معراج ہو خاکِ درِ ہندوستاں ہونا	ذکیہ سلطانہ نیّر	۲۲
۵۔	تلوار ہیں ہم	شوکت جلالی	۲۴
۶	نظیر بحیثیت غزل گو	مس خدیجہ رحمان	۲۵
۷۔	نور جہاں	دھن کیوانی ترجمہ محمد احسان علوی	۳۱
۸	دور کی آواز	منظر سلیم	۴۷
۹	گردشِ تقدیر	عارف حجازی	۴۹
۱۰	غزل	غلام معین الدین	۵۰
۱۱	اسلام کی علمی تاریخ کا تعارف	شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی	۵۱

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر و پروپرائٹر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

زبان کے مسئلہ سے متعلق یو۔پی کے بعض کانگریسی لیڈروں کے انداز سے میں قطعاً خوش نہیں ہوں مگر اس بات کو نہ بھولئے گا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے ہندوؤں نے بھی اس زبان کی بڑی پیش قرار خدمات انجام دی ہیں میں اس بات کو بطور ایک حقیقت کے جانتا ہوں کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی لوگ نہایت بے چین ہیں اور اونچے درجہ کی ہندی کے سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ میں اس پورے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ انداز فکر پریشانی کا موجب ہوگا۔"

آنے والے زمانے نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندی والوں کا یہ انداز فکر، ملک کے لئے کتنی پریشانی کا سبب بنا۔ لیکن اب بھی ہندی سامراجیت کی آنکھیں نہیں کھلی ہیں، وہ اب بھی جبر و اقتدار سے "اردو" کا خاتمہ کر رہی ہے، اور اپنی خرابیاں دور کرنے کے بجائے دوسروں کو موردِ الزام بنا رہی ہے جیسا کہ ابھی شری گیڈگل صاحب نے مولانا آزاد مرحوم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ان کی وجہ سے ہندی کی توسیع و اشاعت نہیں ہو سکی۔

ان حالات میں "اُردو یونیورسٹی" کا قیام عمل میں آجانا حیرت انگیز معجزہ ہوگا۔ خود اُردو والوں کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئی ہیں اور اس کے سربراہ اتنے زیادہ مایوسی کا شکار ہو چکے ہیں کہ وہ اب کوئی مزید قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں۔ خدا کرے یہ خیال غلط ثابت ہو۔

فروغ اُردو نے اپنی نو سالہ زندگی میں گرانقدر نمبر پیش کئے، حالی نمبر دو حصہ، جگر نمبر دو حصہ، طنزی نمبر، افسانہ نمبر، ادبی معرکے نمبر، جنگ آزادی نمبر وغیرہ۔

کی بہادری اور وطن دوستی کے غلط معنی نہ لئے جاتے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے سب سے زیادہ موقر اور حریت نواز ادارے دارالعلوم دیوبند کی تلاشی نہ لی جاتی، اور ان کے دوسرے تعلیمی اداروں کی تذلیل و توہین نہ کی جاتی، اس قسم کے واقعات ہمارے ملک کے لئے سخت توہین آمیز اور جمہوریت کے سندر ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہیں، اگر ان سے غفلت برتی گئی تو ملک کی سالمیت جمہوریت اور آزادی کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جائے گا۔

معاصر معارف نے اُردو یونیورسٹی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم اس سے پورے طور پر متفق ہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی ایسا ادارہ ہے جو اُردو کے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کر سکتا ہے اور جس کو اردو یونیورسٹی بننے کا پورا پورا حق ہے۔ لیکن اس لسانی سامراجیت اور ہندی آمریت کے دور میں یہ خواب شرمندہ تعبیر بھی ہو گا۔ اس میں شبہ ہے، اگر یہی ہوتا تو عثمانیہ یونیورسٹی سے اُردو میں ذریعہ تعلیم کیوں ختم کر دی جاتی۔ اور اُردو کے اس بیش بہا سرمایہ کو کیوں تباہ و برباد ہونے دیا جاتا۔

درحقیقت آزادی کے بعد اُردو کشی، کی جو باقاعدہ منظم اور موثر مہم چلائی گئی اور جس کی طرف ہمدردان اُردو نے مسلسل توجہ دلائی، خطرات سے آگاہ کیا اور ملک کی سالمیت کے لئے "اُردو کشی" کو سب سے زیادہ مہلک بتایا۔ چنانچہ محسن اُردو آنجہانی سر تیج بہادر سپرو نے بستر علالت سے پنڈت جواہر لال نہرو کو ۲؍دسمبر ۴۸ء کو اپنے آخری خط میں جس کرب و اضطراب کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر غلط روش پر روشنی ڈالی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

مولانا آزاد اور شمس بنگالہ

نثار احمد فاروقی

برطانوی ہندوستان کے پہلے دارالحکومت کلکتہ سے ایک اردو رسالہ "شمس بنگالہ" بھی شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس کے نام سے آج بہت ہی کم لوگ واقف ہیں۔ شمس بنگالہ کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۷ء میں نکلا تھا۔ محمد عبدالغفور نستاخ کے کچھ عقیدت مندوں نے اُن کے فرزند ابوالقاسم محمد شمس کی یاد میں اس کا اجرا کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسکے اجرا میں دلچسپی لی اور ان کے چند ابتدائی مضامین بھی شمس بنگالہ میں شائع ہوئے۔ پہلے شمارے میں "عرض حال" کے عنوان سے ایڈیٹر نے لکھا ہے:-

"دارالسلطنت جنرل (کذا) وگوہر آصفی، احسن الانتخاب، نتیجۂ سخن، مہر انتخاب، لسان الصدق، وغیرہ وغیرہ اُن معدوم شدہ اخبار اور رسالوں کے نام ہیں، ان میں بعض تو کچھ دن تک پبلک کو اپنی جھلک دکھاتے رہے..... ۶ ستمبر ۱۹۰۷ء کے آگے کسی کو خیال تک نہ تھا۔ جمعہ کا روز کیا مبارک روز تھا کہ چند حضرات کے دل میں پھر یکایک یہ تحریک خود بخود پیدا ہوگئی کہ کلکتے سے ایک پرچہ جاری کرکے پبلک کی خدمت کی جاوے..... (۲۰ ستمبر تک الشمس کی اشاعت کی۔

یہ سب نمبر ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ادارہ نے طے کیا ہے کہ ناظرین فروغ اردو کی رائے اور مشورہ سے فروغ اُردو نمبر نکالا جائے۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے مشوروں سے جلد از جلد آگاہ فرمائیں۔ کہ فروغ اُردو کا نمبر ڈرامہ نمبر، فانی نمبر، لسانیات نمبر، عصر حاضر کے مشاہیر ادب نمبر یا مشاہیر لکھنؤ نمبر ہو یا اور کوئی۔ رائیں آجانے کے بعد نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا جائیگا۔ اور آئندہ ماہ کے پرچہ میں اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

ماہ مارچ میں کئی قابل قدر ہستیاں ہم سے جدا ہو گئیں، ۲۸ فروری کی شب کو ۱۰ بجے ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند کا انتقال ہو گیا۔ اور ہندوستان اپنے مایۂ ناز فرزند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا غم تازہ ہی تھا کہ ۴ مارچ ۶۳ء کو فخر مشرق حضرت شفیق جونپوری نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور چار ہی پانچ روز بعد ۹ مارچ ۶۳ء کو فدائے قوم شیخ ممتاز حسین جونپوری بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسکے چند ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صدر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان بزرگوں کی قومی و ملکی، سیاسی و ادبی خدمات سے کون ناواقف ہے۔ ایسی مخلص و باکمال ہستیاں اب کہاں؟ ادارہ مرحومین کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(۱) براہ کرم فروغ اُردو نمبر نکالنے کیلئے اپنی رائے ۱۵ اپریل تک روانہ فرمایئے

(۲) یہ پرچہ مارچ۔ اپریل کا مشترکہ پرچہ ہے۔ نوٹ فرمالیں۔

بیری خورنہیں، دیوانِ شیفتہ عنوان اسم بامسمّٰی ہے۔ "دستبوِ بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، حال بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔ ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق دکذا) میں بے باک و گستاخ ہیں، شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے، آپ ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانائے رموز اردو زباں ہو، سرمایۂ نازش کلکِ ہندوستاں ہو۔"

یہ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر میں شامل ہے (ص ۵۹۲) لیکن انھوں نے اس کا زمانہ کتابت (متعین نہیں کیا۔ حالانکہ اندرونی شہادت سے یہ ممکن تھا یہ خط بظاہر ۱۲۷۶ھ کے بعد کا ہے کیونکہ "دستبو بے مثال" تاریخی نام ہے جس سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ مذکور کی ترتیب میں مولانا آزاد بھی کچھ اعانت کرتے ہیں۔ شمارۂ دوم میں مولوی محمد یوسف خاں کا ایک مضمون بعنوان "تعلیم اور اتالیقی پر اورنگ زیب کا لکچر ایک یورپین سیاح کی زبانی" شائع ہوا تھا جس کی ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے ایک طویل نوٹ بھی دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کی یہ تحریر ابھی تک نہ کسی مجموعے میں شامل ہے نہ عام طور سے کسی کو اس کا علم ہے چونکہ ان کے مضامین ایک کلیات کی صورت میں مرتب کرنے کا کام ساہتیہ اکادمی کی نگرانی میں ایک عرصے سے جاری ہے، اسلئے مناسب ہوگا کہ یہ نوٹ یہاں من وعن نقل کر دیا جائے۔

"مغربی سیاح اور مورخین کے قلم کار اور زیادہ از تعصب قلم نے جو عجیب چالاکیوں سے اورنگ زیب کی فرضی تصویر کھینچی ہے وہ

اشتہار کے ذریعے پبلک کو اطلاع دے دی گئی ..... اس قلیل عرصے میں سو سوا سو حضرات نے خوشی سے اس کی خریداری اور سرپرستی منظور کر لی ہے ..... مولانا ابوالکلام محی الدین صاحب آزاد دہلوی کا، اپنے مضامین آیندہ پرچوں کے لئے عطا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے، یہ فرمانا قابل تحسین ہے کہ "مال سے نمونے کے اچھے ہونے کے عوض نمونے سے مال کا اچھا ہونا کہیں بہتر ہے" اور انشاء اللہ "الشمس" اس نیک صلاح کی ہمیشہ پیروی کریگا۔

(جلد ا شمارہ ا ۔ ماہ نومبر ۱۹۰۰ء عیسوی)

اس رسالہ کے سرورق پر نام "شمس بنگالہ" ہی لکھا ہوا ہے لیکن عبارت میں جہاں ذکر آیا ہے وہاں ایڈیٹر نے "الشمس" لکھا ہے۔ پہلے شمارے میں نساخ کے فرزند ابوالقاسم محمد شمس پر ایک مسلسل مضمون کی پہلی قسط بھی شامل ہے۔ (صفحات ۲۹ تا ۳۲)

ان کے حالات کے ذیل میں نساخ اور غالب کے تعلقات کا ذکر بھی ہے اور غالب کا وہ خط نقل ہوا ہے جو عبدالغفور نساخ کے نام ہے "جناب مولوی صاحب قبلہ۔ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم باسد اللہ اور متخلص بغالب ہے مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایش عنایت کا طالب ہے۔ نسخہ بے مثال کو عطیہ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یادآوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچ میرز ہیچ مداں کو قابل خطاب اور لائق عطاے کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں، خوشامد

ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اور بالخصوص انگلستان کے تاریخی اسٹیج پر جب مغل اعظم کا دربار منعقد ہوتا ہے تو کوئی فرمانروا اس قدر مختلف، متعدد اور گاہ گاہ متضاد صورتوں میں نظر نہیں آتا جس قدر ظلم و تعصب کا یہ فرضی دیوتا اورنگ زیب عالمگیر۔ اسکے خال و خط غایت عجیب اور حیرت زا ہیں، کہیں سے خشونت اور سختی ظاہر ہوتی ہے اور کہیں نرمی اور رحم و تحمل کا اثر ہویدا ہے۔ ایک تصویر میں وہ ہلاکت کا دیوتا ہے مگر اس کی پشت پر جو تصویر بنی ہے اس میں حسن کی دیبی بنا کھڑا ہے اگرچہ آخری اوصاف کا اظہار بھی پوشیدہ مصالح پر مبنی ہے مگر اختلاف اور اس درجہ تضاد کا اختلاف بے معنی نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف یوروپ نے مشرق کے اس فرمانروا کی نسبت جو لٹریچر جمع کیا ہو۔ وہ بہت ہی عجیب ہے اور طبیعت انسانی کے بعض چھپے چوروں کو ظاہر کرنے میں بہت کامیاب ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اورنگ زیب کا مسئلہ تعلیم پر ایک لکچر درج کرتے ہیں جو نیکولاؤ مانوکی کے سفرنامے سے ماخوذ ہے۔ یہ لیکچر ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح زمانہ شاہجہاں و عالمگیر نے بھی نقل کیا ہے مگر تمہید اور اکثر جزئیات میں اس سے مختلف ہے یوروپ کی تاریخی غلط بیانیوں نے بالخصوص جب کہ اسلام اور مشرق عنوان بحث ہو۔ ہم کو اس قدر بدگمان کر دیا ہے کہ ہم ان کی موافقانہ آرا کے قبول کرنے میں بھی

دنیا کے اس متمدن ترین خطے کے قلمی ذریعوں کی فہرست میں ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ اس شریفانہ مصوری کی انجام دہی کے لیئے باغیرت مصوروں کو دوسروں کا دست نگر ہونا نہیں پڑا۔ جس قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت تھی اسکا کافی ذخیرہ متعصبانہ اور سرسری نظر، سطح بینی غلط واقعات، پُراز کذب روایات اور مدلسانہ قصص نے پیشتر ہی سے فراہم کر دیا تھا مصور تو بعد کو آئیں گے۔ مگر پہلے پہل ہم کو سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں وہ بزرگ صورتیں موسجات مغلیہ ہند میں مصروف سیاحت نظر آتی ہیں جنھوں نے اس بے انتہا نیک کام کا ابتدائی میٹر جمع کیا۔ برنیر، ڈیورینر، ٹھیونو نیکولاؤ مانوکی وغیرہ سیاح اسی راستی پسند گروہ کے برگزیدہ افراد ہیں۔ ان کے فراہم کردہ ذخیرے کا مسئلہ اکبر و عالمگیر کی ولادت پر ان سے کہیں زیادہ احسان ہے جس قدر الفنسٹن اور ایسٹ (ایلیٹ ؟) جیسے مورخین مابعد کا انگلستان کی تاریخی جماعت تسلیم کرتی ہے۔

سچ اور جھوٹ کی باہمی کشمکش میں اخلاق کی طرف سے ہمیشہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اول الذکر کی فتح یقینی ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فتح بھی چند قدرتی نشانیوں اور آثار کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ آثار مفقود ہو جائیں، اور بعض اوقات ایسا ہوا بھی ہے تو سچائی کی دبی چنگاریوں کو جھوٹ کی راکھ کے ڈھیر میں ڈھونڈھنا ایک بے سود محنت ہو جائے۔ ایک بڑی علامت اختلاف اور تعدد و تنوع بیان ہے۔

اس نوٹ کا انداز یہی غمازی کر رہا ہے کہ مولانا آزاد اس کی ترتیب اور ادارتی ذمہ داریوں میں در پردہ شریک تھے۔ میں نے اس رسالے کے صرف چار شمارے دیکھے ہیں ان میں مندرجہ بالا تحریر کے سوا مولانا آزاد کی اور کوئی تحریر نہیں ہے۔

غیورانہ تامل سے کام لیتے ہیں۔ اس جائز بدگمانی کا نتیجہ ہے کہ اس لکچر کی صحت بھی (جس کی نسبت بہت ہی خفیف مبالغے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کی کسی بڑی یونیورسٹی کے چانسلر کی تقریر معلوم ہوتی ہے) ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ لین پول نے بھی اس لکچر کا ذکر کیا ہے لیکن اس واقعہ کی توثیق کے لئے انگلستان کے ایک مورخ کی نسبت ہم کو زیادہ ضرورت خود اس سرزمین کے مستند واقعہ نگار کی ہے۔ پس بغیر کسی توثیق و تصحیح ہم اس لیکچر کو درج کئے دیتے ہیں مضمون بجائے خود دلچسپ اور مفید ہے اور کم از کم اس قدر اندازہ کرنے کے لئے یقیناً کارآمد ہے کہ اورنگ زیب کی تصاویر کے انگریزی البم میں بعض تصویریں کیا بولتی ہیں؟

سیاح کے مختصر حالات اور اصل لیکچر کا ترجمہ ہمارے دوست مسٹر یوسف خاں صاحب کی قلم رسائی کا نتیجہ ہے جو اگرچہ اُردو کی لٹریری دنیا میں نئے نئے آئے ہیں مگر جس درجہ تیار اور صلاحیت و قابلیت کے ساتھ آئے ہیں۔ اس کا نمونہ انھیں صفحات سے کیا جا سکتا ہے (کذا) ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور ہر طرح مستحق تحسین۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ان کی تحریرات بنگال کے اس ایک ہی اردو رسالے کی اعانت کریں گی۔

(ابوالکلام آزاد دہلوی)

انشا واللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشیں "

شفق کی ایک فارسی غزل کے متعلق تحریر کیا ہے۔

"کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرز بیان "

بے خبر کی غزل کی داد دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

" رامپور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے "ابداع" اس کو کہتے ہیں "جدتِ طرز" اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے ہو"

مہر کی غزل کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سحر ہوگی، خبر ہوگی، اس زمین میں وہ شعر یعنی

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے اور اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔

مہر کی مثنوی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

" مثنوی پہونچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے، انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف جشنوں کا استغنا شہ کیا کہوں، کیا مزہ دے رہا ہے۔

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

یادِ غالبؔ

امتیاز علی خاں عرشی

جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے غالب کے کلام کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ایک ایسے جذبے کی صداقت پر ہے جو شعر کے اثر کی جان ہے۔

غالب نے اپنے نظریۂ شعر پر کوئی مضمون تو نہیں لکھا لیکن ان کی تحریروں اور کلام میں ایسے کئی اشارے ملتے ہیں جن سے فن کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

"شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں"

سخن کی تعریف میں انھوں نے کہا ہے "سخن ..... گراں ارض متاع عالم قدس است"

شعر کے اوصاف کے بارے میں ان کا ایک واضح نظریہ تھا۔

ایک قصیدہ کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

"ہزار آفریں ایک اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ واہ! چشم بد دور! تسلسل معنی سلاست الفاظ"

مہر کے قصیدے کے متعلق فرماتے ہیں۔

معنی تو اس میں موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو "المعنی فی بطن الشاعر" کہتے ہیں۔ نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میں دروغ گو نہیں، خوشامد میرا خو نہیں، دیوان فیض عنوان اسم بامسمی ہے"۔ "دفتر بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔

"الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند"

محاسن شعر کے ساتھ عیوب شعر پر میرزا صاحب کا نقطۂ نگاہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے جیسا کہ کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ابتدأ بیدل کی پیروی میں کوشش کر کے ایسا خیال نظم کرتے تھے جو عام دماغوں کی دسترس سے باہر ہو لیکن آخر میں اس سے خود بھی احتراز کرنے لگے تھے اور شاگردوں کو بھی اس سعی نامشکور سے باز رکھتے تھے جنوں بریلوی کو لکھتے ہیں۔

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن، یعنی لطف زیادہ نہیں۔ اسی طرح میرزا صاحب کو یہ بھی ناپسند تھا کہ مطلع میں تخلص باندھا جائے۔

قدر کو لکھتے ہیں:

مطلع میں نام اپنا لکھنا رسم نہیں ہے۔ میر کا تخلص اور صورت رکھتا ہے۔ 'میر جی' اور 'میر صاحب' کر کے وہ اپنے آپ کو لکھ جاتا ہے۔ اور کو اس

"پیر جوش نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور ہر دو لخت شعر کہنے کا
اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو۔"

سرور کے ایک شعر کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں۔

"رجب علی بیگ سرور نے جو "افسانۂ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا
شعر اب مجکو بہت مزا دیتا ہے۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ　　یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور یاد رکھنا، فسانے کے واسطے کتنا مناسب"
جنوں بریلوی کو تحریر کیا ہے۔

"عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی
عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔"

خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

"میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا
ہوں۔" لیکن میرزا صاحب کے نزدیک جملوں کو مقدر چھوڑنے کے لئے ضروری ہے
کہ سننے والے کا ذہن حذف شدہ الفاظ کی طرف بسہولت منتقل ہو سکے ورنہ وہ
اس کو عیب شمار کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے۔

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

لف و نشر مرتب ہے "می خواہم از خدا دیدن حبیب را۔ نمی خواہم از
خدا ندیدن رقیب را خوار و زار و خستہ و سوگوار۔"

"خبردار، قصائد بقید حروف تہجی نہ جمع کرنا۔"

غالباً کچھ محقق انگریزی الفاظ نیز ان مصطلحات کو جو سرکاری دفاتر کی پیداوار تھے یا انگریزی تہذیب و تمدن کی بدولت مروج ہوئے تھے ٹکسال باہر جانتے تھے، اور اپنے روزمرہ میں ان کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس کے متعلق سنہ ۱۸۵۰ء میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے۔

"چاپی، لغت انگریزی ہے۔ اس زمانے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیے ہیں۔ اوروں نے بھی باندھے ہیں۔ ریل، بگاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ دار خورد یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔"

قصیدے کے آخر میں ایسے الفاظ جو خاتمے پر دلالت کرنے والے ہوں، لانے کو بھی میرزا صاحب عیب جانتے تھے۔ چنانچہ میرزا تفتہ کو لکھا ہے۔

"ایک خیال رکھا کرو کہ شعر کے آخر میں کوئی بات ایسی آ جائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔"

ایطا بھی ان کے نزدیک عیب تھا۔ چنانچہ ایک مکتوب میں تفتہ کو گرفت کر کے لکھا ہے۔

حضرت، اس غزل میں پروانہ، و پیمانہ، و بتخانہ، تین قافیے اصلی ہیں دیوانہ، چونکہ علم استمرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے، اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ، و مستانہ و مردانہ، و ترکانہ، و دلیرانہ، و مشکرانہ، سب ناجائز و ناستحسن، ایطا اور ایطا بھی قبیح.... یاد رہے

بدعت کا متبع نہ چاہیئے۔"

دیوان کی پہلی غزل کے مطلع میں حروف و الفاظ کی قید کے بھی قائل نہ تھے۔ قدرؔ ہی کو لکھا ہے:۔

"آغاز دیوان کے شعر یعنی مطلع میں ہرگز حروف و الفاظ کی قید نہیں ہے۔ ہاں، ردیف الف کی۔ یہ امر قابل پرسش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھ لو اور سمجھ لو۔ یہ جو دیوان مشہور ہیں۔ حافظ و صائب و سلیم و کلیم ان کے آغاز کی غزل کے مطلعے دیکھو اور حروف والفاظ کا مقابلہ کرو، کبھی ایک صورت، ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤ گے۔ چہ جائے اتحاد حروف والفاظ؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

توارد کے متعلق میرزا صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر پس جو شاعر اپنے پیشرو سے مضمون آفرینی یا طرز ادا میں زیادہ لطف و خوبی پیدا کر دے، تو یہ اس کیلئے قابل فخر بات ہے۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:"

ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا یہ بھی محل و فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہونچا۔ وہاں تم پہونچے۔ وہ مصرع یہ ہے:۔

چاک گر دیدم و از جیب بداماں رستم

پہلا مصرع تمہارا اگر، اس کے پہلے مصرعے سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔"

میرزا صاحب کو خواہ مخواہ کی قیود کا التزام بھی ناپسند تھا۔ تفتہ نے شاید اپنے قصائد کو حروف تہجی پر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں:

(۱) خاقانی، اُس کے اقران (۲) ظہوری، اُس کے امثال (۳) صائب، اس کے نظائر۔

ان کے علاوہ ایک چوتھی طرز بھی ہے جو اُردو زبان میں اہل ہند کے ملتی ہے۔ اس کی مثالیں انھوں نے میر تقی، سودا، قائم، مومن خاں سے دی ہیں۔ ان شاعروں کو انھوں نے شیوا بیان شاعر کہا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں تیر و نشتر ہیں۔ غالب نے شیوا بیان شاعر کے لئے ان چار اصاف کو لازم قرار دیا تھا۔

"سخن عشق و عشق سخن، کلام حسن و حسن کلام"۔

مختصراً شعر کی خوبی اور اس کا حسن یہ ہے کہ "سہل ممتنع ہو" ای صنعت کو انھوں نے حسن بیان کی معراج قرار دیا ہے۔ عود ہندی میں لکھا ہے۔

"سہل ممتنع اُس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع، کمال حسن کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع، درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔

شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صنعت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے تھے۔

خود ستائی ہوتی ہے سخن فہم اگر غور کریگا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔

اپنے اشعار کے متعلق میرزا صاحب کا یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے عام ریختہ اشعار سے جداگانہ قسم کا کلام مانتے تھے، اور میر و میرزا کے کلام سے بھی بالاتر سمجھتے تھے۔ اقتباس از دیوان غالب۔

ساری غزل میں، مردانہ، یا مستانہ، یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہوگئی۔"

غزل کے اشعار کی زائد تعداد بھی پسند نہ تھی۔ فرماتے ہیں۔

"ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے۔ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔"

میرزا صاحب بے مزہ لفظی صنعتوں سے بہت کم کھیلتے تھے لفظی صنعتوں سے پرہیز کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ معما اور تاریخ گوئی میں اچھی دستگاہ پیدا نہ کرسکے۔ اردوئے معلیٰ میں لکھتے ہیں:۔

میں فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے، اور راشعار میرے ہیں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لا دیتے۔ موزوں میں کرتا۔ ان شاعرانہ داؤ پیچوں کو میرزا صاحب مرتبۂ شاعری سے فروتر سمجھتے تھے۔

دیکھو اہم کو پرکھنے کے لئے انھوں نے ایک میزان شعر مقرر کی جس کے مطابق فارسی شعرا کے کلام کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے یہ تین طرزیں ٹھہرائیں:۔

یہاں خود راہ ہیں خود رہنما ہیں اور خود منزل
مبارک چین کو غیروں کی گردِ کارواں ہونا
کبھی آوارۂ گوتم رہنما تھی چین کی ہمدم
پرانی بات ہے بھارت کا میرِ کارواں ہونا
نہ جا صیاد ان تنکوں کی کاہیدہ مزاجی پر
کہ ان تنکوں کو آتا ہے چمن میں بجلیاں ہونا
خزاں کے لمس سے یہ اور اٹھلا کر مہکتے ہیں
مرے پھولوں نے سیکھا ہی نہیں نذرِ خزاں ہونا
چمن میں لاکھ اندھیرا لاکھ اندھیرا ہو مگر مجھ میں
دلِ کشتہ کو آتا ہے چراغِ آشیاں ہونا
ہماری جان آزادی ہے ہم ہیں جانِ آزادی
کسی کا حق نہیں اس کے ہمارے درمیاں ہونا
یہ قسمت جابروں کی ہو یہ قزاقوں کا حصہ ہے
ہمیں آتا نہیں دنیا میں بے نام و نشاں ہونا
نہ حسرت خلد کی مجھ کو نہ ارماں عرش بوسی کا
مری معراج ہے خاکِ درِ ہندوستاں ہونا
شفق زاروں کو شرماتا رہے گا حشر تک نا تیو
شہیدوں کے لہو سے چوٹیوں کا ارغواں ہونا

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

مری معراج ہے خاکِ درِ ہندوستاں ہونا

ذکیہ سلطانہ نیّر

نہیں آساں بہاروں کا مری نذرِ خزاں ہونا
انہیں تو ہے خزاں میں بھی بہارِ جاوداں ہونا
وہ ان کا ظلم کی آغوش میں پل کر جواں ہونا
مبارک دشمنِ ایمان و جانِ عاشقاں ہونا
تری محفل کے آداب سیاست نے یہ سمجھایا
جہانِ ظلم میں ہے جرمِ سنگیں بے زباں ہونا
حریفوں کا جنوں کیوں میرے دامن سے الجھتا ہے
مرے دامن کو آتا ہی نہیں ہے دھجیاں ہونا
یہاں کیوں زرد آندھی اپنی قسمت آزماتی ہے
ہے اس دھرتی کے ہر ذرہ کی قسمت آسماں ہونا
فلک والو! ذرا اس سرزمیں کا اوج تو دیکھو
مقدر جس کا ہے پیغمبروں کا رازداں ہونا
سنی پہلی جھلک گوتم کی جس ارضِ مقدس نے
مقدر جس کا ہے گاندھی کا سنگِ آستاں ہونا

نظیر بحیثیت غزل گو

مس خدیجہ رحمان ایم اے لکچرر

سلسلہ کیلئے فروغ اُردو ماہ فروری ۶۳ء ملاحظہ فرمایئے

دوسری قسط

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد
طالب عشق ہوا صورت انساں میں آ

حدیث قدسی میں آیا ہے کہ جب میں نے چاہا کہ میں چاہا جاؤں اور مجھ سے محبت کی جائے تو میں نے انسان کو پیدا کیا یعنی انسان کی آفرینش کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے اور یہ عقیدہ اور جذبہ ہم کو ان کے یہاں بڑی فراوانی سے ملتا ہے۔

اسکے کوچہ میں جسے جا بیٹھنے کو مل گئی　مسند زربافت پر غالب ہے اسکا بوریا
دریا و کوہ و دشت و ہوا، ارض اور سماں　دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سماں
ہے کون سی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور　ہے کون سا وہ دل کہ نہیں جس میں اسکی جا

قمری اسی کی یاد میں کوکو کرے ہے یار
بلبل اسی کی یاد میں کرتی ہے چہچہا

اور آخر وہ اقرار کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ :-

تلوار رہیں ہم

چینی جارحیت سے متاثر ہو کر

شوکت جلالی

۱

بزم عشرت کے لئے نغمۂ سرشار رہیں ہم
رزم کے وقت کی آواز کو للکار رہیں ہم
دوستوں کے لئے ہم پھول ہیں خوشبو سے بھرے
دشمنوں کے لئے خونخوار سی تلوار رہیں ہم

۲

روحِ آزاد کو ناشاد نہ ہونے دیں گے
شانِ سوبھاشس کو برباد نہ ہونے دیں گے
چینیو! اپنی ہم اک اینچ زمیں پر تم کو
مرتے دم تک کبھی آباد نہ ہونے دیں گے

(۳)

ہم ہمالہ کی بلندی کو بناتے ہیں گواہ
آج پستی میں گرا کر ہی تمھیں دم لیں گے
ہند کے ویر سپوتوں کی قسم کھاتے ہیں
دور اس حد سے بھگا کر ہی تمھیں دم لیں گے

جس نے دیکھا وہ رخ انور تو اس کو عمر بھر
پھر نہ آوے مہر خورشید ایا نہ چہرہ ماہ کا
اسکے شرار حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
تو وہ نور سراپا ہے کہ تیری صورت کو
بشر تو کیا ہے میری جان ملک نہ دیکھ سکا

بہر حال نظیر حسرت و یاس کے مارے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر وقت ان کی نظر میں رہتی ہے۔ لیکن یہی چیز تھی جس نے ان کو قنوطیت کا شکار ہونے کے باوجود زندہ دل بنا دیا اور زندگی کو ہنسی خوشی گذار دینے پر راغب کیا۔ بلکہ ہر مصیبت پر مسکرانا اور غم کو ہنس کھیل کر گذار دینا سکھایا۔ انھیں نے زندگی کو فانی سمجھ کے ٹھکرایا نہیں گوشہ نشینی نہیں اختیار کی قلندر اور درویش نہیں بن گئے۔ بلکہ دنیاوی تعلقات کو استوار رکھ کے اس سے پوری طور پر لطف اندوز ہوئے۔ اور اپنے احساسات اور جذبات ہمارے لئے محفوظ کر گئے۔

عشق و عاشقی کا بازار تو ہر زمانہ ہی میں گرم رہا ہے۔ لیکن نظیر کے زمانہ میں شائد اسکے علاوہ کوئی تفریح ہی نہیں تھی، ہر کس و ناکس عشق بلکہ عیاشی میں مبتلا نظر آتا تھا۔

نظیر کے یہاں عشق مجازی میں بھی بڑی کثرت سے اشعار ملتے ہیں اور کہا جاتا ہے جوانی میں نظیر خود بھی بڑے رنگین طبع رہے، اور خوب خوب عیش کیا۔

عدم سے جو ہمیں اے ہم نشیں ہستی میں لایا ہے
وہی غمخوار اپنا ، یار اپنا ، مہرباں اپنا

عشق حقیقی اور تصوف ہمیں ان کے وہاں بڑی کثرت سے ملتا ہے
جس سے ان کی اللہ سے محبت اور لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ نہ صرف اتنا ،
وہ " ہمہ اوست " کے قائل ہیں فرماتے ہیں۔

دریا و کوہ و دشت و ہوا ، ارض اور سما
دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سما
ہے کون سی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور
ہے کون سا وہ دل کہ نہیں جس میں اس کی جا
مفلس کہیں غریب ، تونگر کہیں غنی   عاجز کہیں سل کہیں سلطاں کہیں گدا
ہر روپ سا بنا کے ہر اک جا وہ آن آن
کس کس طرح کے روپ بدلتا ہے واہ واہ

وہ ایک رند اور اوباش شاعر کہے جاتے ہیں دراصل ان کی بڑے
ناز و نعم میں پرورش ہوئی تھی ، اور بچپن اور جوانی کا زمانہ انھیں نے بڑے
رنگ رلیوں میں گذارا لیکن حالات زمانہ اور تقاضائے وقت
اثر کئے بغیر نہ رہے ، اور آخر کار انھیں دنیا کی یہ سب رنگینیاں اور
دلچسپیاں فضول معلوم ہونے لگیں ۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہے وہی
باقی سب فانی اور غیر اہم ، اور مالک حقیقی اور محبوب حقیقی وہی ہے ۔
اس میں کیا طاقت جو مالک ہو کوئی بے نظیر   جان بھی اللہ کی اور مال بھی اللہ

ہی گنگا سے جہاں تک ممکن تھا ہاتھ دھونے کی کوشش کی۔

آج تجھ کو حق نے دی ہے حسن و خوبی کی بہار
چاہنے والے سے کر لے کچھ سلوک و مہر و پیار
کوندنا بجلی کا اور جوبن کا مت کر اعتبار
کاٹھ کی ہانڈی نہیں چڑھتی ہے پیارے بار بار
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

یہ ہے ان کا مشرب کاروبار حسن و عشق میں۔ اور ظاہر ہے ایسا آدمی کسی ایک طور پر قرار نہیں پا سکتا اس کو نت نئے جلوں اور رنگ برنگ حسن کی خواہش ہوگی۔ یہ بھی زندگی سے ایک فرار تھا کہ انھیں نے اس میں جذب ہو کے اپنے کو بھلا دیا اور وقت کو گذار دیا۔ اس طرح کچھ نہ کیا اور سب کچھ کر گئے۔ ایک طرف وہ میلوں ٹھیلوں، جلسے تماشوں میں کھوئے رہتے تھے۔ تو دوسری طرف حسن و عشق کی رنگینیوں میں اور پھر بھی جو وقت ملتا تھا اس کو شعر و شاعری میں گذار دیتے تھے۔

دراصل وہ ایک غریب معلم تھے جن کو دو وقت کی روٹی ملنا دشوار تھی اور روٹی کمانا ضروری۔ میر کی طرح اگر وہ زانو پر سر رکھے بیٹھے رہتے اور زندگی کو توقف الم کر لیتے تو یہ ان کے لئے بہت دشوار اور پھر وہ لکیر پیٹنے کے قائل بھی نہیں۔ لہٰذا انھیں نے جہاں تک ممکن تھا۔ زندگی سے لطف اٹھایا۔ وہ ہر دلکش اور موہنی صورت کے عاشق تھے۔ پھر یہاں وہ محبت نہیں جس میں

جس کا ان کا کلام خود شاہد ہے۔

دیا دل تو پھر عہد و پیان کیسا
لیا جس نے اس کا ہے احسان کیسا

جہاں زلف کافر میں دل پھنس گیا ہے
تو واں دین کیسا اور ایمان کیسا

ادا نے کیا دل کو پہلو میں بے کل
کرے گی ستم دیکھئے آن کیسا

ادھر کاجل آنکھوں میں کیا کیا کھلا ہے
ملا ہے مسی سے ادھر پان کیسا

دل لگا کر قرار کھونا تھا — ہم کو سیماب وار رہنا تھا
دل کو اس سیمبر کے کوچہ میں — عاشقوں کی طرح جو سونا تھا
جب وہ سویا تو چاہ تھا تکیہ — حاصل مدعا بچھونا تھا

جو پیش نظر وہ گل اندام ہوگا — تو دامن نگہ کا شفق فام ہوگا
لب جام سے لب لگے ہونگے تیرے — اور آغوش میں وہ دل آرام ہوگا

عشق مجازی میں ان کی مرکز نظر کوئی ایک ذات واحد نہیں ہے، ہر خوش ادا اور دلربا سے لطف اٹھا لیتے ہیں۔ اور ان سے یہ ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دنیا کو ثبات نہیں زندگی بھی فانی ہے عاشق بھی اور معشوق بھی۔ چار دن کی زندگی میں کوئی ملا تو کیا اور نہ ملا تو کیا۔ لہذا اس چند روزہ زن… کو کس کے غم میں سوگوار ہو کے گذارنا فضول ہی تھا یہی وجہ ہے انھیں نے

نور جہاں ایک پُرشکوہ ملکہ

مصنفہ: دھن کیوانی

ترجمہ: محمد حسان علوی، ایم، اے

جتنے پُراثر، حیرت انگیز واقعات اور قصص و روایات سے نور جہاں
ا زندگی لبریز ہے۔ اتنی مغل تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ شہنشاہ
انگیر کی جیسی رفیقۂ حیات، جو اپنے شوہر کے آخری سولہ سال شاندار
کومت میں ایک عظیم اور انتہائی بلند قوت کی مالک بن گئی تھی۔ اس میں کوئی
ب نہیں، اس لئے کہ اس کی شروع کی زندگی کے چاروں طرف خیالی اور
انوی قصوں کا ایک کہر سا چھا گیا تھا اور بعد کے مورخوں نے اس کی زندگی
حیرت انگیز واقعات اور شاعرانہ جذبات سے مزین کر کے شہرت دے دی
، یہ تمام واقعات مورخوں کے خیالی ذہن رسائی کی تشکیل ہیں۔ اس سے
لے کہ ہم گڑھی ہوئی نقصان رساں باتوں کی چھان بین کریں، ہم اس کی
یم تاریخ کی طرف رجوع ہوں جس سے ہم کو اس کی پُراثر زندگی کے صحیح
عات کا اندازہ کرنے میں کامیابی ہو، اور ایک عظیم تاریخ کے اثرات کا
ح عکس ملے۔

نور جہاں ایران کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس کی

لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح ایک ذات واحد سے محبت ہوتی ہے اور ایسی کہ اس کے حصول کے لیے یا اس کی جدائی میں انسان جان تک دے دیتا ہے۔

یہاں سطحی قسم کی تفریحی اور کاروباری محبت ہے۔ کوئی کسی کے لیئے بے چین نہیں ہوتا۔ روتا نہیں۔ مرتا نہیں، ایک سے سودا نہیں ہوتا تو دوسرے سے بات کی جاتی ہے۔

جب دیکھی اس کی چیں جبیں یوں ہم نے نظیر اس بت سے کہا
خیر آپ اگر ہم سے ناخوش ہیں۔ اب اور کو ہم جا دیکھیں گے

اس بات پر معشوق بگڑتا نہیں۔ گھبراتا نہیں۔ کوئی توہین نہیں محسوس کرتا بلکہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے۔ خدا کی قسم ہمیں تو یہ اب ہوا معلوم دراصل یہ سب بازاری معشوق ہیں اور یہی وجہ ہے کسی بات کو معیوب نہیں سمجھتے۔

ہم اس پہ مرتے ہیں مدت سے اور وہ کہتا ہے
خدا کی قسم ہمیں تو یہ اب ہوا معلوم !!

یہ معشوق ذہنی ہم آہنگی اور روحانی ہم نوائی کے لئے نہیں ہیں بلکہ صرف جنسی بھوک کی تسکین کے لیئے ہیں۔

کل ہنس کے نظیر اس سے کہا ناز سے ہم نے
کچھ بوسہ و دشنام میں بھی تم نے کیا فرق
جو چاہو سو ہم دیویں تمھیں، ہم نے کہا جب
دونوں کی حلاوت میں نہیں ہم کو ذرا فرق

(باقی آئندہ)

نورجہاں ایک پُرشکوہ ملکہ

مصنفہ : دھن کیوانی

ترجمہ : محمد حسان علوی، ایم، اے

جتنے پُراثر، حیرت انگیز واقعات اور قصص و روایات سے نورجہاں کی زندگی لبریز ہے۔ اتنی مغل تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ شہنشاہ جہانگیر کی جیتی رفیقۂ حیات، جو اپنے شوہر کے آخری سولہ سال شاندار دورِ حکومت میں ایک عظیم اور انتہائی بلند قوت کی مالک بن گئی تھی۔ اس میں کوئی تعجب نہیں، اس لئے کہ اس کی شروع کی زندگی کے چاروں طرف خیالی اور افسانوی قصوں کا ایک گہرا سایہ ہو گیا تھا اور بعد کے مورخوں نے اس کی زندگی کو حیرت انگیز واقعات اور شاعرانہ جذبات سے مزین کر کے شہرت دے دی ہے، یہ تمام واقعات مورخوں کے خیالی ذہن رسائی کی تشکیل ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم گڑھی ہوئی نقصان رساں باتوں کی چھان بین کریں، ہم اس کی عظیم تاریخ کی طرف رجوع ہوں جس سے ہم کو اس کی پُراثر زندگی کے صحیح واقعات کا اندازہ کرنے میں کامیابی ہو، اور ایک عظیم تاریخ کے اثرات کا صحیح عکس ملے۔

نورجہاں ایران کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس کی

لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح ایک ذات واحد سے محبت ہوتی ہے اور
کہ اس کے حصول کے لیے یا اس کی جدائی میں انسان جان تک دے دیتا ہے
یہاں سطحی قسم کی تفریحی اور کاروباری محبت ہے۔ کوئی کسی کے لیے بے
نہیں ہوتا۔ روتا نہیں۔ مرتا نہیں۔ ایک سے سودا نہیں ہوتا تو دوسرے سے
بات کی جاتی ہے۔

جب دیکھی اس کی چیں جبیں یوں ہم نے نظیر اس بت سے کہا
خیر آپ کہ ہم سے ناخوش ہیں۔ اب اور کو ہم جا دیکھیں گے

اس بات پر معشوق بگڑتا نہیں۔ گھبراتا نہیں۔ کوئی توہین نہیں محسوس کرتا
بلکہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے۔ خدا کی قسم ہمیں تو یہ اب ہوا معلوم دراصل
یہ سب بازاری معشوق ہیں اور یہی وجہ ہے کسی بات کو معیوب نہیں سمجھتے۔

ہم اس پہ مرتے ہیں مدت سے اور وہ کہتا ہے
خدا کی قسم ہمیں تو یہ اب ہوا معلوم!!

یہ معشوق ذہنی ہم آہنگی اور روحانی ہم نوائی کے لئے نہیں ہیں بلکہ صرف
جنسی بھوک کی تسکین کے لیے ہیں۔

کل ہنس کے نظیر اس سے کہا ناز سے ہم نے
کچھ بوسہ و دشنام میں بھی تم نے کیا فرق
جو چاہو سو ہم دیویں تمھیں، ہم نے کہا جب
دونوں کی حلاوت میں نہیں ہم کو ذرا فرق

(باقی آئندہ)

ریگستان میں پیدا ہونے والا بچہ والدین کے پیار و محبت، حفاظت اور دولت و ثروت کے ماحول میں پرورش پانے لگا۔ اس بچہ کا عقیقہ مہرالنساء کے نام پر کیا گیا۔ اس شاندار نام نے ایک مانے ہوئے دعوے کی طرف پہلے سے اشارات دیدیئے تھے۔ بڑی توجہ اور جانفشانی کے ساتھ اس کی پرورش کی گئی، اور اس زمانہ کا ہر قسم کا ادب و ہنر، تہذیب اور شائستگی سے اس کو مکمل طور پر آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا۔ مہرالنساء خوبصورتی، نکتہ سنجی، لطیفہ طرازی، ذہانت اور لیاقت کا بہترین قابل رشک نمونہ تھی جس نے مغل شہنشاہیت کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مہرالنساء جب چھوٹی سی تھی، تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ شاہی حرم سرا میں جایا کرتی تھی، یہ بات قطعی ممکن ہے کہ اس کی عہد جوانی کی خصوصیات اور کشش نے نوجوان شاہزادہ سلیم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہو، لیکن یہ الزام کہ شہنشاہ اکبر نے اپنے لڑکے کے ساتھ مہرالنساء سے پہلے کی ہوئی نسبت منسوخ کرنے سے انکار کر دیا تھا یہ سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا، اور نہ اس زمانہ کی تاریخ اس واقعہ کا یقین دلاتی ہے۔ مگر ہاں! یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب کہ اس کی عظیم شخصیت کے اثرات چاروں طرف پھیل چکے تھے۔

پہلی شادی: ۱۵۹۴ء میں جب مہرالنساء صرف ۱۷ سال کی تھی، تو ایران کے ایک جانباز نوجوان علی قلی استاجلو، جو بعد میں شیر افگن کے نام سے مشہور ہوا، کے ساتھ شادی کر دی گئی۔ علی قلی نے اکبر کی کی مہم میں اپنی جوانمردی اور ہمت کا جو مظاہرہ کیا تھا، اس سے شہنشاہ بہت زیادہ متاثر ہوا تھا، اس واقعہ نے

پیدائش اور اس کی زندگی کا آخری دور مقابلتہً ایک خاص مطالعہ کا محتاج ہے غربت اور تنگ دستی نے اسکے باپ مرزا غیاث بیگ کو ترک وطن کرنے پر مجبور کر دیا اپنے بے برگ و بے گیاہ وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کیطرف روانہ ہو گیا۔ وہ ہندوستان، جو دولت سے مالامال تھا، اپنا تھوڑا سا اثاثہ بیوی، دو لڑکے اور ایک لڑکی کو لے کر ہزاروں میل کی مشکل ترین مسافت طے کرنے کے لئے چل پڑا، ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ خدا نے اس کی زندگی کو ایک ہیرے سے نواز دیا۔۔۔ یہ اُس لڑکی کی پیدائش تھی جس کی عظیم شخصیت آگے چل کر تمام مشرقی دنیا کو اپنی چمک سے چکاچوند کرنے والی تھی اور اپنی عظمت سے مشرقی دنیا کو بے خود کرنے والی تھی اور جو اپنی زندگی کے آخری حصوں میں مستحکم مغل شہنشاہیت کی بنیاد ہلا ڈالنے والی تھی۔

کارواں کے ایک رحم دل تاجر ملک مسعود نے جب اس خاندان کی المناک حالت کو دیکھا، تو اس کی ہمدردیاں عود کر آئیں اور اس نے ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں لیکر نوزائیدہ بچہ کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھا، اور جتنی اس سے ہو سکتی تھی، اتنی اُس نے مدد کی۔ مرزا غیاث بیگ اور پرنس ملک مسعود کے درمیان بہت جلد دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اور ۱۵۷۷ء میں ہندوستان پہنچ کر جب ملک مسعود نے مرزا غیاث بیگ کے اصلی جوہر دیکھے، تو اس سے بے حد متاثر ہوا اور اس کو بحیثیت سکریٹری لے جا کر شہنشاہ اکبر کے حضور میں پیش کیا۔ وہ فوراً شاہی خدمت پر معمور کر دیا گیا اور پھر وہ اپنی خداداد قابلیت و نتا کی وجہ سے رفتہ رفتہ طاقت اور ممتاز حیثیت کا مالک بن گیا۔

یہ بات بہت زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اس واقعہ کے فوراً جہانگیر، مہرالنسا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ غمزدہ بیوہ نے ۱۶۱۱ء تک شاہی اصرار کی بڑے صبر کے ساتھ مخالفت کی، ملکہ سلطانہ سلیمہ بیگم کی مصاحبہ کی حیثیت سے چار سال تک اپنی غمگین بیوگی زندگی گزارنے کے بعد جہانگیر کی ملکہ بننا اُس نے قبول کر لیا۔

مہرالنسا کی دوسری شادی اسوقت ہوئی جب اس کی عمر ۳۴ برس تھی اور اس شادی کا جشن اتنے شاندار طریقہ پر منایا گیا کہ اس کی مثال مغل دور میں نہیں ملتی ہے، وہ حرم سرا کی تنہائیوں سے نکل کر صرف ایک جیتی ملکہ بن گئی بلکہ وہ شہنشاہ کے ساتھ ساتھ حکومت کے احکامات بھی جاری کرنے لگی، اس کو نور محل یا نور جہاں کے خطاب سے مزین کیا گیا۔ جہانگیر نے نئے سکوں پر اپنے نام کے ساتھ اُس کے نام کو بھی لکھے جانے کا حکم دے دیا، ان سکوں پر یہ عبارت لکھی جانے لگی کہ "شہنشاہ جہانگیر کے حکم اور ملکہ نور جہاں کے نام کی وجہ سے اس سونے نے مزید روشن رتبہ حاصل کر لیا ہے"۔۔۔۔!!!

نورجہاں کے ملکہ ہو جانے کی وجہ سے اس کے خاندان کے افراد شاہی خدمات پر مامور کئے جانے لگے جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے بڑی بڑی ترقیاں کیں، اسکے باپ کو اعتماد الدولہ کے شاندار منصب پر مامور کیا گیا، اور اُس کے بھائی آصف خاں جو شاہی مشیر کار تھا اور جس نے آگے چلکر وراثت کی لڑائیوں میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا تھا، اس کو ایک بہت اونچے منصب سے نوازا گیا۔

ایک ممتاز حیثیت کا اس کو مالک بنا دیا، جب وہ میواڑ کے خلاف جنگ پر روانہ کیا گیا۔ تو یہ اس کے اور سلیم کے درمیان حسد یا کسی اور قسم کے مناقشہ کی وجہ سے نہیں کیا گیا تھا، اور نہ یہ بات ممکن ہی ہوسکتی تھی، اس لئے کہ وہ شاہزادہ کے رسالہ ہی کے ساتھ شامل ہو کر گیا تھا، جنگ میں علی قلی کی شجاعت اور دلیری نے سلیم کا بھی دل جیت لیا، اور اس نے اس کی بڑی ہمت افزائی اور تعریف کی تھی اور جب دوران مہم میں اس نے اپنے ایک ہی ہاتھ سے شیر کو مار ڈالا تھا، تو اس کو شاہزادہ سلیم نے شیر افگن کے شاندار خطاب سے نوازا، اسی زمانہ میں شاہزادہ سلیم اور شہنشاہ اکبر کے درمیان بدنصیبی نے ایک گہرا شگاف ڈال دیا اور اس جھگڑے میں شیر افگن نے شہنشاہ اکبر کا ساتھ دیا۔ اس واقعہ سے ان دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوسکتے تھے لیکن سلیم نے کسی قسم کا بغض و کینہ اپنے ذہن میں نہیں رکھا اور جب وہ ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا، تو اس نے شیر افگن کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ بردوان (بنگال) میں اس کو جاگیر بھی دیدی

۱۶۰۷ء میں جب بنگال میں باغیانہ عناصر سر اٹھا رہے تھے اور قریب تھا کہ بغاوت ہو جائے، تو جہانگیر نے اس بغاوت میں شیر افگن کی شمولیت پر شک کیا، اور اس نے اپنے ے پالک بھائی قطب الدین کو، جو اس زمانہ میں بنگال کا گورنر تھا، حکم بھیجا کہ شیر افگن کو دربار میں حاضر ہونے کا پیام پہونچا دیا جائے اور اگر وہ حکم عدولی کرے، یا مقابلہ کرے، تو اس کو سخت سزا دی جائے" اس لڑائی میں دونوں فریقین ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، شیر افگن کی بیوہ اور اس کی لڑکی کو شاہی احکامات کے تحت دربار روانہ کر دیا گیا۔

پہاڑ توڑ دیتے ہیں۔ وہ اگر کسی یتیم لڑکی کے متعلق سُن لیا کرتی تھی، تو اس کی شادی کے لئے ایک معقول رقم الگ کر دیا کرتی تھی۔ اپنی سولہ سالہ حکومت کے دوران میں اس نے پانچ سو لڑکیوں کی شادی اور جہیز وغیرہ کے پورے اخراجات دیئے۔

اپنی غیر معمولی ہمت اور آداب متعزہ کے ساتھ اس نے اپنے احساسات کے معیار کو چاک کر ڈالا، اور ان احساسات کو اپنی جنسیات سے خارج کر کے عورتوں کے لئے چھوڑ دیا اور بغیر کسی پس و پیش کے پردے کو ختم کر دیا اور عوام کے سامنے شہنشاہ کے ساتھ جھروکے میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور حکومت کے کاموں میں برابر کا حصہ لینا شروع کر دیا، پرانے رسم و رواج، اُصول اور عقائد کی کمزوریوں پر اپنی خوبصورتی، قابلیت اور قوت ارادہ کی ایک مثالی چھاپ اس نے لگا دی تھی۔

ایسی توجہ اور ہوشیاری کے ساتھ وہ حکومت کے فرائض انجام دیتی رہی کہ معمولی معمولی سی باتیں بھی اس کی تیز نظروں سے نہیں بچ سکتی تھیں، جہانگیر بغیر اس کے مشورے کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا، اور کسی معاملہ میں بھی، جس میں ملکہ کو دلچسپی ہو۔ کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس کی مرضی خود قانون کا درجہ رکھتی تھی۔

جوں جوں زمانہ گذرتا رہا، اُتنا ہی جہانگیر آرام طلب بنتا گیا۔ اپنی طاقتور ملکہ اور اپنے مصلاح کاروں کو حکومت کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور فیصل کرنے میں پوری طرح سے اختیارات دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ نور جہاں کا نام خطبہ میں

افیون اور شراب کے نشہ میں بدمست رہنے والے مطلق العنان شہنشاہ پر ملکہ نورجہاں کا بڑا اثر تھا، اپنی خداداد قابلیت اور انسانی معاملہ فہمی کے ساتھ اُس نے شہنشاہ کی فطری متلون مزاجی اور ظالمانہ افتادِ طبع کو بہت حد تک نرم کر دیا تھا اور گو کہ وہ شہنشاہ کے غصہ کو کسی حد تک کم کرنے میں ناکام رہی تھی، لیکن پھر بھی اس نے اُس کو دن کے وقت سنجیدہ اور باہوش رہنے کی ترغیب دلادی تھی، جہانگیر نے خود اپنی سوانح حیات میں نہایت اندازسے نورجہاں اور اسکے خاندان کے اچھے اثرات کیطرف اشارہ کئے ہیں اور اپنی زیادہ تر کامیابی انہی کے معقول مشوروں کی طرف منسوب کی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ "جہانگیر نے بار بار یہ الفاظ دہرائے ہیں کہ اس نے اپنی تمام مملکت ملکہ نورجہاں کو سونپ دی ہے ۔ اور اب وہ شراب اور گوشت کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہتا ہے "

۱۶۱۳ء میں سلطانہ سلیمہ بیگم کی موت کے بعد نورجہاں "بادشاہ بیگم" کے منصب پر پہونچ گئی، مغل دربار نے اس کے ماتحت عظمت اور بلندی کی نئی چوٹی کو چھو لیا ۔

وہ کریم النفسی اور نفاست پسندی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی ۔ بے یار و مددگار لڑکیوں کے لئے وہ ایک پناہ گاہ تھی ۔ جہانگیر کا تذکرہ نویس محمد ہادی کہتا ہے کہ " نورجہاں ظلم و ستم کو کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی، اور جب کوئی مظلوم اُسکے پاس آتا تھا، تو اس کو اتنا دکھ اور تکلیف ہوتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ خود ہی مظلوم ہے اور کسی نے اس پر ظلم کیا

جنگ و جدال اور خونریزی کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔

۱۶۲۰ء میں جب جہانگیر ۵۱ برس کا ہو گیا تو اس کی شاندار تندرستی حد سے زیادہ مے نوشی، عیاشی، کاہلی اور سستی کی وجہ سے رفتہ رفتہ گرنا شروع ہو گئی۔ نورجہاں کو قدرتی طور پر فکر لاحق ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ "کیا جہانگیر کی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ اس کی زندگی کی بلندی و برتری ختم نہ ہو جائے گی۔؟" ظاہری امکانات موجود تھے۔ یا تو وہ بلند مرتبے سے اپنے آپ کو نیچے اتارے اور بے حقیقت بن کر رہ جائے یا ایک اطاعت پذیر آلہ کار کے ذریعہ شاہجہاں کو ہمیشہ کے لئے مغلوب کر دے اور وہ آلہ کار ہمیشہ اس کی مرضی سے کام کرتا رہے۔ اس لئے کہ نورجہاں، جو اسوقت ۴۴ برس کی تھی، اپنی پُرشکوہ فطری جبلت اور سالہا سال تک لامحدود فرمانروائی کی وجہ سے انتہائی طاقتور بن گئی تھی۔

بہادرانہ خصائل اور مقاصد کی مضبوطی کے ساتھ جہانگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہریار پر اس کی نظر انتخاب پڑی۔ شہریار کا انتخاب بالکل ظاہر تھا۔ اس نے تخت کی وراثت کے لئے اس کی پُرزور حمایت کرنا شروع کر دی شہریار "ناشدنی" کے نام سے بدنام تھا۔ اس کا بچپنا ضعیف العقلی، اور اس کی طفلانہ خصائل، یہ تمام باتیں ملکہ نورجہاں کے ارادوں اور منصوبوں کو ڈھالنے میں خوب کام دے سکتی تھیں۔ اس خطرناک کار عظیم میں بدقسمتی سے پختہ کار مشیروں اور اپنے والدین کے اثرات اور اپنے بھائی آصف خاں کی مدد سے بھی نورجہاں کو ہاتھ دھونا پڑا۔ آصف خاں نے خفیہ طور سے شاہجہاں کے وراثت کے دعوے کی پہلے ہی حمایت حاصل کر لی تھی۔ شاہجہاں کی شادی آصف خاں نے اپنی بھتیجی

نہیں پڑھا جاتا تھا، وہ صرف حکومت کرنے والی ایک دیوی تھی، تمام فرمانوں میں شہنشاہ کے دستخط کے ساتھ ساتھ ملکۂ ہندوستان نورجہاں بیگم کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ دنیا میں انسان کو جتنا بے قابو طاقت کا استعمال برباد کی طرف لے جاتا ہے، اتنی کوئی بھی چیز نہیں، اسی طرح غیر متزلزل ملکہ نورجہاں جتنی عمر رسیدہ ہوتی گئی، اتنی ہی حکومت کے معاملات میں زیادہ تجربہ کار بنتی گئی اور طاقت کے استعمال کرنے کی اتنی خوگر ہو گئی کہ ظاہری طور پر اُس کی زندگی نے عیارانہ ساز باز اور جوڑ توڑ کی وجہ سے تنزل پذیر ہونا شروع کر دیا!

دو زمانے: نورجہاں کے دورِ حکومت کا نقشہ خوب واضح اور ناہموار دو عہدوں میں اپنے آپ کو خود تقسیم کر دیتا ہے، سب سے پہلا دور وہ ہے، جو ۱۶۱۱ء سے لے کر ۱۶۲۲ء تک ختم ہوتا ہے، جس میں وہ اور شاہزادہ خرم دونوں نے ملک کا نمایاں انجام دیے تھے، اسی دوران میں شاہزادہ خرم نے اپنی شاندار فتوحات کی وجہ سے "شاہ جہاں" کا خطاب پایا، اور عام دربار میں مسند کے نزدیک اس کو ایک نشست بھی دے دی گئی اور دوسرا دور وہ ہے، جو ۱۶۲۲ء سے لیکر ۱۶۲۶ء تک رہتا ہے، اس دور میں مجلسِ مشاورت جو امورِ سلطنت بڑی عقلمندی اور خوبی کے ساتھ انجام دے رہی تھی، پھوٹ پڑ جانے کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور اسی مجلسِ مشاورت کے دو زبردست ستون یعنی نورجہاں اور شاہ جہاں اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے سے طاقت آزمائی کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ملک کو

کی ہنرمندی اور ذہانت سے کام نکالا کہ جہانگیر بھی یہ بات ماننے کے لئے تیار ہوگیا کہ "شاہ جہاں اُن تمام مہربانیوں اور عزت کا حقدار نہیں ہے جو ہم نے اس کو عنایت کر رکھی ہیں۔" اسی واقعہ کے بعد سے جہانگیر شاہ جہاں کو "بیدولت" کہہ کر پکارنے لگا، اور اسی نام سے اُسکا حوالہ دیا کرتا تھا۔ شاہ جہاں اپنے باپ کو نورجہاں کے بنے ہوئے بناوٹی عشق و محبت اور رنگین تخیلات کے جال سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا عشق و محبت میں دیوانے عمر رسیدہ شہنشاہ نے جب اس کی حصار فیروزکی جاگیر ضبط کرکے شہریار کو دے دی۔ تو شاہ جہاں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور یہ جھگڑا۔ جو کہ اب شروع ہو چکا تھا، بڑا ہی خوفناک اور وحشتناک تھا۔

بحرانی لمحات: جیسے ہی واقعات نے بحرانی شکل اختیار کی، نورجہاں اس کے مقابلہ کے لئے پورے طور سے تیار ہوگئی۔ اپنے بھائی کی سیاسیانہ ذہانت اور اپنی موجودہ خطرناک صورت حال پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے مغل دور کے سب سے بڑے جنرل مہابت خاں کو اس نے طلب کیا۔ آصف خاں کی وجہ سے مہابت خاں کی ترقی پذیر زندگی میں رکاوٹیں پیدا ہوگئی تھیں اور اس کے عروج پر گہن لگ گیا تھا۔ نورجہاں نے شاہ جہاں کی بغاوت کو نیست و نابود کرنے کے لئے مہابت خاں کو حکم دے دیا۔

مہابت خاں کے بے رحمانہ تعاقب، اپنے بہت سے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دینا اور کامیابی اور مدد کی تمام اُمیدوں سے مایوس ہوکر پریشان شاہزادے نے ۱۶۲۵ء میں ہتھیار ڈال دیئے، اپنے دو لڑکوں کو یرغمال کے

لڑکی ممتاز محل کے ساتھ کر دی تھی۔ اس طور سے آصف خاں اپنے داماد کے لئے وراثت کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اور اس کا یہ فعل قدرتی تھا۔

شاہ جہاں نے اسی وقت نور جہاں کے اندر مخالفت اور دشمنی کی نشانیاں دیکھ لی تھیں اور اپنے باپ جہانگیر کی تلون مزاجی کا بھی اس نے اندازہ کر لیا تھا۔

یہ بہت ہی حیرت انگیز بات ہے کہ شاہ جہاں کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے والا اسکا اپنا خاص ساتھی تھا جس نے اس کو وراثت دلانے کے لئے گمنامی سے بلندی کی طرف اٹھایا تھا اور اسکا خاص آلہ کار بھی رہ چکا تھا۔ وفاداریوں کی کھلی ہوئی ان تبدیلیوں کی تصدیق اور سیاسی غیر جانبداری کی منتقلی ۱۶۲۰ء میں اس وقت عمل میں آئی، جب نور جہاں نے اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کے ساتھ شہریار کی منگنی کر دی تھی، یہ لڑکی شیر افگن کی تھی۔ جو نور جہاں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔

اب نور جہاں نے اپنے اگلے منصوبوں کو پوری سبک دستی اور جسارت سے آگے بڑھانا شروع کیا۔ قندھار کے قلعے کو محاصرے سے آزاد کرنے کی مہم درپیش تھی، اس مہم نے شاہ جہاں کو راستہ سے ہٹانے کا ایک عظیم موقعہ فراہم کر دیا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ مغل سلطنت کی قسمت ڈانواڈول ہو رہی تھی۔ شاہ جہاں نے، جیسا کہ امید کی جاتی تھی، بہت ہی نفرت اور حقارت کے ساتھ اس آفت رسیدہ اور بیکار کارِ عظیم کو اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا، نور جہاں نے شاہ جہاں کے انکار کے واقعہ کو

رنجش کے بعد ملکہ نے اس وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکومت سے دست برداری اختیار کرلی اور سیاستاً رضاکارانہ طور سے شہنشاہ کی گرفتاری میں شامل ہوگئی۔ لیکن جہاں فوج ناکام رہی تھی، وہاں عورت کے فریبوں نے فتح پالی، اور ابھی مہابت خاں کی حکومت کے سو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ نورجہاں نے اپنی باہنر حکمت عملی کی وجہ سے اسکا تختہ الٹ دیا۔

مہابت خاں ایک خودمختار کی حیثیت سے گر کر صرف ایک باغی رہ گیا لیکن شاہ جہاں کی توقعات دوبارہ چمک اٹھیں، اکتوبر ۱۶۲۷ء میں شاہ جہاں نے اپنی شکست تسلیم کرکے ایک معاہدہ کرلیا تھا۔ شاہجہاں کے دوبارہ جاگ اٹھنے کی خبر نے نورجہاں کو یقینی طور پر خبردار کردیا تھا۔ لیکن وہ اسکا توڑ کرنے کے لیے قیمتی ہتھیار ابھی کام میں لاسکتی تھی۔

اسی دوران میں دربار کے معاملات نے ایکبارگی رخ بدلا، مہابت خاں کے چنگل سے رہائی پانے کے بعد جہانگیر لاہور کی آنے والی گرمی برداشت کرنے کے قابل نہ تھا، وہ کشمیر کے لئے روانہ ہوگیا، لیکن یہاں اس کے ضیق النفس کے پرانے مرض نے سنجیدہ صورت اختیار کرلی اور جب اس کا ایک خاص سپاہی پہاڑ کی چٹان سے گر کر پاش پاش ہوگیا۔ تو جہانگیر ایسا گھبرایا کہ لاہور واپسی کا فیصلہ کرلیا لیکن جہانگیر کی حالت خراب ہوچکی تھی، ایسا معلوم پڑتا تھا کہ وہ اپنی موت سے پہلے ہی سے خبردار تھا۔ ۲۸ راکتوبر ۱۶۲۷ء میں وہ موت کی آغوش میں پہونچ گیا۔

وراثت کا جھگڑا آخری مرحلہ پر پہونچ گیا۔ مقابلہ صرف دو عہدیداروں

کے طور پر پیش کر دیا اور امیر اور روہتاس کے قلعوں کے دعوے کو بھی ضمانت کے طور پر پیش کر دیا۔

جیسے ہی شاہ جہاں نے نورجہاں کی تحکمانہ شخصیت کے سامنے ہتھیار ڈالے، ویسے ہی اسکے نئے دشمنوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اس نے مہابت کے بڑھتے ہوئے اثرات اور جہانگیر کے دوسرے لڑکے پرویز کے اس کے ساتھ تعلقات کا بہت ہی خوف کے ساتھ اندازہ لگایا، پرویز کا شرابی اور بہت ہی معمولی قابلیت کا شخص تھا، جو شہریار کے لئے ایک نئے خطرے کا سبب بن گیا اور جوں ہی مہابت خاں نے نورجہاں کے منتخب شدہ وارث کو مانے سے اور اس کے وراثت کے خیالات اور اس کے صادر کئے ہوئے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے انکار کیا اور نیز اس نے جب جہانگیر کو زنانی حکومت سے باہر آنے کے لئے کہا اور اس بات پر زور دیا، تو اس کی پرانی دشمنی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

نورجہاں نے اپنی غیر معمولی ہمت اور ذکاوت سے پرویز کو مہابت خاں سے علیحدہ کر دیا، اُسکے بعد اُس نے مہابت خاں پر غبن اور بے جا جبر و تشدد کا الزام لگایا اور اسکو ان باتوں کا جواب دینے کے لئے دربار میں طلب کیا۔ اس کی نیک نامی، ایمانداری اور اس کی دیانت داری کو خاک میں ملا دینے کی جو پُر فریب کوششیں کی جا رہی تھیں اسکا اندازہ لگانے میں مہابت خاں ناکام نہیں رہا، اس نے ایک زبردست ناگہانی حملہ کے ذریعہ جہانگیر کو پکڑ کر ان پُر فریب کوششوں کا انتقام لے لیا، جہانگیر کو بچانے کی ناکام کوشش

خوبصورتی کے ساتھ اسٹیج کو خالی کر دیا جس کو وہ عرصہ دراز سے اپنے قبضہ میں کئے ہوئے تھی۔

اس کی درخشاں زندگی نے قسمت کا ایک اور رخ بدلا۔ اس کے تمام اختیارات سلب کر لئے گئے۔ گو کہ وہ شاہ جہاں کی بدقسمتیوں کا اصل سبب بنی رہی تھی، لیکن اس نے تمام پچھلی باتیں فراموش کر دیں اور اس کی فوری رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ اور سالانہ دو لاکھ روپے پنشن کے طور پر مقرر کر کے لاہور میں مستقل طور سے رہنے کا حکم دے دیا۔ وہ حکومت کے معاملات سے مکمل طور پر دست بردار ہو کر لاہور میں اپنی لڑکی کے ساتھ رہنے لگی اور یہیں اس کی زندگی نے اپنا آخری سفر طے کیا۔ وہ یہاں اپنے محلات اور باغات کے درمیان بڑی سکون کی زندگی گزارنے لگی۔

اس نے پھر کبھی رنگین لباس نہیں پہنا، صرف سفید لباس پہنا کرتی تھی، جو کہ سوگ کی نشانی ہے۔ اس نے اپنی تمام زندگی آرٹ اور ادب و دہش میں صرف کی۔ جہانگیر کا جنازہ اسکے اعلیٰ ترین منصب کے مطابق نہیں اٹھایا گیا تھا، بہت ہی خاموشی کے ساتھ اپنی محبوبہ کے ڈیزائن کئے ہوئے ایک حصہ میں دفن کر دیا گیا تھا۔ بیوہ ملکہ نے ایک شاندار مقبرہ اپنے شوہر کی ابدی آرام گاہ پر بنوایا۔ جہانگیر کی آخری وصیت کا لحاظ کرتے ہوئے مقبرہ کے اوپر کوئی گنبد نہیں بنوایا گیا تھا، اس لئے کہ جہانگیر فطرت کی خوبصورتی کا بڑا دلدادہ تھا، اس نے قدرتی خوبصورتی اور حسن کے ساتھ بالکل ملکر پڑے رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

تک محدود رکھا گیا یعنی شاہ جہاں اور شہریار ــــ پرویز ایک سال پہلے ہی نشہ کا شکار ہو کر مر چکا تھا اور جہانگیر کے سب سے بڑے لڑکے شاہزادہ خسرو کو سنہ ۱۶۲۱ء میں شاہ جہاں کے حکم سے دکن کی مہم کے موقعہ پر بے رحمانہ طور سے قتل کر دیا گیا تھا قبل اسکے کہ شاہ دارا کے دل کش باغ میں جہانگیر کی لاش کو ابدی آرام کے لیئے رکھا جائے، رقیبانہ تلواریں فیصلہ کن جنگ کے لیے نکل آئی تھیں، ملکہ اور اسکے بھائی آصف خاں کے درمیان جو پُرانی مخالفت اور دشمنی چلی آرہی تھی، اس نے ایک جنگ کی صورت اختیار کرلی، نورجہاں نے آخری بار اپنی پوری توت کے ساتھ برسرِ اقتدار آنے کی سرتوڑ کوشش کی، اس نے فوراً اپنے داماد شہریار کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے احکامات دیئے اور خود آصف خاں کو گرفتار کرنے کی جستجو میں لگ گئی لیکن وہ بڑا چالاک واقع ہوا تھا، اب اس نے انتہائی چال بازی سے کام لیا اور بغیر کسی رکاوٹ کے اس نے ملکہ کو اپنی نگرانی میں رکھا اور دوسری طرف اس نے بہت ہی جلد ایک پیغام اور ایک مُہر ایک تیز رو پیغامبر کے ہاتھ شاہ جہاں کے پاس روانہ کی اور بدنصیب خسرو کے لڑکے داور بخش کی عارضی طور سے تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور خود ساختہ بادشاہ شہریار کے خلاف جنگ کو طول دینا شروع کر دیا، آخر کار شہریار کو بہت سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا، وہ گرفتار ہوا اور اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔

شہریار کی شکست کے بعد نورجہاں نے ناچار ہو کر خاموشی اور بڑی

دور کی آواز

منظر سلیم

دور سے تیری محبت نے پکارا تھا مجھے
دور سے آئی تھی کھوئی ہوئی تیری آواز
پھر بھی اک بار مرے اجڑے ہوئے سینے میں
بج اٹھے تھے کئی ارمانوں کے ٹوٹے ہوئے ساز

دور ہی سے تیرا دیدار میسر تھا مجھے
پھر بھی اکثر مری مشتاق نگاہیں بڑھ کر
تیرے عارض تری پیشانی سے لے لیتی تھیں
ظلمت شب کے چراغوں کے لئے نور سحر

بے کراں وقت کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
میں ہر اک گام پہ محسوس کیا کرتا تھا
تیری بکھری ہوئی زلفوں کے گھنے سائے کو
خارزاروں میں بھی پھولوں پہ چلا کرتا تھا

ملکہ نورجہاں اپنے شوہر کے مرنے کے اٹھارہ سال بعد تک زندہ رہی۔ اور ۸ دسمبر ۱۶۴۵ء میں ۲، برس کی عمر میں انتقال کیا جس طرح اس کی زندگی کا آخری دور گوشہ نشینی اور گمنامی میں گزرا تھا، اسی طرح اس کی موت بھی واقع ہوئی۔ دنیا نے اس کو فراموش کر دیا تھا، اور اسکے تمام بہادرانہ واقعات دنیا نے بھلا دیئے تھے۔

جہانگیر سے بالکل ملی ہوئی ایک ویرانہ و بنجر جگہ پر اسکو دفن کر دیا گیا، یہ جگہ شاید اس گمنامی کیطرف اشارہ کرتی ہے، جس میں وہ مکمل طور سے ڈوب چکی تھی۔

(ہندوستان ٹائمز)

گردشِ تقدیر

عارف حجازی

درد پہلو میں اٹھا یاد کی تنویر کے ساتھ
اب نہ بہلے گا مرا دل تری تصویر کے ساتھ

تجھ کو شکوہ ہے مرے پاسِ وفاداری کا
مجھ کو الفت ہے اسی جرم کی تعزیر کے ساتھ

آرزو ہوتی ہے اب درپئے آزار مری
سعیٔ ناکام بھی ہے گردشِ تقدیر کے ساتھ

اب تو دامن بھی سلامت نہیں اے دستِ جنوں
دیکھیے گزرے گی کیا نالۂ شب گیر کے ساتھ

شورشِ غم میں جو پنہاں ہے مری روحِ غزل
آہی جائے گا مرا نام کہیں میرؔ کے ساتھ

فرحتِ دید سے ملتا ہے سکوں جب دل کو
آنکھ بھر آئی ہے کیوں لذتِ تقریر کے ساتھ

وادیٔ دل میں بہاراں سے نمو ہے عارفؔ
جوئے خوں پھوٹی ہے اک حسرتِ تعمیر کے ساتھ

چپکے چپکے وہ مری بھیگی ہوئی پلکوں پر
نیند کی طرح ترے ریشمی آنچل کا نزول
چوڑیوں کی وہ کھنک، دست حنائی کا وہ لمس
وہ جنوں خیز مہک، تیرے تبسم کے وہ پھول

شب کے سناٹے میں اکثر مرے دل کی دھڑکن
ترے قدموں کی اس آہٹ کو سنا کرتی تھی
جس نے آباد کیا مرے ویرانے کو
جو مرے رنج والم بانٹ لیا کرتی تھی

دور تھا مجھ سے بہت تیرا شبستاں لیکن
کسی زنداں کا تصور بھی مرے پاس نہ تھا
غم تو اس وقت بھی تھے قلب پریشاں کو مگر
آج کی طرح سے تنہائی کا احساس نہ تھا

اِسلام کی علمی تاریخ کا تعارف

شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی۔
رجسٹرار امتحانات عربی فارسی یو پی

اعتذار

یورپ کی تابحد ثریا پہونچی ہوئی ثقافتی عظمت ایک زندہ حقیقت ہے کہ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

مگر مغرب میں علم و حکمت کی یہ گرم بازاری نتیجہ ہے اُن علوم و فنون کی ترقی کا جو نشاۃ ثانیہ کے بعد سے عام یورپی سماج کا خصوصی امتیاز بن گیا۔

یورپ کی اس "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) کو سقوط قسطنطنیہ کا نتیجہ بتایا جاتا ہے لیکن اگر ترک ہزار بار قسطنطنیہ کو فتح کرتے اور لاکھ بار بازنطینی سلطنت کے یونانی بھاگ کر اٹلی میں پناہ لیتے تو بھی یونانی عبقریت کے عظیم شاہکار آنکھوں کو زیارت کے لئے نہ ملتے۔ ان میں سے علم و حکمت کے بہت سے جواہر پارے تو اسلام سے پہلے ہی نابود ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ مسلمانوں کے اعتنا سے عربی میں منتقل ہوئے اور اس طرح صفحہ دہر پر باقی رہ گئے، ورنہ اصل یونانی میں تو آج ان میں سے بہت سے جواہر پاروں کا پتہ بھی نہیں ہے۔

بے شک دنیائے تہذیب یونانی مفکروں کی کاوش کے احسان سے سبکدوش

غزل

غلام معین الدین روحؔ

اگر ہو سکے تو ادھر دیکھ لینا مری چشمِ تر کے گہر دیکھ لینا

محبت بھرا دل بھٹکنے نہ پائے خدا کے لئے اک نظر دیکھ لینا

ابھی تو تمنائیں جاگی ہوئی ہیں زمانہ ہو جب بے خبر دیکھ لینا

ان آنکھوں میں دم آ کے اٹکا ہوا ہے مریض اپنا اے چارہ گر دیکھ لینا

فضائے گلستاں میں اڑتے پھریں گے کسی روز یہ بال و پر دیکھ لینا

نہ زنداں رہے گا نہ زنجیر باقی جو بگڑے یہ شوریدہ سر دیکھ لینا

گیا روحؔ وحشت میں جانے کدھر کو
ذرا دور تک اک نظر دیکھ لینا

اتی اخلاق کو قومی مصالح کے تسلط سے آزاد نہیں رکھ پاتے۔ ان کے حسن اخلاق
رافت نفس، عالی ظرفی اور وسعت مطالعہ میں کوئی شک نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک
ہیں کہ تحقیق اور ریسرچ کے جو مواقع انہیں میسر ہیں اور جس طرح ان کاموں کیلئے
لومت اور پبلک کیطرف سے اُن کی ہمت افزائی کی جاتی ہے، ہمارے یہاں ان
تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر افسوس ادعائے تفوق مغرب اور راز دراز اسلام
رب کی مصلحت کوشانہ تحقیق اور ریسرچ کا نا قابل انفکاک جز بنگئے ہیں اور
ں میں نہ براؤن اور نکلسن کی کوئی تفریق ہے، نہ آرنلڈ اور مارگولیتھ میں اور نہ گولڈزیہر
ور ہٹی میں۔

پھر اس بات سے قطع نظر کہ مستشرقین کے یہاں حقیقت نگاری پر مصلحت پسندی
غالب رہی ہے، یہ تحقیقات پچھلی صدی میں کیگئی تھیں جبکہ بہت سے مصادر و مآخذ
جو آج شائع ہوکر منظر عام پر آگئے ہیں، مخطوطہ کی شکل میں بھی ان کی دسترس سے باہر
تھے۔ اسلئے اسلام کی ثقافتی تاریخ میں بہت سے کھانچے رہ گئے جنھیں

ا۔ یا تو انھوں نے قیاس آرائیوں سے پر کیا تھا۔ اور قیاس آرائیوں کا
واقعات سے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ب۔ یا پھر اپنے دیرینہ جذبۂ عناد و اسلام دشمنی کے زیر اثر ان میں خاطر خواہ
رنگ آمیزی کی ہے۔ اور اسکا خطرہ ظاہر ہے۔ اندریں حالات ضروری
ہے کہ عباقرہ اسلام کے کارناموں کی داستان خود اُن کے اخلاف مرتب کریں کہ

"صاحب البیت ادری مافی البیت"

پھر یہ ان کا فریضہ ملی بھی ہو جس کی ادائیگی سے پہلو تہی کیلئے کوئی عذر در خور

نہیں ہو سکتی ۔ مگر ایک قوم اور بھی ہے جس نے ماضی قدیم کے "مٹی کے دیوں" اور عہد حاضر کے "بجلی کے قمقموں" کے درمیان "شمع کافوری" کا کام کیا ہے۔ یہ مسلمان قوم ہے۔ اس حیثیت سے دنیائے علم و حکمت مفکرین اسلام کی جگر کاویوں کی جتنی بھی شکر گزار ہو کم ہے۔

لیکن علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کے اندر مسلمانوں کی ہزار سالہ کاوش بائے پیہم نے جو حصہ لیا، نیز فضلائے اسلام نے ریاضی اور سائنس کو اپنے پیشرووں سے لیکر جس طرح باقی رکھا اور اس میں جو چار چاند لگائے، بدقسمتی سے ہمارے یہاں اب ان باتوں کے ذکر و اذکار کا بھی کوئی رواج نہیں رہا۔ اہل علم کی ہمارے یہاں دو جماعتیں ہیں: قدیم مدارس کے فارغ التحصیل اور جدید تعلیم یافتہ حضرات۔

قدیم مدارس میں پہلے فلسفہ و حکمت کے ساتھ ریاضی ذہنیت کی بھی تین چار کتابیں داخل درس تھیں۔ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم چند مصطلحات ہی معلوم ہو جاتے تھے لیکن اب اسکا بھی دستور نہیں ہے۔

جدید تعلیم کی درسگاہوں میں عربی و اسلامیات کے نصاب میں تو اس قسم کی کتاب داخل نہیں ہے۔ البتہ عربی ادب کی عمومی تاریخ اور مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ کے ضمن میں ان علوم کا بھی کچھ حوالہ آجاتا ہے۔ مگر معلمین ہوں یا متعلمین، اس باب میں سب کا اعتماد مستشرقین ہی کی تصانیف پر رہتا ہے اس سے زیادہ تحقیق و کاوش کو عقیدہ بے ادبی و گستاخی پر محمول کرتی ہے۔ ان ارباب تحقیق کی تعداد ہمارے یہاں بہت ہی کم ہے جنھوں نے بنفس نفیس ان موضوعات پر ریسرچ کی ہو۔

لیکن مستشرقین کے یہاں دقت یہ ہے کہ وہ "اسلامیات" پر لکھتے وقت ا…

فضلاء یونانی علم و ادب کے شاہکار اپنے ہمراہ لیکر اٹلی پہونچے اور ان کی آمد سے یورپ میں وہ زمانہ شروع ہوا جو "نشاۃ ثانیہ" کہلاتا ہے۔ یہ دور ہنوز چل رہا ہے۔

عہد قدیم کی ثقافتی تاریخ میں یونانی ثقافت کا خاص مقام ہے۔ اگرچہ وہ فکری سرمایہ جسے "یونانی علم و حکمت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کلیتاً یونانیوں کے ابتکار فکر کا نتیجہ نہ تھا، کیونکہ انھوں نے فلسفہ مشرق سے ہندسہ و ہیئت مصر و بابل سے، حساب فنیقیا سے اور طب عراق و ایران وغیرہ سے حاصل کیا تھا لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ جس علم و حکمت کو انھوں نے دوسرے ممالک سے لیا، اسے سائنٹیفک انداز پر منظم و مدون کیا۔

یونان میں فلسفہ و حکمت کا آغاز تھالیس الملطی (۶۲۴ - ۵۴۸ ق م) سے ہوتا ہے اور اسکا خاتمہ ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء) پر مکمل ہو جاتا ہے۔ اس طویل عرصہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا - قبل سقراطی دور: اس دور میں جس کا بادی تھالیس الملطی ہے فلسفہ مذہبی خرافات اور دیو مالا سے خود کو آزاد کرکے سائنٹیفک بنیادوں پر اپنی تفکیری سرگرمیوں کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس عہد کی فکری کاوشوں کا محور قوام کائنات کے مبدء اولین کی تلاش و جستجو ہے۔ تھالیس کے علاوہ جو فلسفہ کے ساتھ یونانی ہندسہ و ہیئت کا بھی بانی ہے، اس دور کے مشاہیر حکماء انکسیمنڈر، انکسیمینس، زنوفینز، برمینڈس، زینون ایلی ہو چکے ہیں۔ ہیراقلیطس، ابندقلیس (Empedocles)، انکساغوراس، دیمقراطیس (Democritus) نظریہ عناصر اربعہ کا بانی ہے اور دیمقراطیس نظریہ سالمات (Atomic Theory) کا مفتتح ہے لیکن سب سے زیادہ مشہور

سماعت نہیں ہو سکتا ے

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا
اس مقدس فریضہ کی تکمیل کے لئے ایسے ہاتھوں کی ضرورت تھی جو اس
خطیر کے اہل ہوں۔ مگر اس فرض کفایہ کو "اہل" کی آمد کے انتظار میں غیر معین
مدت کے لیے ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ مغرب کا مسموم پروپیگنڈہ
اپنی سیہ کاریوں میں مصروف عمل ہے۔ اسلئے ایک "نقش ناتمام" پیش کرنے کی جرأت
کی جا رہی ہے۔ شاید کوئی۔

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

وَمَا توفیقی اِلّا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب

مقدمہ

اسلام کا ثقافتی پس منظر

(۱) قدیم سائنس

دیگر تواریخ کی طرح دنیا کی ثقافتی تاریخ بھی تین ادوار میں منقسم ہے:۔
عہد قدیم: جس کا آغاز زمانہ ماقبل تاریخ کے دھندلکے میں ہوتا ہے
اختتام ۵۲۹ء میں جبکہ قیصر جسٹینان کے حکم سے ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بند کر دیا گیا
عہد وسطیٰ: جس کا آغاز اُس دن سے ہوتا ہے جبکہ ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بند کیا گیا
اور خاتمہ ۱۴۵۳ء میں جبکہ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا۔
عہد حاضر: جس کا آغاز سقوط قسطنطنیہ سے ہوتا ہے جبکہ بازنطینی سلطنت

اور اخلاقیات میں "لذت" (________) کی قائل تھی۔

ج۔ رواقیت جو اخلاقی ترفع پر بہت زیادہ زور دیتی تھی۔

۴۔ یونانی فلسفہ کا آخری دور۔ اس دور میں آکر فلسفہ چھ سو سال کی مسلسل کاوش استدلال سے تھک چکا تھا اور سکون قلبی کے لئے مذہب کے دامن میں پناہ ڈھونڈھتا تھا۔ اس جذبے نے تین شکلیں اختیار کیں۔

ا۔ کچھ لوگوں نے مشرق بالخصوص یہودی مذہب میں اس سکون قلبی کو ڈھونڈھنا چاہا۔ اُدھر یہودی بھی اپنی مذہبی تعلیمات کو منطقی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ اسکا نتیجہ "یہودی یونانی" فلسفہ کی شکل میں نمودار ہوا جس کا خاص نمائندہ فائلو تھا۔

ب۔ کچھ لوگ (جانب ویہود) کے مذہب سے تسکین حاصل کرنے کے بجائے فیثاغورث کی ... تعلیمات پر ایک عالمی مذہب کی تشکیل کرنا چاہتے تھے یہ "نوفیثاغورثیت" کا مطمح نظر تھا۔

ج۔ بعض تفلسف پسند طبائع افلاطون کی تعلیمات کو مذہبی فلسفہ کی شکل میں مرتب کرنا چاہتی تھیں۔ یہ لوگ "نوفلاطونی" کہلاتے ہیں۔ اس نوفلاطونی جماعت کے اساطین ثلثہ فلاطینوس، فرفوریوس اور ایامبلیکس تھے۔

یونانی فلسفہ کا یہ آخری دور ایتھنز (یونان) کے بجائے اسکندریہ (مصر) کو وابستہ ہے سکندر اعظم کی وفات پر اس کی عظیم الشان سلطنت اُسکے جرنیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ مصر بطلیموسی خاندان کے حصہ میں آیا۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ یونان سے علمی سرپرستی کی روایات بھی لائے تھے اور کچھ ہی دن میں اسکندریہ علم و حکمت کا مرکز بن گیا۔ دوسرے بطلیموسی

فیثاغورث ہے جو ہندسہ کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اقلیدس مقالہ دوئم کی شکل، ہم اسی کے نام پر "شکل فیثاغورثی" کہلاتی ہے۔ ہیئت کے اندر وہ غرضیکہ اس عہد کے مروجہ "زمین مرکزی" نظریے کے برخلاف "شمس مرکزی نظریے" کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ یونانی فلسفہ کا عہدِ زریں:۔ یہ دور سقراط، افلاطون اور ارسطو کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے۔ افلاطون نے جو بالواسطہ فیثاغورث کا شاگرد ہے فلسفہ کے علاوہ ریاضی و ہیئت کی ترقی میں بھی حصہ لیا۔ اس کی اکادمیا کے دروازے پر لکھا تھا کہ جو شخص ریاضی میں تبحر نہ رکھتا ہو وہ ہماری درسگاہ میں نہ آئے۔

ارسطو یونانی علم و حکمت کا مثل اعلیٰ ہے۔ مسلمانوں میں یونانی حکمت اور ارسطو مترادف لفظ سمجھے جاتے تھے چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:۔

"اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہو گیا اور وہ اُن کے حکماء کا خاتم اور اُن کے علماء کا سردار رہے"

ارسطو ہی نے منطق کے فن کو سب سے پہلے مدون کیا اور اسی لئے وہ مسلمانوں میں "صاحب المنطق" اور "معلم اول" کہلاتا ہے۔ اسی نے اُس فلسفہ کی بنیاد ڈالی جو نام نہاد "اسلامی فلسفہ" کی اصل ہے۔ اسکے علاوہ اُس نے ریاضی بالخصوص ہیئت کو سائنٹیفک بنیادوں پر استوار کیا۔ بعد میں اسکا حلقہ فکر "مشائیہ" کے نام سے کام کرتا رہا۔

۳۔ بعد ارسطاطالیسی دور:۔ اس دور میں بیک وقت تین تحریکیں کارفرما تھیں۔

ﺍ۔ ارتیابیت جو ارسطاطالیسی فلسفہ کی ادعائیت کا فطری ردعمل تھا۔ اس کا مشہور نمائندہ پرہو تھا۔

ب۔ ابیقوریت جو علمیات میں "حواس پرستی" طبیعیات میں "ذرّیت"

بالخصوص نوفلاطونی فلاسفہ تو عیسائیوں کی ضد میں توہم پرستی کی آخری حد تک پہونچ گئے تھے۔ فلاطینوس کے پیروؤں کے بارے میں لکھتا ہے :۔

"اسکے بہت سے متبعین نے ان توہمات میں بیحد مبالغہ کیا۔ عوامی شرک وتکثیر کی حمایت کی، عیسائی مذہب پر حملے کئے اور جادو اور خرافات میں انہماک کی حد تک پہونچ گئے"۔

اسی طرح ایک دوسرا مورخ ولیم نیسل ان نوفلاطونی فلاسفہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"یہ فلسفی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کے آخری حامی تھے لیکن تکثیر نے ان کے ہاں فلسفیانہ توجیہ اختیار کرلی تھی"۔

مگر کوئی تہذیب توہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔ یونانی عبقریت اب بوڑھی ہوچکی تھی اور اسلئے اسکے تحفظ کے سلسلے میں نوفلاطونی حکما کی ساری کوششیں بیکار تھیں۔ پروفیسر تھلی لکھتا ہے :۔

لیکن، اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں باقی رہ گئی تھی۔ قدیم شرک وتکثیر میں نئی جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کو بچانے کے سلسلے میں اس کی تمام کوششیں بے سود تھیں۔ یہ فلسفہ اپنی افادیت کے دن ختم کرچکا تھا۔ اب مستقبل اس نئے مذہب کا منتظر تھا جس کے خلاف اس فلسفہ نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا تھا"۔ (تاریخ فلسفہ از تھلی ص ۱۱)

مگر فاضل پروفیسر بربنائے خوش فہمی اس "نئے مذہب" کو عیسائی مذہب سمجھتا ہے، حالانکہ یہ "نیا مذہب" (مسیحیت) نوفلاطونی عہد کی مسخ شدہ یونانی ثقافت سے بھی زیادہ توہم پرستی اور "عقلیت بیزاری" کا گہوارہ تھا۔

تاجدار بطلیموس منطقی نے اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کی بنیاد ڈالی جس میں بقول ابولا
۵۴۱۲۰
ابن العبری چون ہزار ایک سو بیس کتابیں تھیں۔

ارسطو کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی اسکندریہ چلی آئی تھی اور انھوں نے معلم اول (ارسطو) کی تعلیمات کو کم و بیش ایک ہزار سال تک جاری رکھا۔ اسکندریہ میں بطالمہ مصر کے زیر سرپرستی ریاضی و ہیئت کے عظیم عباقرہ پیدا ہوئے تھے جیسے اقلیدس، اپلونیوس، ارشمیدس، بطلیموس وغیرہ۔ اقلیدس نے علم ہندسہ کی مشہور کتاب "اصول ہندسہ" کو مرتب کیا جو یونان کی ہندسی عبقریت کا شاہکار ہے۔ اپلونیوس نے "مخروطات" (conics) کو مدون کیا۔ ارشمیدس اور ایران ریاضیات کی مختلف شاخوں میں کمال رکھتے تھے۔ بطلیموس کی کتاب "المجسطی" قدیم علم ہیئت کا منتہائے کمال ہے اور آج بھی علم ہیئت کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔ اسکندریہ ہی میں یونانی طب کی ترقی ہوئی۔ اطبائے یونان کا گل سرسبد جالینوس تھا۔

سن مسیحی کی ابتدا کے قریب (۳۰ ق۔م) رومیوں نے مصر کو فتح کر کے رومن سلطنت میں داخل کر لیا۔ یونان کو وہ پہلے ہی ۱۴۶ ق۔م میں فتح کر چکے تھے۔ رومن صرف ایک کشور کشا قوم تھے ان کی اپنی علمی روایات کوئی بھی نہ تھیں۔ لہٰذا اُن کے زمانہ میں یونانی ثقافت کی ترقی رک گئی۔ اتنے میں مسیحیت مبعوث ہوئی اور اپنے "بادشاہ پرستی" سے انکار کیوجہ سے بہت جلد رومن حکومت کی نظروں میں معتوب قرار پائی۔ اس لئے کچھ ہی عرصہ بعد عیسائیوں پر جور و تعدی کا آغاز ہوا۔ اس "مسیحیت آزادی" میں رومن حکام کے ساتھ یونانی فلسفہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ متاخر یونانی فلاسفہ نے مسیحیت کے رد میں اپنے قومی مذہب کی جو بت پرستی پر مشتمل تھا۔ بڑے زور و شور سے حمایت کی

کا حسب ذیل قول نقل کیا ہے :۔

"۵۲۹ء سے لیکر جس سال قیصر جسٹینان نے یونانی مدارس کو بند کیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جبکہ ڈیکارٹ کی مقالات پر منا ہج، شائع ہوئی نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا یا یوں کہئے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تفکر و ثقاہت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا"

اسی مصنف (ڈی وولف) نے قرون وسطیٰ کے علماء یورپ کی مساعی فکریہ کے متعلق دوسرے مورخین کے حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں :۔

"ٹین کا خیال ہے کہ تیرھویں صدی کے مجہول فضلاء (یورپ) کا زمانہ محض ناکارہ لوگوں کا زمانہ ہے جو نفرت و حقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق نہیں ہے۔ اس تاریک عصر کی تہہ میں جو تین صدیاں گزری ہیں انہوں نے انسان کے عقلی ورثہ میں ایک نئے تصور کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرون وسطیٰ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ اس زمانہ کو انسانیت کے لئے موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں"

اس دور کے یورپ کی جمود و ناکارگی کی وجہ یہ تھی کہ وہاں علم و ثقافت کی بنیاد پادری طبقے کے ہاتھوں میں تھی جن کے متعلق بیکن کا کہنا ہے :۔

"ان کے علوم نے مرور زمانہ سے خراب ہو کر بیکار اور غیر صالح مباحث کی شکل اختیار کر لی تھی جس طرح کوئی عضو سڑ کر متعفن ہو جاتا ہے"

لیکن اس عہد تاریک میں ربع مسکون کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جو علم و حکمت کی روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ یہ سرزمین ——————— کا ملک تھا جو مشرق تابان بنا ہوا تھا۔ نبی اُمی کی اُمت کا ملک تھا جس کا ہر فرد بجائے خود افلاطون و ارسطاطالیس

مسیحیت دو سو سال تک رومن سلطنت کا مملکتی مذہب رہی۔ مگر اس دو سو سال میں غیر مذاہب کے متبعین پر ظلم و ستم ڈھانے کے علاوہ علم و حکمت کی ترقی میں اسکے "روشن کارناموں" کا ماحصل صرف اتنا ہے کہ اس نے

(۱) عقیل و فہیم ہائپیشیہ (Hypatia) کو جو اسکندریہ کی جماعت فلسفہ کی صدر تھی، انتہائی بیدردی اور سفاکی سے قتل کر دیا۔

(۲) سرائیوں کی لائبریری کو جو اسکندریہ کی مشہور لائبریری کے تباہ ہو جانے پر قائم ہوئی تھی، جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

(۳) منطق جیسے مفید علم کو ممنوع التعلیم قرار دیا۔

اور آخر کار:۔

"۵۲۹ء میں شرک بسند نو فلاطونیت کی آخری جائے پناہ یعنی ایتھنز کا مدرسہ جہاں برقلس نے تعلیم دی تھی، شاہنشاہ جسٹینیاں کے حکم سے بند کر دیا گیا۔"

(۲) قرون وسطیٰ

قرون وسطیٰ کو جس کا آغاز مدرسہ ایتھنز کی قفل بندی (۵۲۹ء) سے ہوتا ہے اور خاتمہ ۱۴۵۲ء پر جبکہ ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا "قرون مظلمہ" بھی کہا جاتا ہے اور اگر اسلامی دنیا سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس عہد کے واسطے "Dark Ages" کا نام بالکل موزوں ہے چنانچہ ڈی ولف نے اس دور کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں ایک فرانسیسی مورخ

جہاں غربا کے بچوں کو نوشت و خواند نیز قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی جو لوگ زیادہ خوشحال ہوتے تھے اُن کے لئے علمی مجامع (اکیڈیمیاں) ہوتے تھے۔ قرطبہ، غرناطہ اور دوسرے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں۔ ان یونیورسٹیوں میں دیگر علوم کے علاوہ مجالس پروفیسر ریاضی اور ہیئت کی تعلیم دیتے تھے ... عام علوم کے مدارس کے علاوہ خصوصی پیشوں مثلاً طب کے مدارس علیحدہ تھے۔"

راوی تو "Legacy of Islam" میں دوسری جگہ سائنس بالخصوص ریاضیات کے اندر مسلمانوں کی مساعی جمیلہ کو سراہتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"عربوں (مسلمانوں) نے سائنس میں واقعی بہت بڑے کمالات حاصل کئے ہیں انھوں نے صفر کا استعمال (علم الحساب یا ترقیم اعداد) کا طریقہ سکھایا اگرچہ انھوں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے۔ انھوں نے علم الجبر والمقابلہ کو ایک تحقیق علم بنا دیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ انھوں نے تحلیلی ہندسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ علم المثلثات المستویہ علم المثلثات الکرویہ کے بانی تھے جو صحیح بات تو یہ ہے کہ اُن کے زمانہ سے پہلے وجود ہی میں نہیں آئے تھے۔ علم الہیئت میں انھوں نے قیمتی مشاہدات کئے ہیں۔"

یہ ہے اسلامی ثقافت کا ایک مجمل تعارف جس نے "قرون مظلمہ" کے اندر اسلامی دنیا کو بقعہ نور بنا دیا تھا۔ اسلامی ثقافت کے روشن کارناموں کی یہ شہادتیں جو اوپر گزریں مسلمانوں کی نہیں ہیں جو اُن پر جنبہ داری کا شبہ کیا جا سکے۔ یہ اُن غیر مسلموں کی پیش کردہ ہیں جو بڑی مشکل سے حق بات کہتے ہیں۔ "والفضل ما شهدت به الأعداء"

اُقلیدس و بطلیموس اور بقراط و جالینوس کی غلطیوں کی اصلاح کر رہا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں علم کی شمع صرف اسلام ہی کے کاشانہ میں روشن تھی۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چنانچہ مشہور مستشرق کارادی فو اس زمانہ کی اسلامی دنیا اور یورپ کے فضل و کمال کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"جس زمانہ میں مسیحی یورپ جہالت و بربریت کے خلاف جان توڑ لڑائی لڑ رہا تھا، مسلمانوں نے عظیم الشان تفکیری سرگرمیوں نیز سائنس کے مطالعہ کو زندہ رکھا۔ ان کی سرگرمیوں کی معراجِ کمال کا زمانہ دسویں صدی مسیحی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ پندرھویں صدی کے اختتام تک جاری رہا۔ بارھویں صدی کے بعد یورپ کا ہر شخص جسے علم و حکمت کا ذوق ہوتا یا نورِ علم سے اپنے ذہن کو منور کرنا چاہتا وہ مشرق (بغداد) یا اسپین ہی کا رخ کرتا"

اسی طرح اندلسی مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں ڈریپر اپنی "Intellectual Development of Europe" میں لکھتا ہے :-

"جونہیں عربوں کو اسپین میں قدم جمانے کا موقعہ ملا انھوں نے علم و حکمت کے ایک دور کا افتتاح کیا۔ قرطبہ کے امیروں نے علم و ادب کی سرپرستی میں خود کو ممتاز بنا لیا تھا۔ انھوں نے تہذیب، ثقافت اور ہنر پروری کی جو مثال قائم کی تھی، وہ اُن کے ہمعصر یورپ کے حکمرانوں کی حالت کی بالکل ضد تھی"

یہی مصنف دوسری جگہ ان ہنر پرور مسلمان امراء کے بارے میں لکھتا ہے :-

"انھوں نے اپنے تمام بڑے بڑے شہروں میں کتب خانے قائم کئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے کم از کم ستر کتب خانے تو اسپین ہی میں موجود تھے۔ ہر مسجد سے ملحق ایک مکتب ہوتا تھا۔

نصر بن عراق، ابن الہیثم، ابومنصور عبدالقاہر البغدادی، ابوالجود، ابوبکر الکرخی،
ستاذ المنتس ابوالحسن علی بن احمد النسوی، عمر خیام، ابوالفتح محمود اصفہانی، محقق طوسی،
سن الدین سمرقندی وغیرہم۔

د ہیئت۔

محمد بن ابراہیم الفزاری، یعقوب بن طارق، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، یحییٰ بن
ابی منصور، خالد بن عبدالملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری، سند بن علی، الکندی
حبش الحاسب، ابومعشر بلخی، ابوحنیفہ الدینوری، جابر بن سنان البتانی، ابوالعباس فضل
بن حاتم النیریزی، سلیمان بن عصمہ، عبدالعزیز الہاشمی، ابوجعفر الخازن، ابن الاعلم،
بشار بن لبان، احمد بن عبدالجلیل السنجری، عبدالرحمن الصوفی، ابوسہل ویجن بن رستم الکوہی،
ابوالوفا البوزجانی، ابوحامد الصاغانی، ابومحمود الخجندی، ابوالحسن علی بن احمد النسوی،
ابونصر بن عراق، ابوریحان البیرونی، محمد بن احمد المعموری، عمر خیام، ابوالفتح عبدالرحمن
الخازنی، ابن یونس، صاحب الزیج الحاکمی، ابن الصفار، ابن السمح، الزرقیال،
بہاء الدین ابومحمد الخرقی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی، محی الدین مغربی، محمود بن
عمر الجغمینی، الغ بیگ، غیاث الدین کاشی، قاضی زادہ رومی، مولانا علاء الدین قوشجی،
میرم چلپی، امام الدین ریاضی، مرزا خیر اللہ المہندس وغیرہم۔

ہ جغرافیہ

ابن خرداذبہ، ابن واضح الیعقوبی، ابوالحسن المسعودی، ابن رستہ، الجیہانی، ابن الفقیہ، ابن حوقل،
ابن حائک الہمدانی، المقدسی، ابوالفداء، البکری، یاقوت۔

و۔ تاریخ۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، الواقدی، ابن سعد، الکلبی، مدائنی، البلاذری، ابوالحسن المسعودی

(۳) مشاہیر عباقرۂ اسلام

اسلامی عبقریت نے مختلف علوم و فنون میں بیشمار فضلا پیدا کئے۔ ذیل میں مشہور مسلمان حکما اور سائنس دانوں کے نام دیئے جاتے ہیں۔

ا۔ منطق و فلسفہ

ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی، ابو العباس احمد بن الطیب السرخسی، احمد بن سہل البلخی، ابو نصر الفارابی، ابو سلیمان السجستانی، ابو الحسن العامری، شیخ بوعلی سینا، ابو العباس اللوکری، عمر خیام، ابو البرکات بغدادی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، شہاب الدین سہروردی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی، سراج ارموی، افضل الدین خونجی، اثیر الدین ابہری، نجم الدین کاتبی، محقق دوانی، مرزا جان شیرازی، امیر باقر داماد، ملا محمود جونپوری، ملا صدر الدین شیرازی وغیرہم

ب۔ طب

علی بن ابن الطبری، ابو بکر زکریا الرازی، علی بن العباس المجوسی، ابو منصور قمری، شیخ بوعلی سینا، ابن رضوان، ابو القاسم الزہراوی، ابن زہر، علی بن عیسیٰ الکحال، ابن النفیس وغیرہم

ج۔ ریاضی و ہندسہ

محمد بن موسیٰ الخوارزمی، عباس بن سعید الجوہری، سند بن علی، بنو موسیٰ، علی بن عیسیٰ الماہانی، ابو العباس فضل بن حاتم التبریزی، ابراہیم بن سنان، ابو کامل شجاع بن اسلم، ابو جعفر الخازن، ابو الوفاء البوزجانی، ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی،

"مخترع" تسلیم کئے جاتے ہیں بلکہ ہندی ادب میں بھی ان کی مسلّمہ حیثیت ہے۔

حضرت کی چند پہیلیاں ملاحظہ ہوں۔

ایک تھال موتی سے بھرا	سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے	موتی اس سے ایک نہ گرے

(آسمان)

ایک نار نے اچرج کیا	سانپ مار پنجرے میں دیا
جوں جوں سانپ تال کو کھائے	سوکھے تال سانپ مر جائے

(دیا بتی)

ادھر تو اس کا بوجھے گا	منہ دیکھو تو سوجھے گا

(آئینہ)

حضرت امیر خسرو متعدد شاہانِ دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن معز الدین کیقباد، وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بلبن ان کی بڑی قدر کرتا تھا اور ان کے کلام کا دلدادہ تھا۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید خاص تھے جن سے ان کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۱۳۲۵ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا نام اردو اور ہندی کے آسمان ادب پر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

حضرت امیر خسرو نے اولین اشعار جو کہے وہ فارسی اور ہندی کا نہایت
امتزاج پیش کرتے تھے۔ انھوں نے کہا۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

حضرت امیر خسرو نے اس طرح اپنی فارسی اور ہندی کی ملی جلی شاعری
اپنے دوہروں، دو سخنوں، پہیلیوں اور مکرنیوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو
دوسرے کے قریب تر لانے کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیا۔

زبان کے مسئلے کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ تر
تعلقات کی راہ میں رکاوٹ تھا انھوں نے ایک نئے نقطۂ نگاہ سے فارسی
ہندی کے امتزاج سے سلجھایا۔ ان کی ایک اور اہم خدمت یہ ہے کہ انھوں
بسنت پنچمی کے روز حضرت نظام الدین اولیا کو پھول پیش کر کے ہندو
مسلمانوں کے مابین زیادہ دوستانہ اور قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش
اس روز حضرت نظام الدین اپنے پیارے بھتیجے کی قبل از موت کے سبب
سوگوار بیٹھے ہوئے تھے۔

ذیل کے فارسی شعر میں بسنت کی خوشیوں اور مسرتوں کا ذکر کیا گیا
جو کہ ہر سال موسم بہار میں ملک بھر میں منایا جاتا ہے۔

اشک ریز آمد است ابر بہار
ساقیا گل بریز و بادہ بیار

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت امیر خسرو نہ صرف اردو کے پہلے:

سب سے پہلا اردو شاعر

حضرت امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں:۔

زبان اردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اس کے خط وخال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اردو کا اس دھندلکے میں جو صاف طور پر نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جن کی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند" ہے انھوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کئے اور سب سے پہلے اردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلے غزل اردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اس کی ترکیب اس طرح ہے کہ اسکا ایک مصرع فارسی ایک اردو کا اور پھر فارسی کا ہے۔ اسکے علاوہ اکثر پہیلیاں مکریاں، انملیاں، دو سخنے، دوہے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں جن میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو مشکل اردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں۔

امیر خسرو موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اردو میں استعمال کیں اور ان کی کتاب "خالق باری" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ ہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں جو اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ وہ اسکے موجد و مخترع کہے جا سکتے ہیں۔

مختصر حالات زندگی

حضرت امیر خسرو

حضرت خواجہ امیر خسرو ۶۵۳ھ میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ (اترپردیش) میں حضرت امیر سیف الدین محمود کے ہاں پیدا ہوئے جو شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں بلخ سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔

حضرت امیر خسرو کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے والد اور بھائیوں کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار ان کی صغر سنی میں ہی ایک بار انہیں حضرت نظام الدین اولیاء کے پاس لے گئے کیوں کہ ان کا خیال امیر خسرو کو حضرت نظام الدین اولیاء کی مریدی میں دینے کا تھا۔ وہ بیٹے کو باہر بٹھا کر حضرت کا نیاز حاصل کرنے اندر چلے گئے۔ امیر خسرو کے ذہن میں وہاں بیٹھے بیٹھے ایک فی البدیہہ شعر پیدا ہوا۔

تو آن شاہے کہ بر ایوانِ قصرت کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد بیاید اندروں یا باز گردد

(تو وہ بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کی چھت پر کبوتر بیٹھ جائے تو باز بن جائے۔ ایک غریب انسان جو عاجزوں کا عاجز ہے۔ تیرے در پر آیا ہے۔ وہ اندر آئے یا واپس چلا جائے)

چونکہ عباقرہ اسلام کی علمی سرگرمیاں تاریخ اسلام ہی کا جزو لاینفک ہیں، اسلئے انھیں تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کے تحت مرتب ہونا چاہیئے۔ آئندہ صفحات میں اسی اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

ابن قتیبہ، ابن جریر الطبری، البیرونی، ابن مسکویہ، ابن الاثیر، ابو الفداء، ابن خلدون، عطا ملک جوینی، حمد اللہ مستوفی، رشید الدین فضل اللہ، منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، عبد القادر بدایونی، ابو الفضل، فرشتہ، ابن الندیم، قاضی صاعد اندلسی، شہرستانی، ابن القفطی، ابن ابی اُصیبعہ وغیرہم۔

یہ وہ فضلاء ہیں جو صرف دینوی علوم میں اپنے وقت کے باکمال تھے، علماء دین تو حد و حصر سے باہر ہیں۔ حافظ ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں صرف اپنے زمانہ تک کے مشاہیر اشاعرہ کو گننے سے عاجز آکر لکھا تھا کہ جس طرح میرے لئے آسمان کے ستاروں کا گننا ناممکن ہے، اساطین اشاعرہ کا شمار کرنا بھی محال ہے۔

لیکن ان فضلاء میں عرب بھی تھے اور عجم بھی، ایرانی بھی تھے اور تورانی بھی، سندھی بھی تھے اور ہندی بھی، اس لئے ان کی عبقریت کو ان کی نسلی و وطنی خصوصیات کا نتیجہ نہیں بتایا جا سکتا۔ ان مختلف النسل لوگوں میں اگر کوئی چیز مشترک تھی تو وہ اللہ رب العزۃ کی وحدانیت اور اُسکے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار تھا جس کا مجموعی نام "اسلام" ہے، اسلئے ان فضلاء روزگار کی مساعی علمیہ درحقیقت "اسلامی عبقریت" ہی کے کارنامے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کی عہد بعہد کی ترقی کی داستان مرتب ہونا چاہیئے۔

مستشرقین کی بنیادی (خدا جانے دانستہ یا نادانستہ) غلطی یہ ہے کہ انھوں نے فضلاء اسلام کی علمی سرگرمیوں کو "عربوں کی ثقافتی سرگرمیاں" سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ ایک بے سرو پا اصطلاح ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی جن لوگوں نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے، ایسا ہی فرض کر لیا ہے۔ مگر اب اس غلطی کی اب اصلاح ہونا چاہیئے۔

شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرادآبادی مرحوم
کی یاد میں ماہنامہ فروغِ اُردو لکھنؤ نے

جگر نمبر (مصوّر)

حصۂ اول اور حصۂ دوم
شائع کیا ہے

ریسرچ اسکالر کیلئے یہ انمول تحفہ ہے

جسکو پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے ترتیب دیا۔ اس میں ہند و پاک کے ان مشاہیر ادب نے حصہ لیا ہے جو حضرات جگر مرحوم سے کسی نہ کسی حیثیت سے ربط رکھتے تھے، اسلئے یہ نمبر جگر مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے فن پر سیر حاصل تبصرہ کے علاوہ ان کی حیات و شخصیت ان کے شمائل و خصائل کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ نمبر ادبی دنیا کا انمول تحفہ تسلیم کیا گیا ہے

قیمت:- حصہ اول چھ روپیہ حصہ دوم ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جو حضرات ماہنامہ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہوں وہ یہ انمول تحفہ معہ سالانہ چندے سو روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ رقم روانہ کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر ماہنامہ فروغِ اُردو لکھنؤ

مشرقی و مغربی پاکستان والوں کیلئے

ضروری اطلاع

ہم محسوس کرتے تھے کہ شائقین علم و ادب پریشان رہتے ہیں کہ ان کو ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب یکجا صورت میں کہیں بھی (پاکستان) میں مہیا نہیں ہوتیں اس تکلف کے پیش نظر اب ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ جو حضرات ادارہ کی شائع کردہ مطبوعات چاہتے ہوں وہ براہ راست

انوار بک ڈپو۔ امپریس مارکیٹ۔ صدر کراچی

کے نام خط لکھ کر ادارہ کی مطبوعات طلب فرما دیں جملہ کتب بیک وقت مہیا ہو جائیں گی۔ اور پھر کوئی دردسری نہ ہوگی۔

"منیجر"

مطبوعاتِ ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ

بہ ترتیب حروفِ تہجی مع قیمت

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳/۵۰
۲۔ ایرانی ادب	آفتاب اختر علی تلہری	۰/۷۵
۳۔ ادب اور جمہور	" " "	۲/۲۵
۴۔ اندازِ نظر	صفیہ اختر	۲/۰
۵۔ افاداتِ مہدی	مہدی افادی	۴/۵۰
۶۔ امدادِ باہمی	سید مصطفےٰ حسین	۴/۰
۷۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی		۲/۵۰
۸۔ انارکلی	امتیاز علی تاج	۲/۲۵
۹۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ اضافہ جدیدہ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد		۵/۰
۱۰۔ اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳/۰
۱۱۔ امراؤ جان ادا	مرزا رسوا لکھنوی	۳/۰
۱۲۔ انتخابِ قصائدِ اردو	منیب الدین زیدی	۱/۵۰
۱۳۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۴/۰
۱۴۔ ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۴/۰
۱۵۔ ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	۵/۰
۱۶۔ انتخابِ اقبال		۰/۲۵
۱۷۔ اتراک اور ان کا عروج و زوال	حبیب حسین ایم اے	۲/۰

۳ - اپنی پہچان		اعجاز احمد فاروقی	۱/۲۵
۳ - اللہ کے پیارے		امیر حسن نورانی	۰/۵۰
۳ - ادبی معرکہ نمبر		مرتبہ فروغ اردو	۰/۷۵
۴۰ - ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی		عبدالماجد دریابادی	۱/۲۵
۴۱ - اسپین کی شہزادی		صادق سردھنوی	۴/۵۰
۴۲ - اسپین کا مرد مجاہد		مائل ملیح آبادی	۲/۷۵
۴۳ - ایک جان تین قالب		خان محبوب طرزی	۴/۰
۴۴ - اُلفت		" " "	۵/۵۰
۴۵ - آغاز سحر		" " "	۴/۰
۴۶ - امین آباد		" " "	۴/۰
۴۷ - اپنی موج میں		آوارہ	۲/۰
۴۸ - اجداد کی باتیں		مصطفیٰ احسن رضوی	۲/۰
۴۹ - اچھی کہانیاں	حصہ اول	شمس الدین نوری	۰/۲۵
۵۰ - " "	حصہ دوم	" " "	۰/۳۱
۵۱ - " "	حصہ سوم	" " "	۰/۴۴

(ب)

۵۲ - بابائے اردو عبدالحق		عبداللطیف اعظمی	۴/۵۰
۵۳ - بستان حرم	(نعتیہ کلام)	زائر حرم حمید لکھنوی	۱/۵۰
۵۴ - بڑھا سنگھ	(شہید محبت)	خان محبوب طرزی	۴/۰
۵۵ - ر ارمو اردو زبان کا ارتقاء		ڈاکٹر اختر اورینوی	۷/۵۰

۱۸ - اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریا بادی	/۰
۱۹ - ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	/
۲۰ - ادب کیا ہے؟	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	/۲۵
۲۱ - ادب کا مقصد	" "	/۰
۲۲ - ایک نادر روزنامچہ	" "	/۵۰
۲۳ - ابوالخیر	مجنوں گورکھپوری	/۳۷
۲۴ - ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	/۵۰
۲۵ - اُردو کی کہانی	سید احتشام حسین	/۰
۲۶ - ادب پارے نثر و نظم	" " "	/۷۵
۲۷ - انتخاب نثر جدید	" " "	/۵۰
۲۸ - ابوالکلام آزاد (نظم)	جگناتھ آزاد	/۲۵
۲۹ - ۱۸۵۷ء کا بہترین ادب	امداد صابری	/۵۰
۳۰ - ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء	" "	/۹۴
۳۱ - ارمغان نثر و نظم	عبدالاحد خان خلیل	/۷۵
۳۲ - آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	/۷۵
۳۳ - افسانہ نمبر	مرتبہ فروغ اُردو	/۵۰
۳۴ - اچھی نظمیں	اخگر مشتاق	/۳۱
۳۵ - اُردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن	غلام احمد فرقت	۱۰/ دس ر
۳۶ - اُردو شاعری	امیر احمد علوی	/۵۰

۷۴ - تاجدار مدینہ	اقبال صدیقی	۰/۱۲
۷۵ - تنقیدی اصول اور نظریئے	حامد اللہ افسر	۳/۰
۷۶ - تلوک چند محروم	جگناتھ آزاد	۴/۰
۷۷ - تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی	۳/۰
۷۸ - تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	۳/۵۰
۷۹ - تنقیدی نظریات	" " "	۵/۰
۸۰ - تنقید اور عملی تنقید	" " "	۴/۰
۸۱ - تاریخ ادب اردو	عبدالشکور	(زیر طبع)
۸۲ - تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	۳/۵۰
۸۳ - تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	۲/۵۰

(ٹ)

۸۴ - ٹیگور	نادم سیتاپوری	۲/۰
۸۵ ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۲/۰

(ث)

۸۶ - ثنائے حبیب (نعتیہ کلام)	بہزاد لکھنوی	۱/۷۵

(ج)

۸۷ - جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۰
۸۸ - جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ۱	(رسالہ فروغ اردو)	۱/۵۰
۸۹ - جنگ آزادی نمبر ۲	" " "	۱/۵۰
۹۰ - جوئے رواں (مجموعۂ کلام)	حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۹۱ - جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۳/۵۰

۵۶ ۔ بزم بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵۰/
۵۷ ۔ بوئے گل	شبلی نعمانی	۴۰/
۵۸ ۔ باقیات فانی	فانی بدایونی	۴/۰
۵۹ ۔ بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی کاکوروی	۲/۰
۶۰ ۔ بہشتی ثمر (اول و دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور		۷۵/
۶۱ ۔ بانی اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ		۰/۷۵
۶۲ ۔ بے ساختہ اور بے ضابطہ	وجاہت علی سندیلوی	۷۵/

پ

۶۳ ۔ پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۱/۲۵
۶۴ ۔ پیاری باتیں	محسن کاکوروی	۰/۱۹
۶۵ ۔ پتھر کی دیوار	علی سردار جعفری	۲/۵۰
۶۶ ۔ پھولوں کا انبار (ناول)	منظر سلیم	۴/۵۰
۶۷ ۔ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ)	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۵۰
۶۸ ۔ پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۲۵
۶۹ ۔ پیغام (ناول)	ڈاکٹر طاہر دیاپوری	۳/۰
۷۰ ۔ پردیسی کے خطوط (حصہ اول)	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
۷۱ ۔ پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	۴/۵۰

(ت)

۷۲ ۔ تاریخی جائزے	ڈاکٹر محمد یسین	۳/۰
۷۳ ۔ تعارف تاریخ اردو (جدید اڈیشن)	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۰

(د)

۱۰۸	دو تذکرے	پروفیسر کلیم الدین احمد	۷/۵۰
۱۰۹	دیوان صفی	صفی لکھنوی	۳/۰
۱۱۰	دہلی کا یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۰
۱۱۱	دستہ گل	شبلی نعمانی	۰/۴۰
۱۱۲	دوشیزۂ قاف	خالد محبوب طرزی	۵/۰
۱۱۳	دلربا	" " "	۳/۰
	(ڈ)		
۱۱۴	ڈاکٹر نذیر احمد	انوار الحسن	۰/۳۷
۱۱۵	ڈھائی ہفتہ پاکستان میں	عبد الماجد دریابادی	۲/۰

(ذ)

۱۱۶	ذوق ادب و شعور	پروفیسر احتشام حسین	۳/۵۰
۱۱۷	ذوق جنوں	آل احمد سرور	۳/۵۰

(ر)

۱۱۸	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۴/۰
۱۱۹	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۰/۳۷
۱۲۰	رخسار سحر	انصر کریم قدوائی	۱/۵۰
۱۲۱	روح آزاد	یونس خالدی	۲/۰
۱۲۲	رفتار (ناول)	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰

(ز)

۱۲۳	زکوۃ الحلی (یعنی زیورات زکوۃ)	مولانا تھانوی رح	۰/۵۰

۹۲ - جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ)	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹۳ - جلوے	معین الدین دُردائی	۱/۷۵
۹۴ - جمیلہ بوائری (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۹۵ - جگر نمبر اول و دوم	(مرتبہ فروغ اُردو)	۷/۵۰

(چ)

۹۶ - چوتھی بہن	مسیح الحسن رضوی	۲/۷۵

(ح)

۹۷ - حالی بحیثیت شاعر	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۸/۵۰
۹۸ - حسرت موہانی	عبدالشکور	۳/۰
۹۹ - حسرت تعمیر	ڈاکٹر اختر اورینوی	۴/۵۰
۱۰۰ حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۴/۵۰

(خ)

۱۰۱ خمسہ پارہ ۷ (مع ترجمہ)	....	۰/۵۰
۱۰۲ - خلاصہ روح تنقید	....	۱/۰
۱۰۳ - خلاصہ حیات جاوید	....	۱/۰
۱۰۴ - خلاصہ ہماری شاعری	....	۰/۷۵
۱۰۵ - خلاصۃ المیزان	....	۰/۷۵
۱۰۶ - خلاصہ قواعد اُردو	عبدالحق	۱/۰
۱۰۷ - خیطی (مزاحیہ)	محمد علی ردولوی مع مقدمہ شوکت تھانوی	۱/۵۰

ش

۱۴۰۔ شعر نو (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۰
۱۴۱۔ شبلی نعمانی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴۲۔ شرح دیوان غالب جدید اڈیشن	نظم طباطبائی	۴/۵۰
۱۴۴۔ شکست کی آواز	قاضی عبد الستار	۳/۰
۱۴۶۔ شاہان مالوہ ۔ یعنی گجرات کی تاریخ۔	امیر احمد علوی	۱/۵۰
۱۴۷۔ شعر العجم حصہ دوم، سوم، چہارم، پنجم ۔	شبلی نعمانی	۱۶/۰
۱۴۸۔ شمع و شاعر	علامہ اقبال	۰/۲۵

(ص)

۱۴۹۔ صید و بند (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۲/۵۰

(ط)

۱۵۰۔ طوفان کی کلیاں	کرشن چندر	۲/۵۰
۱۵۱۔ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی)	(ترجمہ فروغ اُردو)	۲/۰
۱۵۲۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے)	غلام الثقلین	۰/۳۷
۱۵۳۔ طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۲۵
۱۵۴۔ طرۂ امیر (امیر مینائی کا منتخب کلام)	امیر احمد علوی	۱/۵۰

(ع)

۱۵۵۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۴/۵۰

۱۲۴- زیرلب	(صفیہ کے خطوط)	۶/۵۰
۱۲۵- زینب ساحرہ	(وحشی محمود آبادی)	۳/۰
۱۲۶ زینٹوں کا بادشاہ (حکیم بانا)	علی عباس حسینی	۳/۰

(س)

۱۲۷- سوانح اور زمانے	نجم الدین نقوی	۳/۰
۱۲۸- سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۳/۰
۱۲۹- سلک گہر	سید احتشام حسین	۳/۰
۱۳۰- ساحل وسمندر	" "	۴/۵۰
۱۳۱- سرسید احمد یا شایا قاف کی پری	علی عباس حسینی	۱/۵۰
۱۳۲- سرمایہ زبان اردو	جلال لکھنوی	۳/۵۰
۱۳۳- سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	۵/۰
۱۳۴- سفر حجاز	عبدالماجد دریابادی	۵/۰
۱۳۵- سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۰
۱۳۶- سیاحت زمین (ناول)	محمود اعظم فہمی	۱/۰
۱۳۷- سید سالار مسعود غازی	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۱۳۸- ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۳۹ سنہرا حلقہ	"	۰/۵۰
۱۴۰- سرسید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۴ سوشل اسٹیڈی	احمد محسن علوی	۱/۷۵

١[illegible]۔ قومی ادب نثر و نظم		حامد اللہ افسر	٣/٢٥
١٧۔ قیامت صغریٰ		خان محبوب طرزی	٣/٠

(ک)

١٧٥۔ کف گلفروش		غلام احمد فرقت	٣/٠
١٧٧۔ کائنات تبسم		شوکت تھانوی	٣/٥٠
١٧٦۔ کعبہ میں صنم خانہ		سلام سندیلوی	٣/٠

(گ)

١٧٧۔ گاندھی جی کے ساتھ		حامد اللہ افسر	١/٥٠

(ل)

١٧٨۔ لال قلعہ		مائل ملیح آبادی	٦/٠
١٧٩۔ لب بام		عادل رشید	٥/٠
١٨٠۔ لسانیات اور اردو		سید محمود الحسن رضوی	١/٠

(م)

١٨١۔ مضامین فرحت	حصہ اول		٢/٧٥
١٨٢۔ مضامین فرحت	حصہ دوم		٢/٧٥
١٨٣۔ ماضی کی کہانیاں		آفتاب اختر تلہری	٢/٠
١٨٤۔ میرے اسٹیج ڈرامے		ڈاکٹر محمد حسن	٣/٥٠
١٨٥۔ موسم گل	(ناول)	عادل رشید	٦/٠
١٨٦۔ مجبور	(")	خان محبوب طرزی	٤/٥٠
١٨٧۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات		ڈاکٹر محمد حسن	٣/٥٠

۱۵۶۔ عذرا	(ناول)	صالحہ عابد حسین	/۰
۱۵۷۔ عرب	(ناول)	مائل ملیح آبادی	زیر طبع

(غ)

۱۵۸۔ غالب نام آورم غالب کی نادر تحریریات۔	نادم سیتاپوری	/۵۰
۱۵۹۔ غزنی دروازہ	مائل ملیح آبادی	/۵۰

(ف)

۱۶۰۔ فن خطابت	کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ	۵/۰
۱۶۱۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	/۵۰
۱۶۲۔ فریدہ	خان محبوب طرزی	۲/۰
۱۶۳۔ فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۲/۵۰
۱۶۴۔ فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۱۶۵۔ فروغ جام (جدید اڈیشن)	نشور واحدی	۲/۵۰
۱۶۶۔ فغان محسن	محسن کاکوروی	/۱۹
۱۶۷۔ فنون لطیفہ اور جمالیات	مظہر حسین	۵/۵۰

(ق)

۱۶۸۔ قصائد مومن مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۲/۵۰
۱۶۹۔ قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۶/۰
۱۷۰۔ قدر و نظر	اختر اورینوی	۴/۰
۱۷۱۔ قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۲/۰

۲۰۶۔	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۰
۲۰۷۔	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۳/۰
۲۰۸۔	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۰۹۔	نوروز "	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۱۰	نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ)	آل احمد سرور	۵/۰
۲۱۱۔	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
۲۱۲۔	نیلم	انتصار حسین	۳/۰

(ہ)

۲۱۳۔	ہمارا گاؤں	علی عباس حسینی	۳/۰
۲۱۴۔	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۱۵۔	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰
۲۱۶۔	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۱۷۔	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	" "	۱/۵۰

(ی)

۲۱۸	یاقوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۱۹	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۳/۰

ملنے کا پتہ

ادارہ فروغ اُردو نمبر ۳۷- امین آباد پارک لکھنؤ

۱۸۸۔ مطالعہ شبلی	ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی	۴/۰
۱۸۹۔ مطالعہ حالی	" " "	۴/۰
۱۹۰۔ میٹھے بول	شجاعت علی سندیلوی	۱/۲۵
۱۹۱۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۰
۱۹۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۵/۷۵
۱۹۳۔ معرکہ روم و ایران	صادق سردھنوی	۶/۰
۱۹۴۔ مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/۰
۱۹۵۔ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی اے)	حالی	۱/۲۵
۱۹۶۔ مرثیہ غالب	"	۰/۲۵
۱۹۷۔ مجموعہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۱۹۸۔ معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۱۹۹۔ مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۲۰۰۔ مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۰
۲۰۱۔ مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۰/۷۵
۲۰۲۔ مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰

(ن)

۲۰۳۔ نقش حالی اول و دوم	احتشام حسین نور الحسن ہاشمی شجاعت علی	۱۱/۰
۲۰۴۔ نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۰
۲۰۵۔ نغمہ کہسار	خان محبوب طرزی	۴/۰

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) یہ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ میں ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہوتا ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھئے۔

"مینیجر"

پاکستان کے خریدار

ماہنامہ فروغ اُردو کا سالانہ چندہ دو روپیہ

ہماری مطبوعات کی قیمت مینیجر مبارک بک ڈپو بالا نے نیشنل بینک آف پاکستان مقابل ڈینسو ہال کراچی روانہ کرکے منی آرڈر کی رسید ہم کو روانہ فرمائیں۔ اگر رسید کو براہ راست نہ ملے گی۔ تو رسالہ جاری نہ کیا جاوے گا۔ اور کراچی میں .....

ہماری مطبوعات

(۱) انوار بک ڈپو امپریس مارکٹ۔ صدر کراچی

(۲) مکتبۂ جدید۔ انارکلی لاہور سے طلب کریں

L 20

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

اعزازی مدیر

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

فارم ۱۷

بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

مقام اشاعت ــــــــ لکھنؤ

نوعیت اشاعت ــــــــ ماہنامہ

پرنٹر و پبلشر ــــــــ سیّد انصار حسین

ایڈیٹر

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

قومیت ــــــــ ہندوستانی

ملکیت ــــــــ سیّد انصار حسین

میں سیّد انصار حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں

دستخط سیّد انصار حسین

مارچ ۱۹۶۳ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰ لائسنس نمبر 1206417/2018164 ٹیلیفون نمبر 26135

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کا علمی ادبی تنقیدی

ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ

اکتوبر ۱۹۶۴ء

سالانہ قیمت دو روپئے

فی پرچہ پچیس ۲۵ پیسے

ادارت

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
صدر شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

مدیران

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ایم اے پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

حکیم عبدالقوی دریابادی بی اے

نظامت

محمد حسین شمس تابش کاکوروی مینیجنگ ڈائرکٹر

(خط و کتابت کا پتہ)

(۱) ۴۷- امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

(۲) مبارک بک ڈپو بندر روڈ
متصل ڈینسو ہال کراچی (پاکستان)

اپنی باتیں

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اردو کو ختم کرنے کے لیئے 'لسانی فسطائیت' پوری قوت کے ساتھ منظم اور مسلسل حملے کر رہی ہے یہ حملے 'جمہوریت، قومی یکجہتی، اور ہندستانیت' کے نام پر کیئے جاتے ہیں، حالانکہ ان حملوں کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ 'اردو کو' جس صورت سے بھی ممکن ہو نیست و نابود کر دیا جائے اور جب اردو ختم ہو جائے گی تو اردو والے خود بخود ختم ہو جائیں گے، کیونکہ کسی زبان کے ختم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے بولنے والے بھی زندہ درگور ہو جائیں۔ میں اس حقیقت پر پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ صرف لکھنؤ میں اردو کے ختم کیئے جانے کا کیا نتیجہ ہوا اور کس طرح اردو دنیا، مطبع، اخبارات، کتب فروش، اساتذہ، طلبا، دفتروں میں کام

شمارہ نمبر (۶) | اکتوبر ۱۹۶۴ء | جلد نمبر (۱۱)

ترتیب

۱۔ اپنی باتیں — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳
۲۔ ادبی تراشے — عیاذ احمد انصاری — ۷
۳۔ شاعری ماحول کا پرتو ہے — شکیل احمد صدیقی بی اے — ۱۷
۴۔ شاہزادہ خسرو کا المیہ — حافظ محمد حسان علوی ایم اے — ۲۵
۵۔ راہ اور منزل — عبید عباد فراہی — ۳۷
۶۔ تلاش زندگی — کیفی بلگرامی — ۳۸
۷۔ زمزمۂ کوثر — عبید اللہ فراہی — ۳۹
۸۔ کچھ نگار کے خدا نمبر کے بارے میں — محمد اسحاق صدیقی — ۶۵ تا ۸۰

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر و چیف ایڈیٹر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر
دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

فارمولے میں اُردو کو ہرگز نہیں پڑھائیں گے۔

اس کارِ خیر میں گورنمنٹ کے اسکول اور کالج بھی شریک ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دوسرے اداروں کو رہنمائی اور تقویت انھیں سے حاصل ہوئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لسانی تسطائیت، عقل و خرد کو کھو چکی ہے اور دوسری زبانوں کی دشمنی میں اس کو اچھے بُرے کی کچھ بھی تمیز نہیں رہی ہے لکھنؤ کارپوریشن نے ۹ ستمبر کو ایک تجویز پاس کی، اور اس پر ۱۴ ستمبر سے عملدر آمد شروع کیا، کہ بجز ہندی کے کسی دوسری زبان میں نہ تو کام ہوگا اور نہ کوئی کارروائی قبول کی جائے گی۔

اس حکم کے نفاذ کے بعد جن دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ان کی وجہ سے اس ہٹلری حکم، کا جو حشر ہوا، ان سے قطع نظر۔ سوال صرف یہ ہے کہ لکھنؤ کارپوریشن کے اس فیصلہ سے ملک کی جمہوریت اور سالمیت میں کتنا اضافہ ہوا؟ اور جمہوریت پسندوں نے اس کو کس نظر سے دیکھا؟

لکھنؤ اُردو کا گہوارہ رہا ہے اور اب بھی اُردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے؟ کیا کارپوریشن کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ کارپوریشن کی تمام کارروائی اُردو

کرنے والے، ان سے متاثر ہوئے علوم وفنون کی کتابیں شائع ہونا بند ہو گئیں؟

اُردو پڑھنے والوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی اقتصادی اور معاشی حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں جہاں اُردو کے حقوق تسلیم بھی کئے گئے ہیں۔ وہاں بھی اس کا نفاذ، نہیں ہوتا؟ تعلیمی ادارے اُردو کی قتل گاہ بنتے جا رہے ہیں۔ گویا آزادی کے بعد اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کا پڑھنا پڑھانا، سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی غداری ہے اور جس کا ختم کرنا سب سے بڑی دیش بھگتی ہے۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

اگر حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت جاری بھی ہوتی ہے تو اس کا مطلب الٹا نکالا جاتا ہے، سہ لسانی فارمولے کے تحت جو سرکلر جاری کیا گیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ جن اسکولوں میں اُردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے طلبار پڑھتے تھے، ان کی تعلیم روک دی گئی اور حکم یہ دیا گیا کہ صرف وہی لڑکے اُردو پڑھ سکتے ہیں جو بیسک اسکولوں سے اُردو پڑھ کر نہیں آتے ہیں۔ اسی طرح تقریباً ۸۰ فیصدی تعلیمی ادارے ایسے ہیں جنھوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ سہ لسانی

ادبی تراشہ

میر ببر علی انیس

عیاذ احمد انصاری

شمع ہا بردہ ام از صدق بہ خاکِ شہدا
تا دل و دیدۂ خوں تابہ فشانم دادند

نریٹر:۔ میر ببر علی انیس، میر ببر علی نام اور انیس تخلص فرماتے تھے۔ اُن کے باپ میر خلیق اور دادا مثنوی بدر منیر کے مصنف میر حسن تھے، پردادا میر ضاحک بھی مرثیہ کہتے تھے۔ ایک جگہ میر انیس اپنے خاندانی افتخار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

میر انیس:۔ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں۔ شاعری مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ قیام فیض آباد میں ہی میں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں طبیعت غزل کی طرف مائل تھی لیکن میرے والد مرحوم نے شروع ہی میں میری طبیعت کا رُخ مرثیہ کی طرف پھیر دیا۔ بچپن میں تخلص حزیں کرتا تھا لیکن جب والد کے ساتھ لکھنؤ آیا تو استاد ناسخ کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا اور انھیں کے ارشاد پر میں نے انیس تخلص اختیار کیا۔

میں بھی کرتا ہے۔ کیا "اکثریت" کا صرف یہ مطلب ہے کہ آئین کی دھجیاں اڑائی جائیں، اقلیت کے بنیادی حقوق کی پامالی کی جائے؟ اور اس کی جائز سے جائز بات کو نہ سنا جائے؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اردو والے اس کے خلاف ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے اور مجھے امید ہے کہ لکھنؤ کارپوریشن کو ایک نہ ایک دن ان کے مطالبات تسلیم کرنے پڑیں گے۔

کل ہند اُردو کانفرنس جے پور میں

۲، ۳، ۴، اکتوبر کو ہو رہی ہے

جس میں ملک بھر سے انجمن ترقی اُردو کے نمائندے اور ہمدردان اُردو شرکت کریں گے۔ توقع ہے کہ یہ کانفرنس ہر لحاظ سے کامیاب ہوگی اور موجودہ حالات کی روشنی میں اُردو کی ترقی اور بقا کے لئے اہم قدم اٹھائے گی۔

تمنا کہ

اُردو دنیا بھی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی اقتصادی اور معاشی اعتبار سے خوشحال باوقار اور با اثر بن جائے۔

اسا نہات سے نصیب نہ ہوئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کربلا میں داخل ہوتے ہیں، دشمن کی روک ٹوک، رفقائے امام کی برہمی اور خود حضرت امام علیہ السّلام کی درگذر کے واقعات کو ایک مرثیہ میں یوں سپردِ قلم کیا ہے:

مجدّد: اُترا یہ کہہ کے کشتیٔ اُمت کا ناخدا
جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیسی ترائی ہے کیا ہے کیا فضا
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

نذیر: حضرت عباس نے کنارے فرات خیمے نصب کرنے کی اجازت چاہی تو حضرت امام علیہ السلام نے آبدیدہ ہو کر ارشاد فرمایا، جہاں زینبؑ کی مرضی ہو وہیں خیمے نصب کر دو۔ عباس نامدار حضرت زینب سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار
اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی، چمن ہو کہ سبزہ زار
ہر جا مسافروں کا نگہبان ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
اُترو وہاں، جہاں مرے بھائی حسینؑ ہو

نریٹر: جب خلیق و ضمیر میدانِ مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو دبیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراجِ کمال تک پہونچا دیا۔ انیس نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ مشہور ہے کہ انھوں نے تقریباً ڈھائی لاکھ اشعار کہے ہیں۔ صحتِ محاورہ کے لیے ان کا کلام لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مستند مانا جاتا ہے۔ اور اسی لیے میر صاحب کو اپنے خاندان پر جو فخر ہے وہ بجا ہے۔ اکثر موقعوں پر ناز کے لہجہ میں فرمایا کرتے تھے۔

میر انیس: صاحبو! ارباب لکھنؤ میری طرح نہیں بولتے۔ میرے کلام میں میرے گھر کی زبان ہے۔ میرے باپ دادا بہو بیگم صاحبہ کے خاندان سے وابستہ تھے۔ فیض آباد میں میرے گھر پر ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے اور مثلیں درج کی جاتی تھیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں۔ یوں آپ جانتے ہیں میرا خاندان دلی کا ہے اور جو خصوصیات دلی کی زبان میں ہیں وہ ابھی تک میرے کلام میں محفوظ ہیں۔

نریٹر: میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کشی کی جو خصوصیت ہے وہ دادا کی میراث ہے۔ مثنوی بدر منیر کا وصفِ خاص یہی ہے کہ میر حسن جس واقعہ یا کیفیت کو بیان کرتے ہیں اس کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ میر انیس نے دادا کی واقعہ نگاری اور مصوری کے ساتھ بندش کی چستی اور کردار کے طرزِ گفتگو کی خصوصیت کو بھی شعر میں قائم رکھا۔ پھر مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اور میر انیس کی وہ خصوصیت ہے جو اردو کے کسی اور شاعر کو

پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا، اُن کی آواز، قد و قامت، غرض مرثیہ پڑھنے میں وہ ہر شے سے کام لیتے تھے۔ اسی مرثیہ میں جناب عباسؑ کو معلوم ہوتا ہے کہ سپاہ شام نے گھاٹ کو روک رکھا ہے اور وہ اہلبیت کو نہر پہ خیمہ لگانے نہیں دیں گے۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد عباس نامدار کو غصہ آجاتا ہے۔

سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

میر انیس خود یہ مرثیہ پڑھتے ہوں گے تو ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہوگا۔

غصہ میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے نبٹیں گے ہم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا گڑے قدم
پھریا جو شیر، سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

آگے تھے سب کے حضرت عباس ذی حشم
بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دمبدم

آج اِس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں
اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں

دشمن بہت ہیں، بادشہ خوشخصال کے
بھیا یہیں نثار، ذرا دیکھ بھال کے

مجلد :- یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
ڈنکے کی دشتِ ظلم میں کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی

اِک ایک فیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابنِ رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسِ باوفا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے اُن کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کون سا
کہدو کہ اہلبیت کے خیمے کی ہے یہ جا

لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اترو الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

تبصرہ :- مرثیہ میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے، پھر ان کے

غربت پہ ابنِ فاطمہؑ کی تم کرو خیال
قربان ہو بہن نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
عباسؑ اودھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
کرسی سے جلد اٹھ کے پکارے شہِ امام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے بد و نیک ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
پھر بھی شکن جبیں پہ نہ ہونا تھا غیظ کم
چپ ہو گئے قریب جو آئے شہِ امم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے ہوئے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

نمبر ۳:۔ امام علیہ السلام کی فوج آراستہ کی جا رہی ہے۔ عونؑ و محمدؑ جو امام علیہ السلام کے بھانجے ہیں اور حضرت زینب کے صاحبزادے ہیں علم کے استحقاق کے دعویدار ہیں اور چاہتے ہیں کہ امام علیہ السلام سے اس منصب کی درخواست کریں۔ حضرت زینب پردے کے پیچھے سے

تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیِ ستم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر ایک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر
گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
گھبرائے اہلبیتِ شہنشاہِ بحر و بر
آغوش میں پھوپھی کے سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

محمل سے مُنہ نکال کے فضہ نے یہ کہا
بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
قبضہ پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے کہ غصہ ہے شیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
ہے ہے غضب ہوا، اگر آیا انہیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال

یہ وقت ہے امداد امام ازلی کا
وے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زورِ علی کا

زہیرؔ، عونؔ اور محمدؔ زخمی ہو کر گرے ہیں اور قریب المرگ ہیں۔
حضرت امام علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت علی اکبر ان کے لاشے اٹھانے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔
حضرت زینب انھیں روکتی ہیں اور لوگوں کو رونے سے منع کرتی ہیں لیکن آخر ماں ہیں۔ اُن سے ضبط نہیں ہو سکتا اور پھر خود بھی بین کرتی ہیں۔

مجلدو:۔ رُخ زرد تھے اور خاک میں آلود تھے گیسو
جھک آئے تھے کٹ کٹ کے منھ پہ وہ ابرو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلورسے بازو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سے پہلو
پھنکتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

رو کر شہ والا نے کہا صدقے میں تم پر
دم بھر انھیں رو لو یہ مہماں ہیں خواہر
بانو نے اشارہ کیا اے سبطِ پیمبر
قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب
یہ ماتمِ اولاد ہے مر جائیں گی زینب

دونوں بیٹوں کی گفتگو سن لیتی ہیں اور وہ چپکے سے فضہ کو اشارہ کر کے عون و محمد کو بلواتی ہیں۔ اور علم کے بارے میں عباس نامدار کے حق میں دست بردار ہونے کے لئے دونوں بیٹوں کو سمجھاتی ہیں۔

ماں کہہ پہونچتا ہے تمہیں منصب جعفر
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر
بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کرو گے
عباس سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے

زینب نے سنا یا نہ جو کچھ اُن سے یہ گفتار
یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ دلدار
شاہوں سے غلاموں نے بھی کی ہے کبھی تکرار
مالک ہیں جسے چاہیں علم دیں شہ ابرار
رخصت کیلئے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں

مجدد :۔ زینب نے کہا لے کے بلائیں کہ سدھارو

بس اب مرا دل شاد ہوا اے مرے پیارو
ماں صدقے گئی سر قدم شاہ پہ وارو
ہو عید مجھے گر عمر و شمر کو مارو

شاعری ماحول کا پرتو ہے

شکیل احمد صدیقی ایم اے

شعر جذبات انسانی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ماحول کا پرتو کسی دور کی سوسائٹی کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ اُس دور کی شاعری ہوتی ہے جب قدیم زمانہ کی معاشرتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالت بتانے سے تاریخ کے اوراق خاموش ہوتے ہیں اُس وقت ان باتوں کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف اُس دور کی شاعری ہے۔ شاعر سے زیادہ اپنے ماحول کا ترجمان اور کوئی دوسرا نہیں ہوتا وہ آپ بیتی بھی بیان کرتا ہے۔ اور جگ بیتی بھی وہ فطرت کی طرف سے دردمند اور حساس دل، دوررس نگاہ اور وسیع دماغ دے کر بھیجا جاتا ہے وہ بے پناہ طاقتوں کا مالک ہوتا ہے وہ اپنے ایک شعر سے وہ کام لے لیتا ہے جو ایک جنگ آزمودہ سپاہی اپنی تلوار سے بھی نہیں لے پاتا وہ اشہب دوراں کی باگ دوسری طرف موڑ دیتا ہے۔

حالی کی زبان میں "شاعری مردہ روحوں میں زندگی کی نئی لہر پھونک دیتا ہے۔ قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔ ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے۔ اس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے"

یہی وجہ ہے کہ عرب میں شاعر کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

نریٹر:۔ روتے ہوئے خیمہ سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ
فرزندوں پہ چلانے لگی زینب ذی جاہ
یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ
صدقے گئی جاؤ شہ کونین کے ہمراہ

زخمی ہوئے شبیر تو جان اپنی میں دوں گی
اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لو تیغے کاندھوں پہ دھر لو میرے پیارو
تشنہ ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو
گو پیاسے ہو دو دن کے پہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اتارو

اٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

رنے یا ان کی اصلاح کرنے کے لئے وہ اشعار کہتا ہے۔ اُن کے ماحول کی جب تک پوری ترجمانی نہیں ہوتی کبھی شاعری موثر اور مقبول نہیں ہو سکتی۔

اصلاحی اور پیغمبرانہ شاعری میں اس چیز کی اور بھی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ کان کبھی ایسی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے جس میں اجنبیت یا منافرت پائی جائے اسلئے شاعر کو اپنے گرد و پیش کے ماحول میں ڈوب کر اس انداز میں اپنا پیغام پیش کرنا ہوتا ہے کہ اصلاحی پہلو اُجاگر رہے۔

یوں تو شاعر ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو اپنے دامنِ شاعری میں سمیٹ لیتا ہے لیکن ماضی اور مستقبل کو اُسے حال کے ساتھ اس طرح سمونا پڑتا ہے کہ سامع کو سب حال ہی حال نظر آتا ہے۔

جو شاعر مقتضیات زمانہ کا لحاظ نہیں رکھتا اُس کے کلام کو کبھی قبول عام حاصل نہیں ہوتا اگر اب سے سو سال پہلے کوئی شاعر اپنے کلام میں راکٹ ایٹم بم یا ٹیلی ویژن کا ذکر کرتا تو لوگ حیرت سے اُس کا منہ تکتے اور اُسے دیوانہ یا پاگل سمجھتے اسی طرح اگر موجودہ دور میں کوئی شاعر کبوتر سے نامہ بری کا کام لینے یا میلوں کی مسافت ناقہ پر بیٹھ کر طے کرنے کو کہے تو وہ فاطر العقل خیال کیا جائے گا۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے اُس کے تقاضوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسلئے ماحول سے متاثر ہو کر نوائے شاعر میں بھی تبدیلی رونما ہونا ناگزیر ہے مختلف صنف شاعری کے مختلف زمانوں میں عروج حاصل کرنے اور مقبول خاص و عام رہنے کا سبب یہی ہے کہ جیسا سوسائٹی کا ماحول ہوا اُسی قسم کا رنگ شاعری پسند کیا گیا اور شعراء کی طبیعتیں بھی اُسی طرف جولاں ہوئیں تقریباً

مشہور یونانی فلسفی حکیم افلاطون نے شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کی:
"شاعر ایک لطیف، ہستی شہپر رکھنے والی مقدس مخلوق ہے۔"
خسرو شاعری کی عظمت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں "شاعر جب اپنا قلم کو سیاہی میں تر کرتا ہے تو وہ دو سو برس کی خدمت ایک لمحہ میں ادا کر دیتا ہے..... اُس کے ہر ایک شیریں لفظ میں ایک زندگی مضمر ہے۔"
علامہ اقبال نے فطری شاعری کی تعریف کس قدر بلند انداز میں کی ہے۔

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرع زندگی ہری

شانِ خلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اُس کی قوم جب اپنا شعار آذری

لیکن یہ تعریف عصر حاضر کے شعراء پر عموماً صادق نہیں آتی آج کل کے شاعروں کا تو اقبال ہی کے الفاظ میں یہ حال ہے ؎

شاعری نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق   افکار میں ڈوبا نہ وہ خوابیدہ نہ بیدار

اگرچہ تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ شاعروں نے سوسائٹی کے نظام کو اپنی آتش نوائی سے بدل دیا اور ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے خود ماحول کو اپنی اصلاحی شاعری سے متاثر کیا لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے شاعری کے لئے ماحول کا پرتو ہونا ایک ناگزیر حقیقت ہے کیونکہ شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے جن لوگوں کے ساتھ وہ زندگی گذارتا ہے جس سوسائٹی میں وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے جن رسم و رواج سے اُس کا سابقہ پڑتا ہے جن کو خوش

ہوکر راج پاٹ کھو چکے تھے اب سوائے بھگوان کے اور کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا اس لیے شعراء نے بھی اُسی سے لَو لگائی اور اُن کی شاعری بھکتی میں ڈوب گئی اسی مناسبت سے اِس دور کو بھکت کال کہتے ہیں لیکن مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اچھا برتاؤ دیکھ کر چند سال بعد یہ رنگ شاعری بھی بدل گیا۔

دوسری زبانوں کی شاعری کی طرح اُردو شاعری بھی مختلف ادوار سے گذری اُردو کی تخلیق اور نشو و نما چونکہ صوفیائے کرام کے برگزیدہ ہاتھوں سے ہوئی لہذا ابتدائی دور میں اُردو شاعری پر صوفیانہ رنگ غالب رہا اس نے شروع کے کچھ اچھے دن دیکھے ہیں اُس وقت عیش و عشرت کی جنسی ہر طرف تھی رہی تھی فارسی کی سرپرستی کا ہاتھ اس کے سر پر تھا حکمراں کردار کے غازی کم گفتار کے غازی زیادہ تھے وہ مبالغہ آمیز مدح و ستائش سے خوشی محسوس کرتے تھے دولت کی فراوانی تھی انعام و اکرام کی اُمید نے شعراء کو قصائد کی طرف متوجہ کیا فارسی قصائد کا نمونہ سامنے تھا چنانچہ اُسی طرز پر اُردو میں بھی زور و شور سے قصیدے لکھے گئے اور سوداؔ جیسے باکمال اُستاد کا سکہ مملکت شاعری میں رائج ہو گیا قصیدہ کے دوش بدوش غزل بھی چل رہی تھی کیونکہ اُسی زمانہ میں ایک ایسا شاعر اعظم بھی موجود تھا کہ جس کو اُس کی بدقسمتی لیکن غزل کی خوش قسمتی سے فطرت کی طرف سے اندوہگیں اور غم پسند طبیعت عطا ہوئی تھی اُس نے اپنے اوپر وہ تمام وسائل اور ذرائع مسدود کر رکھے تھے جو سوداؔ کو حاصل تھے وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا تھا آشوبِ زمانہ کا شکار تھا، درد مند دل رکھتا تھا اور عشق پیشہ تھا انھیں چیزوں نے مل کر اُس کے کلام میں سوز و گداز اور درد و اثر پیدا کر دیا ہے۔

ہر زبان کی شاعری میں ہمیں یہی چیز نظر آتی ہے طلوع اسلام سے قبل دورِ جہالت میں عربوں کی فطرت بڑی جنگجویانہ تھی وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے تھے اگر کسی قبیلہ میں دشمنی کی آگ بھڑک اٹھتی تو وہ سالہا سال تک بجھائے نہ بجھتی اگر ایک مرتبہ تلوار نیام سے باہر آجاتی تو سیکڑوں انسانوں کا خون پینے کے بعد بھی وہ نیام میں نہ جاتی یہی وجہ ہے کہ عربی شاعری میں بہادری جوش اور بلند حوصلگی کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اور جو زور اس شاعری میں ہے وہ کسی زبان کی شاعری میں نہیں۔

فارسی شاعری نے جس وقت آنکھ کھولی ہر طرف عیش و عشرت کی دیوی کا راج اور ملوکیت و شہنشاہیت کا دور دورہ تھا شعراء کو ذرا ذرا سی بات پر انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا اور ایک ایک قصیدہ پر زر و جواہر میں تول دیا جاتا تھا اس لئے مدحیہ شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا چنانچہ عجم کے پاس اس قسم کی شاعری کا بے پناہ ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔

ہندی شاعری کو بھی مختلف دوروں سے گذرنا پڑا ایک دور ایسا تھا کہ جب آپس کی خانہ جنگیوں نے یہاں کے راجاؤں کی طاقتوں کو کمزور کر دیا تھا مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے شروع ہو گئے تھے کمزور راجاؤں نے باہری طاقتوں کو حملہ کی دعوت دی تھی اس پر آشوب دور میں شعراء نے اپنے کمزور راجاؤں کو ہمت دلانے کے لیے شجاعت و بہادری کی داستانیں نظم کیں جو ویرگاتھائیں کہلاتی ہیں بعد میں جب یہاں مسلمانوں کا تسلط ہو گیا تو کچھ عرصہ تک ہندو رعایا پر بڑی سراسیمگی کی کیفیت طاری رہی راجا شکست خوردہ

یہ رنگ قائم رہا

جب انگریزوں نے بساطِ سلطنت اُلٹ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا کے بدلنے کے ساتھ شاعروں کا اندازِ فکر بھی بدلنے لگا اور زمانہ نے حالی، آزاد اور اکبر جیسے مصلحین شعراء کو جنم دیا نئے علوم و فنون کی ترقی نے شعراء کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور جدید ضرورتوں اور نئے مراحل سے دوچار ہونے کے لئے جدید شاعری کی بنیاد پڑی۔ سائنس کی ترقی نے دُنیا کے ممالک کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا اس لئے اب شعراء کے کلام میں آفاقیت کی زیادہ ضرورت محسوس کی جانے لگی چنانچہ اقبال کی آتش نوائی نے وقت کے اس تقاضہ کو بہت کچھ پورا کیا۔

ہندوستان میں آزادی کی جنگ چھڑ چکی تھی جوں جوں اُس کے شعلے بھڑکتے گئے شعراء کو بھی اپنی زد میں لیتے گئے یہاں تک کہ ہر شاعر ان شعلوں سے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوا بلکہ بعض شعراء نے تو متاثر ہونے کے بعد اس آگ کو تیز سے تیز تر کرنا اپنا فرض منصبی سمجھ لیا اور جنگل کی آگ کی طرح ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پھیلا دیا اس سلسلہ میں انھوں نے وہی خدمت انجام دی جو عرب شعراء زمانۂ جاہلیت میں جنگ کے موقعوں پر انجام دیا کرتے تھے۔

مخلص رہنماؤں کی ان تھک کوششیں اور وطن کا درد رکھنے والے شعراء کی کاوشیں آزادی کی شکل میں رونما ہوئیں غلامی کی زنجیریں کٹ تو گئیں لیکن افسوس کہ صرف ہاتھ پیروں سے۔ دماغ عام طور پر بدستور زنجیرِ غلامی میں جکڑے رہے۔ ہندوستان کی روایاتِ قدیمہ کے خلاف بغیر گشت وخون کے

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اس شاعر اعظم کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے "داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں میر کا ہمسر کوئی نہیں پیدا ہو سکا محبت اور انسانیت کے نغمہ کو انھوں نے جس درد اور سوز کے ساتھ گایا ہے اس کی مثال نہیں ملتی"

داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی اس درد و سوز کا نتیجہ ہے جو انہیں مبدء فیاض کی طرف سے عطا ہوا تھا اور عشق نے جسے اور بھی شعلہ زن کر دیا تھا۔

قصائد کی دھوم دھام ذوق تک قائم رہی اگرچہ اس کے ممدوح کی حیثیت ایک نقاد کے الفاظ میں شاہ شطرنج سے زیادہ نہ رہی تھی۔

سعادت علی خاں رنگین جیسے عیش و عشرت کے متوالے بادشاہ کے عہد میں ایک نیا ہی رنگ سخن پیدا ہو گیا تھا جسے ریختی کہتے ہیں اور جو شاعری کے رخ زیبا پر ایک بدنما دھبہ ہے۔

امتداد زمانہ کے ہاتھوں جب دلی اجڑی اور لکھنؤ شاعری کا مرکز ٹھہرا اس وقت اودھ عیش پرستی کے پورے عروج پر تھا نوابین اودھ کے لشکر کے ساتھ طوائفوں کے ڈیرے چلا کرتے تھے بادشاہ اور امراء کو عیش و عشرت میں مبتلا دیکھ کر رعایا بھی اپنے حال میں مست تھی شاعری اس رنگ سے متاثر ہوئے بغیر کیسے بچ سکتی تھی چنانچہ ہوئی اور خوب ہوئی یہی وجہ ہے کہ شاعری میں بھی عریانیت پیدا ہو گئی داخلیت کی جگہ خارجیت نے لے لی پاک جذبات کی جگہ گندے خیالات نظم ہونے لگے مجاز کے پردوں میں حقیقت بالکل چھپ گئی اور شعراء کی فکر رسا کنگھی چوٹی اور زلف و گیسو میں الجھ کر رہ گئی ماحول کی تبدیلی تک

شاہزادہ خسرو کا المیہ

حافظ محمد حسان علوی ایم، اے بی اے (آنرز)

ایک زمانہ تھا کہ طاقت ہی سب کچھ تھی۔ اسی کے بل بوتے پر سب کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وراثت کے قانون کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی، جب کبھی کسی حکومت کے خلاف بغاوت اٹھتی تھی، تو تیموری خاندان کا ہر فرد چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کو حق پہونچتا ہو یا نہ پہونچتا ہو مغل تاج پہننے کے لئے اپنے آپ کو فطری طور سے حقدار سمجھتا تھا۔ اس بات کے لئے وہ شکست و فتح کی پرواہ کئے بغیر تلوار کی طاقت کے زور سے فیصلہ کن جنگ کرتا تھا!

اسی طرح شہنشاہ جہانگیر کے بڑے لڑکے شاہزادہ خسرو کی زندگی باہمی مخالفت کی وجہ سے مغل دور کا ایک المیہ بن کر رہ گئی۔ سازش کے ذریعہ اپنے باپ کو تخت سے ہٹا دینے کا خسرو کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، اور وہ گرفتار کر لیا گیا، یہاں تک کہ زندگی بھر کی قید دینے کے بعد اس کو بڑے ہی دردناک طریقہ پر قتل کر دیا گیا، اس طرح ایک شاندار و کامیاب زندگی ایک المیہ پر ختم ہو گئی۔

خداداد قابلیت: خسرو، مان بائی ایک راجپوت ماں کے بطن سے ۱۳ فروری ۱۵۸۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں امبر کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی

جو آزادی ملی اس نے دوسری شکل میں بے حساب خون بھینٹ میں لے لیا ملک والوں نے آپس ہی میں لڑنا شروع کر دیا اور بھائی نے بھائی کا گلا کاٹنے میں دریغ نہ کیا بہیمیت اور درندگی کے وہ وہ ہولناک مناظر سامنے آئے کہ چنگیزی اور ہٹلرزم بھی پناہ مانگ گئی فرقہ وارانہ فسادات کی آگ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ ان لرزہ براندام کرنے والے فسادات کا سیل بے پناہ پوری طرح رکنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور سانحۂ عظیم واقع ہوا اور وہ ملک کے سب سے عظیم رہنما مہاتما گاندھی کا قتل تھا جو دراصل ان ہی فسادات کی ایک کڑی تھی یہ ایسا زبردست نقصان تھا جس کی تلافی ناممکن تھی ان خونی واقعات اور سانحات پر ہمارے شعراء نے بھی خون کے آنسو بہائے ان کے یہ آنسو جو کاغذ پر اشعار کے روپ میں بکھرے ہوئے ہیں ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ ایسے شعراء کی فہرست طویل ہے جن میں سے جگر، جوش، مجاز، روش، ملا، وامق جونپوری اور نشور کے نام قابل ذکر ہیں۔

حصول آزادی کے بعد ملک جن گوناگوں دشواریوں سے دوچار ہوا اور جو ملک میں جو جو ترقیاں ہوئیں اس کی بھی جھلکیاں ہمیں شعراء کے کلام میں واضح طور پر مل جاتی ہیں اور یہ چیز اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتی ہے کہ شاعری درحقیقت ماحول کی ترجمانی ہی ہے۔

مان بائی، جو خسرو کی پیدائش کی وجہ سے شاہ بیگم کے مرتبہ پر پہونچا دی گئی تھی، اپنے لڑکے کے احساسات سے بے حد پریشان تھی، اس نے اپنے لڑکے کو پیار و محبت سے سمجھایا، لیکن نہ وہ راضی ہوا اور نہ ہی مان بائی کا دودھ شریک بھائی مان سنگھ۔ تو اس نے ۱۶۰۴ء میں افیم کھا کر خودکشی کر لی، اس موت نے سلیم کو بے حد غمزدہ کر دیا، اور سلگتے ہوئے دماغ میں اس نئے شعلہ نے اور بھی بھڑک پیدا کر دی، وہ خسرو سے شدید نفرت کرنے لگا، اس نے خسرو کو مان بائی کی خودکشی کا واحد ذمہ دار ٹھہرایا، اس نفرت نے آگے آنے والے المیہ کے بیج بو دیئے۔!!

ستمبر ۱۶۰۵ء میں اکبر کو اپنی زندگی کے آخری سال میں مسلسل موتوں اور ناامیدیوں کی وجہ سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے موت اس کے قریب آگئی ہو، سلیم اور خسرو کے درمیان زبردست جھگڑے کی وجہ سے اکبر کی بیماری میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، اسی بیماری کے دوران دربار میں دھوکہ بازی غداری اور سازشوں کی وجہ سے ایک طوفان آیا ہوا تھا اور تخت کے لیے زبردست کشمکش شروع ہو گئی تھی، اس میں کئی پارٹیاں شامل تھیں۔

حکومت کے معاملات سمجھنے سے قاصر ہو کر اکبر نے خان اعظم کو نائب قائم مقام بادشاہ مقرر کر دیا، لوگ موقعہ کی تاک ہی میں تھے، عزیز کوکا نے مان سنگھ کے مشوروں سے حکومت کی تمام اہم جگہیں اپنے آدمیوں سے فوراً بھر دیں، شاہزادہ سلیم کو بغیر خون بہائے گرفتار کرنے کی تجویز تھی کہ جب وہ اپنے باپ کو دیکھنے کے لئے آئے، تو اس کو اکبر کی موت تک قید رکھا

تھی، اُس وقت کسی کو کیا پتہ تھا کہ خسروؔ کی زندگی اتنی دردناک طریقہ پر ختم ہوگی اس کے بچپن کے حالات مورخین نے کچھ نہیں لکھے ہیں۔ سترہ برس کی عمر ہی سے لوگ اُس کی خداداد قابلیت کے قائل ہونے لگے تھے، شاہزادہ خسرو، وہ تمام تہذیب و تمدن اور علم کا مالک تھا جو تیموری خاندان کے شاہزادوں کی شاندار روائتیں تھیں لیکن یہ دوسرے شاہزادوں سے بالکل مختلف اور شریف الطبع و شریف النفس تھا۔ اس کی صرف ایک ہی بیوی تھی جو مرزا عزیز کوکا کی لڑکی تھی، آخر وقت تک وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا رہا اور کسی دوسری عورت کی طرف اس نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا، وہ اپنے باپ کی عیاشانہ زندگی کو بہت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور شرفائے دربار اور شاہزادے جو عیاشی کی زندگی گزارتے تھے، اُن سے بھی اس کو سخت نفرت تھی صاف گوئی اور سخاوت کی وجہ سے وہ غریب و امیر دونوں میں بے حد مقبول تھا۔

شہنشاہ اکبر کا اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے شاہزادہ سلیم ہی تخت کا وارث تھا، اور بعد کو وہی تخت نشین ہوا لیکن اس کی بے اعتدالانہ عادتیں عیاشی اور بغاوت نے اکبر کے دماغ میں شک و شبہہ پیدا کر دیا تھا، اور تخت کے وفادار لوگوں کے دلوں میں بھی شک ڈال دیتے تھے۔ شاہزادہ خسرو راجہ مان سنگھ کا نواسہ، عزیز کوکا کا داماد اکبر کا منظور نظر پوتا اور عوام کا ہر دلعزیز ہونے کی وجہ سے لوگ ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ جھگڑے میں پڑی ہوئی دولت کا مالک بن جائے گا۔ سترہ سال کی عمر ہی سے وہ سیاسی اکھاڑوں اور مخالفت کا مرکز بن گیا تھا۔

مقصد میں کامیاب ہوتے ہوتے تھوڑا سا رہ گیا، چونکہ وہ بادشاہ ہوتا، وہ غصہ میں اور بھی پاگل ہو جایا کرتا تھا۔ جب یہ سوچنے لگتا کہ وہ حکومت کا قیدی ہے اور اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ ان ہی پریشان کن باتوں نے اس کے دل و دماغ کو پراگندہ کر رکھا تھا، اس کے بعد اس نے فرار حاصل کرنے کے مختلف ذرائع پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔!

فرار۔ یہ موقعہ اس کو ۱۰ اپریل ۱۶۰۶ء میں مل گیا، شاہزادہ خسرو نے اکبر کے مقبرہ پر سکندرہ جانے کا بہانہ کیا اور لاہور کی طرف فرار ہو گیا۔ اس کی چھوٹی عمر، اس کی دلکش شخصیت اور تباہ حالی نے فوراً لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ترن تارن پہونچ کر خسرو نے پانچویں سکھ گرو ارجن دیو سے مالی مدد حاصل کر لی اور وہیں رہ پڑا۔

جہانگیر لڑائی نہیں چاہتا تھا، اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا لیکن بات چیت جب ناکام ہو گئی، تو دونوں نے جنگ کرنے کی ٹھان لی بھیروال میں فیصلہ کن جنگ بہت مختصر رہی، خسرو کی فوج مکمل طور سے تباہ کر دی گئی، اور قیدیوں کے ساتھ کوئی شریفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا۔ خسرو کے ہاتھ باندھ دیئے گئے، اور وہ کپکپاتا ہوا اور روتا ہوا اپنے دو وفادار ساتھیوں عبدالرحیم حسین بیگ کے ساتھ ایک عام مجرم کی طرح لایا گیا، اس بات نے جہانگیر کو ایک موقعہ فراہم کر دیا اور اسی کے ساتھ اس کے کیریکٹر کی بے رحمی عود کر آئی، اس نے شاہزادے کے سات سو ساتھیوں کو تیز دھار نیزوں پر دو ہری لائن بنا کر چلنے کا آرڈر دے کر شاہزادہ خسرو کو طلب کیا کہ وہ خود آکر یہ جابرانہ سزا اپنی آنکھوں

جائے اور شاہزادہ خسرو کو بادشاہ بنا دیا جائے، شاہزادہ خسرو کے وارث ہونے کے امکانات ایکبارگی روشن ہو گئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ پارٹ ناکام رہا، ان کے یہ ارادے پہلے ہی سے ظاہر ہو گئے۔

اس بات نے خان اعظم کو سامنے آنے کے لئے مجبور کر دیا، اور اس نے فوراً امرائے دربار کی ایک میٹنگ بلائی، اس میں اس نے شاہزادہ سلیم کی زیادتیوں کے خلاف بڑے ٹھوس دلائل پیش کئے، اور یہ کہا کہ چغتائی سلطنت کا واحد شخص خسرو ہی ہے، جو اکبر کے بعد تخت کا وارث ہونے کا مکمل طور سے مستحق ہے، لیکن اس میٹنگ میں پھوٹ پڑ گئی اس لئے کہ اس میں اکثریت نے سلیم کے حق میں ووٹ دیئے اور قانونی طور سے اس کو تخت کا وارث تسلیم کیا، اس طرح خسرو کی بے قاعدہ لڑائی کمزوری کی وجہ سے ختم ہو گئی، عظیم الشان فتح کے موقعہ پر جہانگیر نے سب سے پہلا کام جو کیا، وہ تھا عام معافی نامہ جس میں شاہزادہ خسرو بھی شامل تھا، اس کو اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ اور ایک گھر شہر میں رہنے کے لئے عطا کیا گیا، فوری طور سے اس بات سے تسکین ہو گئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ باپ بیٹے کے دلوں میں نہ بھرنے والا شگاف پیدا ہو چکا تھا اور حالیہ بے عزتی نے جہانگیر کے دماغ میں جگہ پکڑ لی تھی، اسی بنا پر اس نے خسرو کو آگرہ فورٹ میں تقریباً نصف طور سے قید کر دیا تھا۔!

خسرو اپنے طور پر یہ نہیں فراموش کر سکتا تھا کہ وہ بھی ایک زبردست طاقت کا مالک ہے اور پس پشت امرائے دربار کی مکمل اعانت، وہ اپنے

شاہزادہ جب اپنی داخلی پریشانیوں سے نجات پاکر کبھی تھوڑی دیر کیلئے چست بننے کی کوشش کرتا، تو باپ کی ہمیشگی خفگی اور متلون مزاجی سامنے آجاتی تھی لیکن اس درمیان میں اس نے اپنے ارادوں کو پھر مضبوط کرنا شروع کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ تخت حاصل کرنے کی ایک مرتبہ اور سخت کوشش کر لی جائے، وہ اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

جہانگیر بغاوت اور باغیوں کو کچلنے کی جو سخت سزائیں دے چکا تھا اس بات سے تقریباً چار سو افراد جہانگیر سے اختلاف کرنے لگے اور اس مخالفت نے اپنی خاصی جڑ پکڑ لی تھی، ان چار سو آدمیوں کا پلان تھا کہ جہانگیر جب کہیں شکار میں گیا ہو، تو اس کو وہیں قتل کر دیا جائے اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے کر خسرو کو آزاد کرالیں اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیں، اس پلاٹ میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہونے والی تھی اور ہو سکتا تھا کہ کامیاب بھی ہو جائے لیکن ایک ساتھی نے اس سازش کا راز پرنس خرم (بعد کو شاہجہاں) سے کہہ دیا جس نے اپنے باپ کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔

یہ سازش بری طرح ختم کر دی گئی۔ رنگ لیڈران کو سزائیں دی گئیں، اور نیچے درجے کے سپاہی چھوڑ دیے گئے۔ یہ جہانگیر کی خاص سیاست تھی کہ وہ رنگ لیڈران کو سخت سے سخت سزائیں دیا کرتا تھا لیکن سپاہیوں کو ہمیشہ معاف کر دیا کرتا تھا۔

خسرو کا اب کیا ہوگا۔؟ یہ سوال ہر شخص کے ہونٹوں پر تھا، بادشاہ خود اپنے لڑکے کو موت کی سزا نہیں دے سکتا تھا، لیکن اس کو کس طرح بے ضرر

سے دیکھ لے۔!

خسرو اس وحشیانہ سلوک کو دیکھ کر مستقل کئی روز تک روتا رہا، اور اس کے بعد ہی اس کے دلکش چہرے پر ہمیشہ کے لیے غم کے بادل چھا گئے اور یہ اداسی کبھی بھی ختم نہ ہوئی، عبدالرحیم اور حسین بیگ۔ کو گیلی کھالوں میں سی کر گدھوں پر بٹھلایا گیا اور لاہور کی سڑکوں پر ۱۲ گھنٹوں تک گشت کرایا گیا، یہاں تک کہ حسین بیگ بغیر کچھ بولے ہوئے مرگیا اور دوسرا بچ گیا اور آخر میں معاف کر دیا گیا۔

جہانگیر کے بدلے کی پیاس ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنی آنکھیں سکھ گرو پر گاڑ دی تھیں، اُس کے غصہ کا آخری شکار یہی تھا، یہ کارروائی سزا کے طور پر کی جانے والی تھی، یہ سزا مذہبی عداوت کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس گرو نے بغاوت کے بیج بونے کی کوشش کی تھی۔!

بیچارہ خسرو بیڑیاں ڈال کر قید میں ڈال دیا گیا، اور اس پر شہنشاہ کے خاص نگراں مقرر تھے، ان کے علاوہ دوسرے بھی پہرہ دیا کرتے تھے۔

مارچ ۱۶۰۷ء میں جہانگیر نے اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھ کر خسرو کو شاہی کارواں کے ساتھ کابل جانے کی اجازت دیدی تھی، وہاں اس کی نگہداشت میں کمی کر دی گئی، یہ کمی باپ کے جذبات کو دیکھتے ہوئے یا حرم کے زور ڈالنے پر کی گئی تھی، باپ بیٹے کی قسمت کو ایک المیہ نے بری طرح گھیر رکھا تھا، ان میں سے ایک میں اگر گرم جوشی پیدا ہوتی یا ایک نرم پڑتا تھا، تو دوسرا سخت مخالف رویہ اختیار کر لیتا تھا۔!!

کا ایک جال بچھا دیا۔ اکتوبر ۱۶۱۶ء میں شہنشاہ جو شراب کا بندہ تھا، نے اپنی ملکہ کی التجائیں فوری طور پر تسلیم کر کے خسرو کو فرشتہ صفت انی رائے والوں کے چارج سے لے کر اس کے زبردست دشمن ملکہ نورجہاں کے بھائی آصف خاں کے حوالہ کر دیا، اس بات نے ملک میں بے چینی پیدا کر دی، اور عوام نے اس بات کو شاہزادے کی ذاتی حفاظت کے لئے ایک زبردست خطرہ محسوس کیا۔ !

۱۶۱۶ء میں جو افواہ اڑ رہی تھی کہ نورجہاں اپنی لڑکی کی شادی خسرو سے کرنا چاہتی تھی، بالکل لغو اور بے بنیاد تھی، انگریز سفیر سر تھامس رو نے اس نام نہاد بات کی سخت مخالفت کی ہے اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔ ملکہ نے خسرو کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا چاہا۔ لیکن اُس نے اس پیش کش کو بہت بری طرح ٹھکرا دیا تھا، اس سے ملکہ کی خودداری کو زبردست ٹھیس لگی اور وہ اس کی سخت دشمن بن گئی۔

۱۶۲۰ء میں شاہجہاں کو دکن روانہ ہونے کا حکم صادر کیا گیا، تاکہ وہ وہاں مغلوں کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرے جس کو ملک عنبر نے خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا، شاہجہاں نے اس مہم پر جانا منظور کر لیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کے رقیب بھائی خسرو کو اس کے حوالہ کر دیا جائے اس سے اس کے مددگاروں کو پورا بھروسہ ہو جائے گا، بلکہ یہ بھی کہ ملکہ نورجہاں اور خسرو کے الحاق کی جو خبریں گشت کر رہی تھیں اُن کا بھی اس شرط سے خاتمہ ہو جائے گا، جہانگیر نے اپنے دل کو خسرو کی طرف سے بہت حد تک نرم کر لیا تھا وہ شاہجہاں کے رحم و کرم پر خسرو کو حوالہ کرنے کے لیے کسی طرح رضامند نہیں

بنائے اور پچھلی باتوں کی تکرار سے کس طرح بچایا جائے یہی سب سوالات جہانگیر کو پریشان کئے ہوئے تھے، اور ہر شخص بھی پریشان و فکر مند تھا کہ دیکھو اب خسرو کی زندگی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

اندھا کر دیا گیا:۔ مہابت خاں کی رائے سے جہانگیر اس بات پر مجبوراً ہو گیا کہ وہ شاہزادے کو اس کی آنکھوں کی روشنی سے محروم کر دے ظاہری طور سے اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کو سی دیا گیا، تاکہ وہ دیکھ نہ سکے زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ خسرو کی بغاوت کی یاد مدھم پڑ گئی، جہانگیر کو رحم آ گیا اور ۱۶۰۸ء میں اس نے ایک ایرانی اسپشلسٹ کو بھیجا جس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے علاج سے اس کی ایک آنکھ کی روشنی کو دوبارہ واپس لے آیا، گو کہ دوسری بالکل ختم ہو گئی تھی، خسرو نے قسمت اور پریشانیوں کے جو نشیب و فراز برداشت کئے تھے، اس نے ہمیشہ کے لئے عوام کا پیار اس کے لئے قائم کر دیا تھا، ۱۶۱۳ء میں ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ اس کو دوبارہ شاہی لطف و کرم مل جائے، لیکن یہ بات نورجہاں نے منظور نہیں کی اور نہ بات اس کے موافق ہی آئی تھی، اس لئے کہ وہ مغل وراثت سے متعلق اختلاف رکھتی تھی، اس نے دوسرے سال احکامات جاری کر کے وراثت کے رُخ کو پلٹ دیا، جہانگیر نے ان احکامات کی تصدیق کر دی۔

دائمی گرفتاری میں خسرو کو ابھی اور مزید پریشانیاں اٹھانا لکھی تھیں اس کو ایک عورت کی خواہشات کا کفارہ ادا کرنا پڑا، اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پوری کوشش کی اور شاہزادے کے خلاف سازشوں

کی خبر پر پورا پورا اختلاف کیا ہے ، لیکن کیا کرتا مجبور تھا ۔!

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب انتقام کی دیوی اپنا کام انجام دے چکی تھی غم سے نڈھال شاہجہان نے اس وقت سوچنا شروع کیا ، جب خود اس کے دو لڑکے دارا شکوہ اور شجاع بڑا لمانہ اور سفاکانہ طور سے اورنگ زیب کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکے تھے کہ " یہ رونا اور واویلا مچانا کہاں تک صحیح ہے جبکہ تم نے خود اپنے دو بھائی پرویز اور خسرو کو اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا ، جبکہ ان لوگوں نے تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا تھا " ۔ یہی سب باتیں سوچ سوچ کر وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا ۔

مغل تاریخ میں اس سے بڑی ٹریجڈی کسی کی زندگی کے ساتھ پیش نہیں آئی خسرو دوسروں کی غلطیوں کا کفارہ اپنی ذات سے ادا کرتا تھا اور مسلسل ہر مہم میں اس کو ناکامی ہوتی تھی ، صرف اس کی بیوی ہی تھی جس کی اٹوٹ محبت نے اس کی ہر معاملہ میں رہنمائی کی اور ہر وقت اس کا ساتھ دیا ، اس کی بیوی حسن کا ایک عدیم المثال نمونہ تھی ، اور شوہر پرستی میں اپنی آپ مثال تھی وہ اپنے شوہر کی سخت سے سخت زندگی سے بھی نہیں گھبرائی اور ہمیشہ ساتھ رہی ، وہ اس کے عارضی اندھے پن کے زمانہ میں بھی ایک مرہم کا کام دیتی تھی اور اس کو ہر طرح سے خوش رکھتی تھی اور دکن کی اندوہناک مہم میں بھی وہ اپنے شوہر کے ساتھ تھی ، اس کے دو لڑکے بھی ظلم سے نہ بچ سکے ، اور شاہجہاں کے تخت نشین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا بھی خاتمہ کر دیا گیا ۔!

شاہزادہ خسرو کو فوری اور خفیہ طور سے برہان پور ہی میں دفن کر دیا گیا

تھا لیکن ملکہ اس کے برخلاف سوچ رہی تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے
ہاتھوں لڑ جھگڑ کر ہلاک ہو جائیں یا ایسے تباہ ہوں کہ دوبارہ ان کو سر اٹھا
کی ہمت نہ پڑ سکے۔ اس نے شہنشاہ کو شاہجہاں کی درخواست یا شرط
کے لئے مجبور کر دیا کہ وہ اس نازک مرحلہ میں یہ شرط ضرور مان لے ورنہ
کی ذمہ داری خود اُس پر ہوگی۔

اس کے بعد جہانگیر اپنے دونوں لڑکوں کی صورتیں نہ دیکھ سکا۔

سوتے وقت قتل :۔ اگست ۱۶۲۰ء میں شاہجہاں نے جہانگیر
بیماری کی خبر سنی، اُس وقت وہ برہان پور میں تھا، اس کے دماغ میں صرف
خیال آیا کہ "اگر اسکا باپ مر گیا، تو خسرو کے حق میں ایک نئی تحریک ضرور
شروع ہو جائے گی اور خسرو کی ہر دلعزیزی کو دیکھتے ہوئے وہ کسی حالت میں
تخت کو حاصل نہ کر پائے گا اور ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گا"!

اپنے آپ کو اس زبردست اور خوفناک جرم سے بے تعلق ظاہر کرنے
شاہجہاں اُس دن برہان پور سے شکار کھیلنے کے بہانہ روانہ ہو گیا اور
کو اس کے خاص احکامات کے بموجب اس کے معتمد خاص رضا بہادر بدقسمت
کے محل میں زبردستی داخل ہو گیا اور سوتے میں اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ کچھ
تک یہ حقیقت بالکل چھپا دی گئی، اس کے بعد شہنشاہ کو اس بات کی اطلاع
دیدی گئی کہ خسرو قولنج کی بیماری میں مر گئے۔!

عوام ایک زبان ہو کر چلا اُٹھے کہ "خسرو کی بے وقت موت کی سا
ذمہ داری شاہجہاں پر ہے" جہانگیر نے خود اپنی یادداشت میں اس جھوٹی

راہ اور منزل

از۔ عبیدہ عباد فراہی

قدم رک گئے ———

منزل کی آواز تھم گئی

راستے بھٹک گئے ———

چراغوں پر اداسی چھا گئی

گوش بر آواز ہوں   کوئل کی میٹھی صدا کیلئے

چشم براہ ہوں   جگنو کی روشن ادا کیلئے

تصور بناک تاریک ہے

اندھیاری کی ڈور باریک ہے

پیمانۂ ظلمات چھلکا ہے ———

روشنی کی شراب لئے

زندگی کا شباب لئے

تھا کئی مہینہ کے بعد مئی ۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے احکامات پر اس کی لاش آگرہ روانہ کی گئی اور پھر الہ آباد، جہاں وہ خلد آباد کے باغات میں اپنی ماں کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ (ترجمہ از ہندوستان ٹائمز دہلی)

زمزمۂ کوثر

عبید اللہ فراہی[۱]

اقبال کی پیغامبرانہ شاعری نے ہمیں عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کی تعلیم دی تھی اس نے مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو جھنجھوڑا تھا اور انھیں ان کے تابناک ماضی کی یاد دلائی تھی۔ اقبال کی یہ آواز آج بھی گنگ و جمن کی وادیوں میں گونج رہی ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک نے بھی اقبال کے پیام کو سنا۔ اُن کے آفاقی خطاب، اور شش جہاتی نغمے نے مسلمانوں ہی کو نہیں دوسری قوموں اور ملتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اقبال کی مفکرانہ اسلامی شاعری اردو ادب پر بھی اثر انداز ہوئی ہے، اُن کے بعد تعمیری رجحانات اردو شاعری میں تیزی سے داخل ہوئے اور پیامی شعراء کا ایک گروہ تھا کہ امڈ پڑا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے طرزِ فکر کو سمجھتے ہوئے اسلام کی بنیادی حقیقتوں کی تعبیر نئے رنگ اور مخصوص ڈھنگ میں پیش کرنا کہ نہ صرف وہ انسان کے ذہن و دماغ ہی کو اپیل کرے بلکہ دلی کیفیات پر بھی اثر ڈالے ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لئے بالغ نظری، قوت مشاہدہ کی تیزی اور گہرے علم

۱۔ احمد رشید الحق کوثر فاروقی (بسواں)

تلاشِ زندگی

کیفی بلگرامی

چلتا ہوں راہِ شوق میں یوں زندگی کے ساتھ
جیسے اک اجنبی ہو کسی اجنبی کے ساتھ

اِن حادثاتِ غم کو بہت مغتنم سمجھ
یہ مرحلے رہے نہ رہے زندگی کے ساتھ

وحشت میں احترامِ وفا ہم سے پوچھیے
راہِ جنوں سے گذرے ہیں سنجیدگی کے ساتھ

یوں مسکرا کہ چینِ جبیں میں نہ آئے فرق
میری طرف کو دیکھ مگر برہمی کے ساتھ

عقل و جنوں کا فرق خیالوں کا فرق ہے
کچھ زندگی سے دور ہیں کچھ زندگی کے ساتھ

اک اک قدم پہ رکھی ہے یوں زندگی کی لاج
غم کا بھی احترام کیا ہے خوشی کے ساتھ

کیفیؔ غمِ حیات کی دولت لئے ہوئے
آمادۂ سفر ہے کسی اجنبی کے ساتھ

نظموں میں پیش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نظموں میں اس کا عکس زیادہ صاف جھلکتا ہے، اُس کی زندگی کے نقوش انہی میں ابھرتے ہیں۔

کوثر شاعری میں مقصدیت کے قائل ہیں وہ اپنے سامنے ایک گون اور منزل رکھتے ہیں لیکن حقیقی راہ سے ناآشنا ہیں، اس لئے کہ

رہنما ہی رہنما راستے ہی راستے   تھک گئے ہیں حوصلے رک گیا ہے کارواں

وہ دیکھتے ہیں کہ طبقاتی کشمکش نے امت کو صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہے رہبروں کی بہتات ہے جو خطِ مستقیم کے بجائے خطوطِ منحنی پر ملت کو لے جا رہے ہیں مسلسل تگ و دو کے باوجود امت کو کامیابی تو کیا قریب کامرانی کا بھی کوئی نشان نظر نہیں آتا، ان کے حوصلے پژمردہ ہو گئے ہیں امنگیں سرد ہو گئی ہیں، اب ان میں مزید چلنے کی سکت نہیں۔ کوثر ایک دردمند اور حساس انسان کی طرح اسے سمجھتے ہیں مگر صرف شکوہ کر کے رہ جاتے ہیں۔

یہ رہروں کا تذبذب یہ رہبروں کا ہراس   گلہ کروں تو ٹھہرتا ہوں مصلحت نشناس

یا پھر پُرجوش خطیبوں کی طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ

حقیقتوں کے چراغاں لہو سے جلتے ہیں   ندیم کھیل نہیں ہے جہانِ نو کی اساس

مگر کوثر کی اس شکایت میں بھی ایک پُردرد انسان کا خلوص کروٹیں لے رہا ہے

موجودہ ماحول میں انتشار اور بےچینی ہے، دنیا فراغت اور سکون کی بھی جویا ہے لیکن نسلی، قومی اور سامراجی امتیازات بھی برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ایک طرف صلح و آشتی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں تو دوسری طرف طاقت کا زعم اور حریفانہ اقتدار کی بدمستی بھی ہے۔ وقت کے اس انقلاب نے انسان

کی ضرورت ہے۔

اقبال کے ہم نواؤں نے اقبال کو سمجھنے سے زیادہ اُن کے اشعار کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں اقبال کا ہم مسلک تو کہا جا سکتا ہے لیکن نقال نہیں، رشید کوثر بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک جگہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اپنی شاعری کے متعلق صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ

"میں اقبال کا پیرو نہیں اسلام کا پیرو ہوں ......اس کے علاوہ اقبال کے کارنامے اور میری خدمت میں ایک فرق اور ہے کہ اقبال نے اسلام کے بنیادی نکات وحقائق کو اپنے مخصوص علائم کے پردے میں قرآن کے اصول تصریف آیات کے ماتحت بار بار بیان کیا ہے لیکن ان نکات وحقائق کی معرفت سے انسانی تجربات اور مطالعۂ انفس وآفاق کے جو متنوع پہلو پیدا ہوتے ہیں اُن سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ میں نے اپنی شاعری بالخصوص غزلیات میں انھیں تجربات اور پہلوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس وقت کوثر کی غزلوں کا مجموعہ پیش نظر ہے، غزل کے آئینہ میں کسی شاعر کے فکر وفن کا عکس تو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ماحول کے نشیب وفراز اور عصری میلانات کا شاعر کے دل ودماغ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اور اس تاثر کی کشمکش کس طرح ظاہر ہوتی ہے؟ ان حالات میں وہ زندگی کی حقیقت کو کس طرح سمجھتا ہے؟ اور سمجھانا چاہتا ہے؟ یہ ایک مرد باخیال کی حیثیت سے شاعر

زمانہ کے اس انتشار سے کوثر، باوجود ایک منضبط اصول کے پیروکار ہونے کے خود کو نہ بچا سکے، ایک طرف انھیں یہ گلہ ہے کہ راستہ بھی سیدھا ہے اور چلنے والے بھی بہت ہیں لیکن منتشر ہیں، اس لئے کہ میر کارواں نہیں ہے، کہتے ہیں۔

گومگو کا عالم ہے، رہزنوں کو کیا کہئے، رہبروں کو کیا کہیے
راہ بھی ہے منزل بھی، رہروں کا جمگھٹ بھی، کارواں نہیں کوئی

دوسری طرف وہ کسی خودساختہ رہنما کو ہدایت کر رہے ہیں گویا کارواں بھی ہے اور میر کارواں بھی۔

یہ دبی دبی تمنا یہ جھجک جھکے ارادے　　کہو میر کارواں سے کہ قدم کی لے بڑھادے

پھر آگے چل کر خود ہی رہبر بن جاتے ہیں۔

اک شانِ رہبری ہے مری نارسی میں بھی　　منزل کی سمت ہاتھ ہیں واماندگی میں بھی

کوثر کی ابتدائی زندگی بڑی پیچیدہ اور ناہموار گزری ہے، وہ یکے بعد دیگرے مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں کیونکہ حالات اس وقت بڑی تیزی سے بدل رہے تھے نئی پارٹیاں اور تحریکیں سیاسی ہتھکنڈوں سے عوام کو اپنی طرف سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھیں، ان حالات میں کسی ناپختہ ذہن کا بھٹک جانا کچھ اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اس وقت کمیونزم ایک عالم گیر تحریک کی حیثیت سے شباب پر تھی جس نے بنی نوعِ انسان کو زندگی کی حقیقی خوشی سے ہمکنار کرنے کی قسم کھائی تھی، کوثر نے آگے بڑھ کر ساتھ دیا لیکن حقیقت اور خلوص کی روشنی کا متلاشی دل جس نے اسے سویرا سمجھ کر قبول کیا تھا۔

کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود بھی اپنے کو ذہنی طور پر جکڑا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ یہ تبدیلی عوام کی زندگی ہی تک محدود نہیں بلکہ آرٹ یعنی شعر و ادب پر بھی اس کا اثر پڑنا ضرور تھا، کیونکہ ادب "روح عصر" سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے، چنانچہ آج کا ادب بھی ہیجانی دور سے گزر رہا ہے شعراء اور ادباء مختلف سمتوں میں بھٹک رہے ہیں، اُن کی شاعری کا کوئی متعین رُخ نہیں، وہی ہنسیا اور پھاوڑے کبھی مزدوروں کے ہاتھ سے فصلیں کاٹتے اور کھیت جوتتے ہیں اور کبھی زر پرستی کی سر بفلک عمارتوں کو منہدم کرنے کیلئے اُٹھتے ہیں اور کسی وقت شانتی اور امن کا پیغام دینے کے لئے بلند ہو جاتے ہیں۔ جاگیردارانہ ملوکیت کے خلاف۔ شاعر اور ادیب کی یہ آواز ایک چیخ اور بے معنی احتجاج سے زیادہ اہمیت نہ پا سکی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نظام ہائے حکومت کے ڈھانچے بدلے تو ضرور مگر اُسی شہنشاہیت اور ڈکٹیٹر شپ کے ظلم و عدوان کا سر عنوان اب جمہوریت اور اشتراکیت بن چکے تھے، یہ نیا رنگ دروغی شاعر کو بہت بھایا اور ان کا بیمار دماغ تعمق کر اس کے پس پردہ اُس بھیانک حقیقت کی تھاہ نہ پا سکا جس نے بنی نوع انسان کو زندگی کی معصوم مسرتوں سے محروم کر دیا ہے۔ مگر حال کا مفکر شاعر اقبال اسے سمجھتا تھا۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور اشتراکیت کے علم بردار اور پیش رو مارکس کو علامہ یہ چیلنج دے گئے۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش

کرنے سے بھی آگے بڑھ کر اس سے مسرور و شاد کام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

حسنِ حیات حسنِ تنوّع کے دم سے ہے
مجھ کو تو لطف غم میں بھی آیا خوشی میں بھی

کوثر سے پہلے کیٹس، والٹر پیٹر اور کروچے وغیرہ بھی اسی کے دعویدار رہ چکے ہیں۔ وہ "زندگی کی بدنما اور کریہہ المنظر چیزوں کے حسین بنا دینے کو "حُسن کاری" سمجھتے تھے۔ اُن کے فلسفۂ جمالیات میں بری چیز یہ حسین مانی جاتی تھیں، بدی کو نیکی، جھوٹ کو سچ، بدصورتی کو حسن اور غم کو راحت سمجھنا اور بنانا بقول مجنوں گورکھپوری، بیماری کی علامت ہے جو انسان کو مجہولیت اور تعیش کا شکار بنا دیتی ہے۔ پھر اتنے بڑے دعوے کی عمارت خود ہی منہدم ہو جاتی ہے جب کوثر نفسیاتی طور پر کسی واقعہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

فرقت کے ستائے دونوں ہیں میں بھی بچارہ پپیہا بھی
قسمت ہے مگر اپنی اپنی میں روتا ہوں وہ گاتا ہے

یہ زرق فروشوں کی دنیا، یہ دوست نما دشمن توبہ
طاؤس کی کلغی کے پیچھے ناگن کا پھن لہراتا ہے

اس گردشِ دوراں کے ہاتھوں میں جی کو مسوسے بیٹھا ہوں
فریاد! کہ کھلنے سے پہلے اک غنچہ ٹھٹھرا جاتا ہے

پوری غزل ایک مغموم انسان کے دل کی بھڑاس ہے، کوئی ایسا ہی موقعہ ہے جہاں کوثر خود کو سنبھال نہ سکے اور دامنِ ضبط چھوٹ پڑا۔

حُسن و عشق کا بیان کوثر کے یہاں بہت کم ہے اور جہاں کہیں ملتا ہے

زیب سحر محسوس کرنے لگا۔ پھر انھیں کے الفاظ میں "توفیقِ ربانی سلب سے ایجاب کی طرف اور ظلمت سے نور کی طرف لائی"، اس مراجعت کا اعتراف کوثر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

جانے کیسی کیسی ٹھوکریں کھا کھا کے پلٹا ہوں
دکھائی ہے اندھیروں نے ہی اکثر روشنی مجھ کو

کوثر کا دل غم آشنا معلوم ہوتا ہے، تلخیِ ایام کا مزہ انھیں بھی چکھنا پڑا ہے زندگی کے مختلف گوشوں میں نامساعد حالات سے اُن کا سابقہ پڑتا رہتا ہے، تاہم، اُن کے اشعار میں یاسیت کی جھلک نظر نہیں آتی، کیونکہ وہ زہرِ غم کو مسکرا کے پینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور کانٹوں میں گلِ تر کی طرح ضیا فروشی کے قائل ہیں، یہ اشعار کتنے سنبھلے ہوئے ہیں۔

مذاقِ غم کی بلندی کا حسن کیا کہیئے ضیا فروش ہے غنچہ کا دیدۂ نمناک

نامرادی سے عزائم نکھرے رات کی مانگ ستاروں سے بھری
چشمِ تر میں امید کی تنویر جیسے پانی میں گھل رہی ہو کرن

جامِ زندگی کی یہ تلخی اور ترشی اُن کے کلام کو بڑی حد تک غیر متوازن ہونے سے بچا لیتی ہے اور زندگی کرنے کے ہنر سے بہرہ مند کرتی ہے، جرمی ٹیلر کی یہ بات سچائی پر مبنی ہے کہ حادثات اور افسوسناک حالات سے نیکیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اس سے ہماری طبیعت میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے اور ارادوں میں اعتدال ظاہر ہوتا ہے۔ کوثر ہجومِ یاس وغم کا خندہ جبینی کے ساتھ مقابلہ

ہے جہاں ان پردوں کی اوٹ سے تجلّیٔ حقیقی جلوہ نما ہوتی ہے جو ایک اسیرِ عشق کو وہ تابِ نظر اور قلب گداز دیتی ہے کہ وہ حسنِ جلوہ دیکھ کر عشق جلوہ نما میں سرشار ہو جاتا ہے اور حریمِ ناز میں اُس کی جبینِ نیاز خم ہو جاتی ہے۔

اللہ اللہ عالمِ تسلیمِ عشق زندگی سجدے میں ڈھل کر رہ گئی

اس سرشاری کی تمثیل دی ہے کوثر نے۔

تری گلی میں صفِ عاشقانِ سجدہ گزار کبوترانِ حرم کی قطار کا عالم

پھر معراجِ عاشقی یوں حاصل ہوتی ہے کہ دلِ معشوق کی زبان بن جاتا ہے، اُدھر محبوب کا حکم صادر ہوا اور یہاں عشق کی عالمِ اقرار میں پیشانی جھک گئی پھر فکر و تامل کی گنجائش کہاں!

دماغِ جستجو کسے مجالِ آرزو کسے
اشارہ کر رہے ہیں وہ قدم بڑھا رہا ہوں میں

کوثر کے یہاں ایسے ہی کچھ اشعار بکثرت ملتے ہیں لیکن عہدِ حاضر کے تقاضے ان سے کچھ اور ہی مطالبہ کرتے ہیں اس لئے وہ اس وادی میں زیادہ دور تک بھٹکنا نہیں چاہتے، اپنی قوم کا جمود اُن سے اسی کی مانگ کر رہا ہے کہ

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے

وہ سرگشتۂ خواب نہیں، ہوشمند و ہوشیار رہنا اور دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ جب غفلت کی نیند کی یلغار ہوتی ہے تو جراٴتِ قلبِ سلیم پکار اُٹھتی ہے۔

سوئی جاتی ہیں مرے فکر و عمل کی قوتیں
اپنا ساحل پھیر لو دیدۂ مرا طوفاں مجھے

روایتی محبت سے ہٹ کر ہے۔ زندگی کی رعنائی عورت کے بغیر نامکمل اور تشنہ ہے، حیات انسانی کے اس رومانی پہلو سے کوثر دامن کشاں گزرنا نہیں چاہتے مگر تہذیب ذوق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ شاعران دور نو کیطرح صنف نازک کے جسم کے ایک ایک عضو کی تعریف میں تخیل کی بلند پروازی کھا کے لئے نہ تو ان کے پاس دماغ ہے نہ ہی دلچسپی، بلکہ اسے وہ عورت کی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں نصف بہتر کا تذکرہ اپنی رفیقۂ زندگی سے ہے۔ غزل کی قدیم روایت اور مفہوم سے انحراف کے الزام سے بچنے کیلئے کوثر نے اسے جگہ بہ جگہ برتا ہے۔

سحر کو جیسے غنچہ کھل رہا ہو ترا انگڑائی لینا مسکرا کے

انگور کی شراب میں وہ مستیاں کہاں کوثر حریم حسن میں اک بار جا کے پی

دیکھے تو کوئی آپ کو سنجیدہ بنے ہیں کیا شوخئ پنہاں نے نئی بھیس نکالا

ہائے وہ نظریں جو پشت پا سے اٹھ سکتی نہ تھیں
اُف وہ گھبرانا وہ شرمانے سے کچھ پہلے کی بات

باشعور اور اہل نظر مجاز سے حقیقت کی رہنمائی حاصل کر لیتے ہیں کائنات کی حسن وہ دلفریبی خالق کائنات کی معرفت کا ذریعہ بن سکتی ہے اگر دیدۂ بینا گلشن عالم کے حسن سے لطف انجمن کا خط اٹھانے والے کے لئے یہ حسن تعلیم

راستہ میں رک کر دم لینے کو تنگیٔ ہمت و مردانگی سے بھی کچھ آگے سمجھنا کوثر جیسے باحوصلہ لوگوں کا شیوہ ہے۔

معرکۂ حیات میں بہرحال ہر دو ... غیرتِ دل کی موت ہے فرصتِ اندمال بھی

اور کارزارِ حیات میں پہلا قدم رکھتے ہوئے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قدم جو آگے بڑھا ہے پیچھے ہٹنے اور ڈگمگا جانے کے لئے نہیں ہے ورنہ مقصودِ زیست کی یافت ناممکن ہے۔

سارے سفر کی جان ہے پہلے قدم کی پختگی
صید کو زیر کر سکا ناوکِ بے کماں کہاں

مرحلۂ شوق میں حالات کی ناسازگاری کا شکوہ اور عقلِ کوتاہ آستیں کی پناہ لینا اپنے عزم و حوصلہ کی موت کا اعلان ہے، کوثر کا یہ طنز کتنا سچا اور نوکیلا ہے۔

کسی مرغِ زاغ کو عذر تھا نہیں سازگار نہیں فضا
تو نسیم کہتی گزر گئی کہ سکت بھی ہے پر و بال میں

اقبال کی ہم مقصدی کے باوجود کوثر اُن کے انداز سے متاثر نہیں اُن کی شعرگوئی کے انداز کو پرانا بھی نہیں کہا جا سکتا اور نہ جدید شعراء کی صف میں انھیں کھڑا کرتے ہوئے اچھا لگتا ہے، وہ خود بھی اپنے کو ایک صاحبِ طرز شاعر سمجھتے ہیں ویسے تو ہر شاعر، جسے قدرت کی طرف سے شعرگوئی کی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، اپنا انفرادی رنگ رکھتا ہے اور بات کہنے کا ڈھنگ خصوصیت کے ساتھ سب کا جدا جدا ہوتا ہے لیکن کوثر کہنے کا نیا طرز ہی نہیں

پھر قوتِ عمل جب طوفان کو دعوتِ مبارزت دیدیتی ہے تو سرکش موجیں استقبال کے لیے آگے بڑھ آتی ہیں۔

سفینہ جس گھڑی طوفاں کا سینہ چیرجاتا ہے
قدم لینے کو موجیں دوڑتی آتی ہیں ساحل سے

اس شعر میں محض دعوتِ عمل نہیں بلکہ دوسرا مصرعہ فکر کو بھی جھنجھوڑ دیتا ہے کوثر کی دعوتِ عمل اپنا ایک مقصود و مطلوب رکھتی ہے مگر حصولِ مطلوب سے زیادہ خیالِ طلب کو رنگین تصور کرتی ہے۔

خلشِ خیال فزوں ترے ہر نفس کا حاصل
وہی آرزو حسیں ہے جو ابھی ہے نامجسم

خیالِ لیلیٰ کی چبھن ہمیشہ تیز روی پر اکساتی ہے لیکن جب آرزوئے لیلیٰ جسمانی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس وجود کی رسیتی سے فکر و ذہن پر قفل لگ جاتے ہیں اور حوصلۂ جنوں سرد پڑ جاتا ہے مقصود تو وہی ہے جو نگاہوں سے اوجھل رہے مگر اس کا دلکش تصور ہمیشہ نظروں کے سامنے ہو اور خیال و عمل کی حدیں ایک دوسرے سے مل جائیں ورنہ

حسنِ عمل نہیں تو حسنِ خیال کیا ہے زندانِ بیکراں میں زنجیر کی صدا ہے

جوشِ عمل اور ذوقِ جنوں تلاشِ منزل کی سرگردانی کو رسائیِ منزل سے زیادہ حسین جانتا ہے اور کوثر ہی جیسا سرشار و سرگرم کہہ سکتا ہے۔

گر نہ ہو فاصلے کی رعنائی صرف منزل میں دلکشی کیا ہے

مسافت کی مشکلات کو رعنائی کہنا اور دوریِ منزل کے باوجود

مرحلے کو بآسانی طے کرنا ہے جو لائق صد تحسین ہے، ایسے موقع پر اقبال کی ہم نوائی کا دعویٰ کرنے والے عموماً مارے جاتے ہیں۔ تعمیر پسند شعراء پر سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ اُن کا دامن تغزل کے خون سے رنگین ہے مگر کوثر کی جدت ادا اور رنگینی خیال نئے راستے تلاش کر لیتی ہے، اس رنگ میں چند اشعار دیکھئے، الفاظ کا خروش اور آہنگ دل کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔

رات کے قریب میں آ گئے ہیں راہرو بادلوں کی اوٹ میں سو رہی ہے کہکشاں

غم دیگراں ہے عنقا، جہت حیات مبہم یہ قفس بنام گلشن یہ لہو بجائے شبنم

امن ساحل کی توقع پر چلی تھیں کشتیاں یہ ہے ٹکرا کر الٹ جانے سے کچھ پہلے کی بات

جیسے ایسے طائروں پر جو قفس کے ہو رہے یا بڑی پرواز کی تو شور و شیون تک گئے

کہیں کہیں کوثر نے بے پروائی سے کام لیا ہے اور غزل کی لطافت مجروح ہو گئی ہے مثلاً۔

راہ دکھا کر دم لیں گے ہم، بتھا سب کو دکھلانے دو
دریا رُخ تو بدلی کے رہے گا موجوں کو بل کھانے دو

اِسے نظم کا شعر کہوں کہ غزل کا؟ یہ غزل کے نازک رخسار پر کسی کھُردرے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ ہے، ایسے ہی یہ شعر۔

رکھتے بلکہ بات بھی نئی کہنے کی صلاحیت کے حامل ہیں۔ یہ اشعار اس صداقت
کی شہادت دیں گے۔

صاحب دل پہ بھی اکثر رازِ دل کھلتا نہیں | اپنی ہی خوشبو سے رم کرتا ہے آہوئے ختن

لاکھوں سلام جرأتِ رندانہ پر مگر | ایسی بھی کیا کہ جو شہا زلیخا کہیں جسے

فضائے نور میں بھی احتیاط اے رہرو | حسین چاند میں کچھ روشنی کے خار بھی ہیں

اس کے علاوہ کوثر کے یہاں نئی نئی تشبیہیں اور استعارے بکثرت ملتے ہیں

رہین منتِ اغیار کو راحت نہیں ملتی | جو گل ہے تیتریوں کی چھاؤں میں محروم شبنم ہے

جیسے فرحت سی ملی گریۂ ہجراں کے بعد | اوس گرتی ہے تو سبزہ بھی نکھر آتا ہے

بساطِ کہکشاں گویا بساطِ شوق و مستی ہے | کوئی دیوانہ گزرا ہے ادھر لغزیدہ لغزیدہ

عالم ترے تصورِ زیرِ نقاب کا | جیسے شعاعِ مہر حجابِ غبار میں

جنت میں جیسے حور کا چہرہ وضو کے بعد | اس ماہ وش کا گریۂ رخصت نہ پوچھئے

کلام کا حسن، بیان کی لطافت، اسلوب کی چستی، الفاظ کی بندش اور تخیل
کی بے مثلی کسی کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر کی طرف اشارہ ہے۔

ایک پیامی شاعر کی حیثیت سے کوثر کا پروپگنڈے سے بچ کر تبلیغ کے لئے
اس طرح کا طرز اختیار کرنا کہ شعریت پر آنچ نہ آنے پائے، ایک دشوار گ

ہے اور ماحول کے اثرات کو ہضم کیا ہے اسی لئے عام حالات میں وہ جذباتی
ناہمواری کے شکار نہیں ہونے پاتے پھر بھی اقبال کی ہر رکابی کے لئے ٹھرے
ہوئے دم خم کی ضرورت ہے، دیکھئے کوثر نے کہاں تک ساتھ دیا ہے۔

پردہ نشیں تیری کا غیرت سا پہ حرف آیا   محسوس کر رہا ہوں آواز میں تبسم

خطابت کا یہ انداز شعری دنیا میں کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

پھر یہ شعر:۔

کرشمہ ہائے خرد مار شانۂ ضحاک   ہنوز الجھی ہوئی ہے حیات کی پیچاک

الفاظ کے پیچ و خم میں پھنس کر شعری نغمگی نے خودکشی کر لی۔ مزید برآں یہ اشعار۔

چاند سے پہلے ہی نظر چاند کے داغوں پر گئی
حسن خیالوں میں نہیں ہے تو نظاروں میں کہاں

چاند سے کہہ دو خبر لے پہلے اپنے داغ کی   روشنی کی آنچ میں تیرگی پاتا ہوں میں

وہ مضحکہ خیز متضاد شعر —— یا للعجب!!

ایسے ہی یہ شعر بھی

برا ہو رشک کا صورت بگاڑ لی اپنی   کلی سے تیرے تبسم کی نقل بھی نہ ہوئی

مبالغہ بھی ایک حقیقت ہے جس کی فطرت قابو سے باہر ہوتی ہے لیکن ایسا مبالغہ!—— خدا کی پناہ!! کیا کوثر نے بھی ایک شعر کافی نہ سمجھا۔

کچھ آب و رنگ تو ہے برگ گل میں بھی لیکن
ترے لبوں کی مچلتی ہوئی حیات کہاں

جو برگ گل اور سلگتے ہوئے ہونٹوں سے بھی زیادہ حسین ہے۔

اس کے باوجود کوثر کی شاعری مستقبل میں اپنے لئے بڑے ہی سنہری امکانات رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے علم و بصیرت کی آنچ میں مشاہدات کو تپایا

تحریریں

ڈاکٹر گیان چند کی تنقیدی۔ ادبی۔ تخلیقات کا وہ مجموعہ کہ جس کا ادبی دنیا میں چرچا ہے عنقریب **ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے** تخلیقات کی ادبی افادیت کا اندازہ درج ذیل عنوانات سے ہو سکے گا۔

۱۔ تحقیق کے تقاضے ۲۔ داستان سے ناول تک

۳۔ اُردو ادب پر ہندی ادب کا اثر

۴۔ اُردو میں تمثیل نگاری

۵۔ واسوخت امانت

۶۔ دکّی میں رومانی مثنوی کی روایت

۷۔ اُردو نثر کے فروغ میں داستانوں کا حصہ

۸۔ اردو شاعری پر دوسری زبانوں کا اثر

۹۔ اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ

۱۰۔ میر کی عشقیہ مثنویاں

۱۱۔ سیر کشمیر ۱۲۔ ریختی اور انشار ۱۳۔ پدماوت اردو نظم میں

اسی طرح اور بھی بہت ..... (زیر طبع)

عادل رشید

۲۷۔ لب بام 5/-

۲۸۔ موسم گل 6/-

صالحہ عابد حسین

۲۹۔ قطرے سے گہر ہونے تک 7/-

۳۰۔ عذرا 5/-

صادق حسین

۳۱۔ اسپین کی شہزادی 4/50

۳۲۔ معرکہ روم و یونان 6/-

جرجی زیدان

۳۳۔ محبوبۂ کربلا 3/50

۳۴۔ حجاج بن یوسف 4/50

غلام احمد فرقت

۳۵۔ صید و ہدف 2/50

۳۶ کف گلفروش 3/-

۳۷۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب 8/-

۳۸۔ طنز و مزاح کامل 10/-

ڈاکٹر اختر اورینوی

۳۹۔ حسرت تعمیر 4/50

منظر سلیم

۴۰۔ پھولوں کا انبار 4/50

ادارہ

۴۱۔ اپنی موج میں 2/-

محمد علی واحدی

۴۲۔ مع دیباچہ شوکت تھانوی

خبطی 1/50

قیصر تمکین

۴۳۔ جگ ہنسائی 2/50

مسیح الحسن رضوی

۴۴۔ چھٹکی بہن 2/75

ڈاکٹر اثر بلگرامی

۴۵۔ جادو کی آنکھ جاسوسی ناول 3/50

۴۶۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی

۴۷۔ ٹھیکرے کی مانگ 2/-

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

احباب اُردو ہندی قاعدہ

پہلی دوسری کتاب

بچّوں کو آسانی سے اُردو سکھانے کے یوں تو متعدد قاعدے لکھے جاچکے ہیں لیکن ان کو آسان اور سہل بنانے کی ضرورت کا احساس کیا جارہا تھا اور ساتھ ہی اس ضرورت کا بھی احساس کیا جارہا تھا کہ اُردو جاننے والے ہندی اور ہندی جاننے والے اُردو سیکھ سکیں۔

چنانچہ پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب جیسے بلند پایہ ادیب اور اہل قلم و ماہر لسانیات نے اس طرف توجہ فرمائی اور دو ایسے جامع قاعدے ترتیب دیئے ہیں جو بیک وقت بچے پڑھ کر اُردو اور ہندی دونوں سیکھ سکتے ہیں جس کو احباب پبلشرز نے نولو آفسٹ سے دو کلر میں عمدہ سفید کاغذ پر چھاپا ہے اور تین کلر کا سہ رنگا ٹائٹل لگا کر بچوں کے لیے اور دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۴۰ صفحات

قیمت: حصّہ اول ۵۰ پیسے حصّہ دوم ۴۰ پیسے

ملنے کے پتے

(۱) احباب پبلشرز۔ اقبال منزل مقبرہ عالیہ۔ گولہ گنج لکھنؤ

(۲) ادارہ فروغ اُردو سول ایجنٹ

نمبر ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ

کچھ نگار کے خدا نمبر کے بارے میں

محمد اسحاق صدیقی

اُردو کے مشہور اور مقتدر جریدوں میں نگار کا جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ یہ رسالہ ۱۹۲۲ء سے حضرت نیاز فتحپوری کی ادارت میں جاری ہے ، جو اُردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں ، درجنوں علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں ، جنھیں اُن کے تبحرِ علمی کی بنا پر علّامہ کہا جاتا ہے اور جنھیں حکومتِ ہند نے اپریل ۱۹۶۲ء میں اُن کی علمی و ادبی خدمات سے متاثر ہو کر سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدم بھوشن" عنایت کیا تھا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور عالم میں جو علمی دیانت داری ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا ہفتہ وار سرفراز (لکھنؤ) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "علامہ کیسے بنتے ہیں[1] " جس میں علامہ نیاز فتحپوری کے ادبی سرقوں کی متعدد مثالیں پیش کی گئی تھیں ۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اُن کا دامنِ شہرت زیادہ داغدار نہ ہونے پائے اور اس کے لیے میں نے حضرت نیاز سے

---

[1] مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۶۳ء ۔

مزاحیہ شرحِ دیوانِ غالبؔ اُردو

ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ کا ایک اور کارنامہ۔

ادارۂ فروغِ اُردو نے غالبؔ کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں جو ۶۵ء میں عظیم الشان پیمانہ پر ہندوستان کے گوشے گوشے میں منائی جانیوالی ہے۔ ایک ایسی چیز اردو ادب میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جسے بجا طور پر ایک ادبی معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غلام احمد فرقتؔ کاکوروی نے ایک نئی چیز دیوانِ غالبؔ کی مزاحیہ شرح کے عنوان سے تقریباً پانچسو صفحات پر پیش کی ہے جس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس پر عالمِ برزخ سے مرزا غالبؔ نے اپنے مخصوص انداز میں مقدمہ لکھ کر بھیجا ہے جسے پڑھ کر آپ بے حد محظوظ ہوں گے۔ اس مقدمہ میں مرزا صاحب نے اپنے چند اشعار کی شرح خود مزاحیہ انداز میں پیش کی ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت اس شرح کی یہ ہے کہ کسی شعر کی شرح آپ کو ایسی نہ ملے گی جس میں شعر کا مفہوم یا مطلب خبط ہو کر رہ گیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ مرزا صاحب کی عظمت کا بھی پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر شعر کے مزاحیہ معنے پڑھ کر آپ کو شارح کی مزاح نگاری کی داد دینا ہوگی۔ چونکہ سر دست ہم اس کی صرف ایکہزار جلدیں چھاپ رہے ہیں اسلئے آپ ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں ورنہ ممکن ہے کہ آپ کو اسکے دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے

کتاب چھپ کر شائع ہو گئی۔ جلد طلب فرمائیے۔ قیمت آٹھ روپے

(۴) پیدائش عالم اور اساطیری روایات کا تقابلی مطالعہ .... دسمبر ۱۹۵۲ء

(۵) فنِ تحریر کی تاریخ (نامکمل) ...... جون سے نومبر ۱۹۵۳ء تک

جولائی سے دسمبر ۱۹۵۴ء تک

مارچ سے اکتوبر ۱۹۵۵ء تک

اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نیاز صاحب میرے مضامین سے بہت متاثر تھے۔ اسی لیے ۱۹۵۵ء میں جب انھوں نے "خدا نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا تو ساری ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن میں اس نمبر کی تیاری کے سلسلے میں نیاز صاحب کی خواہش پر انھیں امیرالدولہ پبلک لائبریری (لکھنؤ) لے گیا اور انھیں وہ تمام کتابیں دکھائیں، جن سے اس سالنامے کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ ان میں سے بیشتر کتابیں کتبِ محفوظہ (RESERVED) تھیں۔ کتابوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر اور ان سے مفید مطلب معلومات اخذ کرنے میں جو غیر معمولی محنت کرنا پڑتی اس کے پیشِ نظر نیاز صاحب کو "خدا نمبر" نکالنے میں تامل ہوا اور بولے: مجھ سے بڑھاپے[1] میں اتنی محنت نہیں ہو سکتی کہ یہاں

---

[1] نیاز صاحب کا سنہ پیدائش ۱۸۸۴ء ہے اور میرا ۱۹۲۹ء گویا وہ مجھ سے عمر میں ۴۵ سال بڑے ہیں۔ میں نے نگار کا "خدا نمبر" ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا اس وقت نیاز صاحب کی عمر ۷۱ سال تھی اور میری ۲۶ سال۔

اُن کے کراچی جانے کے بعد خط و کتابت بھی کی لیکن افسوس کہ اُنھوں نے مجھ ناچیز کی درخواست کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا، اس لیے مجھے مجبوراً اُس حقیقت کو ظاہر کرنا پڑ رہا ہے، جسے میں نے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا۔

حضرت نیاز فتحپوری عرصہ سے ہر سال اپنے رسالہ نگار کا ایک خصوصی شمارہ بطور سالنامہ پیش کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کا سالنامہ "خدا نمبر" تھا، جس میں عہدِ وحشت سے عہدِ حاضر تک مختلف مذاہب میں خدا کے تصور کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ نمبر تمام تر اس خاکسار نے درجنوں کتابوں کے مطالعے کے بعد نیاز صاحب کی فرمائش پر تیار کیا تھا اور نیاز صاحب نے پہلے اس کا تحریری طور پر اعتراف بھی کیا تھا لیکن بعد میں اُنھوں نے مختلف (اور مجھے دُکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "ناپسندیدہ") طریقوں سے اُسے اپنانے اور میری ساری محنتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سب کیسے ہوا، اس کا جاننا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نگار کا سالنامہ ۱۹۵۶ء "خدا نمبر" لکھنے سے پہلے میرے حسبِ ذیل مضامین نگار میں شائع ہو چکے تھے:

(۱) آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا ... جون سے اگست ۱۹۴۷ء تک

(۲) اظہارِ اعداد کے طریقے زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک ... اگست سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک

(۳) مذاہبِ عالم کی تخلیق اور قطبِ شمالی (نامکمل) ... اگست سے نومبر ۱۹۵۲ء تک

بولے: "ضرور منگوائیے۔" اور اُسی وقت سَو روپئے کا چیک لکھ کر دیا۔

میں نے ایک مقامی کتب فروش کے ذریعہ کتابیں منگوالیں اور مطالعے میں غرق ہوگیا۔ اب میرا روز کا یہ معمول تھا کہ دفتر کے بعد سیدھا لائبریری پہنچتا اور جب تک وہ بند نہ ہوجاتی مختلف کتابوں سے نوٹس تیار کرتا۔ مجھے امیرالدولہ پبلک لائبریری کے علاوہ رام کرشنا مشن آشرم (لکھنؤ) کے کتب خانہ سے بھی بڑی مدد ملی، جہاں ہندو مذہب سے متعلق کافی کتابیں تھیں۔ میں ان دونوں کتب خانوں سے گھر بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لایا کرتا تھا۔ گھر آکر کھانے کے بعد رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا اور صبح کو ۶ بجے سے ۹ بجے تک بھی لکھتا پڑھتا اس کے بعد کھانا کھا کر دفتر چل دیتا۔

سالنامے کی تیاری کے سلسلے میں پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مذاہب کی قدامت کے لحاظ سے عنوانات کی ایک فہرست مرتب کی اور پھر ہر مذہب پر سلسلہ وار متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنا اور مضمون لکھنا شروع کیا جب ایک عنوان پر مضمون تیار ہوجاتا تو وہ نیاز صاحب کے حوالے کر دیتا اور وہ اُسے دیکھنے کے بعد کاتب کے حوالے کر دیتے۔ یہ سلسلہ آٹھ نَو مہینے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ "خدا نمبر" مکمل ہوگیا اور جب وہ شائع ہوگیا تو میں بڑی امیدوں کے ساتھ نیاز صاحب کے پاس پہنچا اور معاوضہ طلب کیا۔

میرا خیال تھا کہ اس شبانہ روز کی محنت کے لیے نیاز صاحب

آگرہ یہ سب کتابیں پڑھوں اور اتنے باریک ٹائپ کی۔ اگر آپ اس کام کا پورا ذمہ لیں تو میں "خدا نمبر" نکالوں گا ورنہ کوئی دوسرا نمبر نکالنے کے متعلق سوچوں گا۔" میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن میری دو شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ "خدا نمبر" رسالے کی صورت میں نیوز پرنٹ پر شائع نہ ہو بلکہ کتابی صورت میں اچھے سفید کاغذ پر شائع ہو اور دوسرے یہ کہ پوری کتاب میرے نام سے چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پیش لفظ میں یہ لکھیں کہ "اگر اسحاق صدیقی میری مدد نہ کرتے تو شاید یہ رسالہ منظرِ عام پر نہ آتا۔ ظاہر ہے کہ آپ مشہور ادیب ہیں۔ آپ کی شہرت کے آگے میرا نام ماند پڑ جائے گا۔" نیاز صاحب اس پر راضی ہو گئے کہ پورا "خدا نمبر" میں مرتب کروں گا اور رسالے پر مرتب کی حیثیت سے میرا نام دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اس محنت کے لیے معقول معاوضہ بھی دیں گے۔ البتہ انھوں نے "خدا نمبر" کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی کیونکہ اس طرح لاگت زیادہ آتی اور نگار کے خریداروں کو بھیجنے میں ڈاک خرچ بھی زیادہ لگتا۔ بات معقول تھی اس لیے میں نے اس پر اصرار نہ کیا۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے نیاز صاحب سے جا کر کہا، "آپ نے لائبریری میں جو کتابیں دیکھی تھیں، وہ سب پرانی ہیں۔ یہ چند نئی کتابوں کی فہرست ہے۔ ان کا خریدنا نہایت ضروری ہے تاکہ جدید ترین تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔" نیاز صاحب فہرست دیکھ کر خوش ہوئے اور

رہتی تھی رسالے بھیجے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ نیاز صاحب کے کاتب میرے پاس آئے اور بولے "آج شاید نگار کے خدا نمبر کی مانگ اور آئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نگار کی کاپیاں اندرونی سر ورق پھاڑ کر بھیجی جا رہی ہیں (اس کے پہلے صفحہ پر میرا نام تھا اور دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب کا تعارف، جس میں میری بڑی تعریف تھی) معلوم نہیں کہ اس سے قبل جو کاپیاں خریداروں کو بھیجی گئی تھیں اُن کا اندرونی سر ورق پھاڑ دیا گیا تھا یا نہیں؟ لیکن آج تو میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ معاوضے کے سلسلے میں آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اُس کا مجھے افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ نیاز صاحب آپ کا نام مٹانے کے درپے ہیں اور یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں "خدا نمبر" اُن کا لکھا ہوا ہے۔" میں نے ارادہ کیا کہ نیاز صاحب سے جا کر دریافت کروں کہ آخر یہ کیا حرکت ہے؟ لیکن کاتب صاحب نے منع کر دیا۔ اُن کی روزی کا سوال تھا اس لیے میں نے بھی نیاز صاحب کے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن کاتب صاحب کے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے سوچا کہ کسی مقامی کتب فروش کے وہاں جا کر دیکھ آؤں کہ اُن کے وہاں نگار کی جو کاپیاں بکنے کے لیے گئی تھیں شاید ان میں سے کچھ بچ گئی ہوں

ؔ نیاز صاحب کے کاتب شہنشاہ حسین صاحب کو جو انھیں کے گھر میں بیٹھ کر نگار کی کتابت کیا کرتے تھے سارے واقعات معلوم تھے اور انھیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

مجھے کئی سو روپے معاوضہ دیں گے کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی مجھے نگار میں مضامین لکھنے کے لیے کئی سال سے خصوصی معاوضہ دیا کرتے تھے یعنی فی صفحہ ایک روپیہ (لیکن بقول نیاز یہ معاوضہ نہ تھا بلکہ جن نامساعد حالات میں میں کام کر رہا تھا، اُسے جاری رکھنے کے لیے میری مدد تھی) لیکن نیاز صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا: "معاوضہ کیسا؟ جو کچھ مجھے دینا تھا دے چکا۔" میں اپنے اُس وقت کے جذبات کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک ادیب اور عالم نہیں ہے بلکہ صرف ایک سرمایہ دار ہے جو مزدور کو اُس کی مزدوری بھی نہیں دینا چاہتا۔ اُنھوں نے دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ "معاوضہ تو آپ کو تب دیتا، جب "خدا نمبر" آپ کے نام سے شائع نہ ہوتا۔ اس سے آپ کی کتنی شہرت ہوگی یہ تو سوچیے۔" میرے اور ان کے درمیان اور کیا گفتگو ہوئی۔ اس کا ذکر نہایت تکلیف دہ ہے۔ اخیر میں انھوں نے کہا کہ "فی الحال میں باہر جا رہا ہوں اور وہاں سے واپسی پر کچھ اور دوں گا۔" اس کے کئی مہینے بعد جب میں اُن سے ملنے گیا تو انھوں نے ۵۰ روپے عنایت کیے۔ لیکن یہ رقم پاکر میں اور بھی دل برداشتہ ہوگیا اور یہ طے کر لیا کہ آئندہ نگار میں کوئی مضمون نہ لکھوں گا۔ حالانکہ میرے بعض مضامین نامکمل تھے۔

نیاز صاحب نے نگار کے "خدا نمبر" کی کچھ فالتو کاپیاں بھی اس خیال سے چھپوا لی تھیں کہ نگار کے مستقل خریداروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خصوصی پرچے کو خریدنا چاہیں گے اور جیسے جیسے مانگ آتی

ہو گی بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ بات چیت کے دَوران مزید بے لطفی پیدا ہو جائے۔

کچھ دنوں کے بعد نیاؔز صاحب سے نظیر آباد میں ایک کتاب کی دوکان "بُک لورز کارنر" پر ملاقات ہو گئی (جہاں سے وہ انگریزی ناولیں کرائے پر لے کر پڑھا کرتے تھے اور میں پُرانی کتابیں اور رسائل خریدنے کے شوق میں جایا کرتا تھا) میں نے سلام کرنا اپنا فرض سمجھا پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دوکان پر دوچار بار پھر اُن سے اسی طرح ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی۔ ایک دن اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بہت دنوں سے آپ آئے نہیں"؟ میں نے اُن سے اس وقت بھی اصل سبب بتانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ میں اُن کے یہاں حسب سابق آنے جانے لگا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد نیاؔز صاحب جب "پدم بھوشن" ہو کر ۱۹۶۲ء میں پاکستان تشریف لے گئے تو میں اُن سے خط و کتابت کرنے لگا۔ نیاؔز صاحب کے شفقت بھرے خطوط اور نگاؔر کے خاص نمبر میرے پاس آتے رہے۔ اسی دوران نگاؔر میں کئی اشتہار نظر سے گزرے، جن سے پتہ چلا کہ "خدا نمبر" پھر شائع ہونے والا ہے لیکن ان اشتہاروں میں کہیں میرا نام نہ تھا۔ اس لیے مجھے شُبہ ہوا کہ اِس مرتبہ کہیں نیاؔز صاحب یہ نمبر اپنے ہی نام سے نہ شائع کر دیں۔ میرا یہ شُبہ یقین سے بدل گیا جب نگاؔر کا سالنامہ ۱۹۶۳ء "نیاؔز نمبر" حصہ دوم مجھے ملا۔ اس میں فرماؔن فتحپوری صاحب کا ایک مضمون ہے: "نگاؔر اور نگاؔر کے خاص نمبر"

اور اُن کا اندرونی سرورق پھٹا ہوا ہے یا نہیں - چنانچہ میں ایک مقامی پبلشر اور بک سیلر "کتابی دُنیا" (نظیر آباد، لکھنؤ) گیا - نگار کی کچھ کاپیاں موجود تھیں - اُنھیں دیکھا، اندرونی سرورق غائب تھا - میں نے دریافت کیا : "یہ رسالے آپ نے کہاں سے منگوائے ؟" بولے : "کیوں ؟ ظاہر ہے کہ نگار کے دفتر سے" جب میں نے وجہ بتائی تو اُنھیں نیاز صاحب کی حرکت پر سخت تعجب ہوا - میں نے ایک سالنامہ خرید لیا اور رسید پر لکھوالیا " پہلا ورق پھٹا ہوا " تاکہ ثبوت رہے[۱] - اس کے بعد میں گھر چلا آیا لیکن نگار کی ان کاپیوں کو دیکھ کر مجھے جو ذہنی اذیت پہنچی ہوگی اور میرے قلب کی جو حالت ہوگی، اُس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں - بہر حال میں نے اپنے چند احباب سے اس کا ذکر کیا اور اُنھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اخبار میں سارے واقعات لکھو لیکن باوجود اس امر کے کہ میرے ساتھ انتہائی زیادتی کی گئی تھی، میری مروّت نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور سوچا کہ ایک مشہور ادیب اور عالم کی شہرت کو داغدار کرنے سے کیا فائدہ، جو چیز میری ہے، وہ میری ہی رہے گی - دوسری صورت یہ تھی کہ میں نیاز صاحب سے جا کر ملتا اور اس بارے میں اُن سے گفتگو کرتا لیکن میں اُن کی نیت سمجھ چکا تھا - اس لیے میں نے اُن کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ گفتگو محض لاحاصل

---

[۱] جن صاحبان کے پاس ایسے رسالے موجود ہوں اگر وہ مجھے مطلع فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

محبت نفرت سے بدل جائے اور وہی زبان اور قلم جو نیاز کی تعریف سے کبھی نہ تھکتا تھا اُن کے خلاف حرکت میں آئے۔ ظاہر ہے کہ علامہ نیاز کی شہرت کو داغدار کر کے مجھے خوشی نہ ہوگی لیکن یہاں سوال اندھی شخصیت پرستی کا نہیں ہے بلکہ یہ خیر و شر کی قدیم جنگ ہے اور مجھے امید ہے کہ آخر میں جیت سچ کی ہوگی۔"

۱۲ اگست ۱۹۶۳ء کو نیاز صاحب نے مجھے ایک خط لکھا:

"عزیزم، فرمان کے نام رجسٹری ملی - آپ کا اضطراب دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ خدا نمبر میں آپ کے نام کا اظہار کر دیا جائے گا اور آیندہ ستمبر کے اشتہار میں بھی۔ فرمان صاحب کا سہو تھا کہ اُنھوں نے مجھ سے پوچھے بغیر اشتہار[1] شائع کر دیا۔ میں خود اب کسی کام کو نہیں دیکھتا۔ بالکل فرصت نہیں ہے۔ خدا نمبر آپ کو ضرور بھیجا جائے گا۔ نیاز"

یہ خط مجھے ۱۷ اگست ۱۹۶۳ء کو ملا۔ اس سے دو روز قبل مجھے فرمان صاحب کا ایک تار ملا تھا:

---

[1] اشتہار اس بات کا شائع ہوا تھا کہ نگار کا "خدا نمبر" دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔ فرمان صاحب کی جس بات پر مجھے اعتراض تھا، وہ مضمون مذکورہ بالا سے متعلق تھی۔

اس سلسلے میں وہ صفحہ ۱۳۴ پر فرماتے ہیں :

"جنوری۔فروری ۱۹۵۶ء۔ "خدا نمبر" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ پورا نمبر نیاز کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری نے دنیا کے مختلف مذاہب کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مختلف عہدوں اور مختلف قوموں میں خدا کا تصور کیا تھا اور کیا ہے۔ اس نمبر سے جہاں مدیر نگار کی وسعت مطالعہ اور مذاہب عالم سے، ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں مذاہب پر ایسا وافر مواد ہاتھ آجاتا ہے" (جملہ نامکمل ہے۔ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے" جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا")

مجھے اس تحریر سے جو تکلیف ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے فرمان صاحب اور نیاز صاحب کو کئی خط لکھے کہ ایک تردیدی بیان نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کیجئے کہ نگار کا "خدا نمبر" اسحاق صدیقی کا لکھا ہوا تھا نہ کہ نیاز فتحپوری کا اور جب "خدا نمبر" دوبارہ شائع ہو تو اس کا خیال رکھیے کہ اس میں مؤلف کی حیثیت سے میرا نام ہو اور" اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجھے مجبوراً اخبارات کے ذریعہ صداقت کو بے نقاب کرنا پڑے گا جو علامہ نیاز کے لیے کشف ساق کا باعث ہوگا۔ میں اپنی چیز کو اپنا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا اور میرے پاس اس کے لیے کافی ثبوت موجود ہے۔ میرے دل میں علامہ نیاز کے لیے بے پناہ عقیدت ہے لیکن آپ لوگ مجھے اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میری عقیدت اور

خدا کا تصوّر

اور

اُس کا ارتقاء

(عہدِ وحشت سے عہدِ حاضر تک)

مرتبہ: محمد اسحاق صدیقی

ناشر: نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت تین روپیہ

اسی سرورق کے دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب نے "تعارف" ما تھا جو یہ ہے:

تعارف

"مذہب بڑے دلچسپ و وسیع مطالعہ کی چیز ہے، علم الانسان، جغرافیہ، تاریخ، نفسیات اور ہیئت و علم النجوم سبھی علوم اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔"

1915 APM 156 KARACHI 12 12/13

ISHAQUE SIDDIQUI 26 GWYNNE TALAB

LUCKNOW.

DONT WORRY SEE NEXT ISSUE =

FARMAN.

ترجمہ:

۱۹۱۵ اے پی ایم ۱۵۶ کراچی ۱۲ ۱۲/۱۳

اسحاق صدیقی ۲۶ گوئن تالاب لکھنؤ

پریشان نہ ہوں۔ آیندہ شمارہ دیکھئے۔

فرمان

غالباً تار دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کہیں میں اخبارات میں سارا واقعہ نہ لکھ دوں۔ بہرحال، فرمان صاحب نے ستمبر ۱۹۶۳ء یا اس کے بعد نگار کے کسی پرچے میں کوئی بیان اپنی غلط فہمی کے بارے میں شائع نہیں کیا۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں "خدا نمبر" کا جدید ایڈیشن مل گیا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نیاز صاحب نے میری اصل تالیف میں تو کوئی تبدیلی نہیں کی ہے لیکن شروع کے چند صفحات میں بعض اہم تبدیلیاں مصلحتاً کی ہیں۔ مثلاً:

سالنامہ ۱۹۵۶ء کے اندرونی سرورق کے پہلے صفحہ کی عبارت حسب ذیل تھی:

عہدِ قدیم سے عہدِ حاضر تک انسان نے کس کس طرح خدا کا تصور کیا، اس راہ میں اُس نے کتنی ٹھوکریں کھائیں اور پھر کس طرح آہستہ آہستہ وہ کائنات پر چھا گیا، یہ داستان بہت منتشر و طویل ہے، لیکن بے انتہا دلچسپ اور انھیں منتشر اجزا کو ہمارے عزیز دوست محمد اسحاق صاحب صدیقی نے یکجا کر کے اس مجلد میں شائع کیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر کسی ایشیائی زبان میں اتنی جامع و موجز کتاب اس سے قبل شائع ہوئی ہو اور اس کے قابل مؤلف یقیناً قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے غیر معمولی محنت و جستجو سے کام لے کر بہت تھوڑے زمانہ میں ایسی قیمتی چیز پیش کر کے زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

نیاز

۱۹۶۴ء کے کراچی ایڈیشن میں نیاز صاحب نے یہ جدت کی کہ اندرونی سرورق کے پہلے صفحہ سے میرا نام یک قلم اُڑا دیا اور تعارف کے آخری دو پیراگراف کے جلی الفاظ جن میں میرا ذکر ہے۔ نکال دیئے یعنی اب سرورق کے پہلے صفحہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

مذہب فطری چیز ہو یا غیر فطری، لیکن اخلاقیات مذہبی یقیناً فطری چیز ہے کیونکہ متمدن انسان کی تمدنی تنظیم و ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

مذہب کی اساس خدا کے تصور پر قائم ہے اور گو وہ اک منطقی نتیجہ ہے انسان کے جہل و مجبوری کا، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس تاریکی و بے اختیاری نے انسان میں خود آگہی پیدا کی اور خدا کی جستجو میں انسان خدا تک پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن اُس نے اپنے آپ کو ضرور دریافت کرلیا۔

انسان کا جمادات، نباتات و حیوانات سے گزر کر قوت مجردہ تک پہونچ جانا اور فطرت کے سربستہ رازوں کو واشگاف کر دینا عقل انسانی کا بڑا کارنامہ ہے، لیکن انسان کو اس منزل تک صرف خدا کی جستجو نے پہنچایا۔

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ دراصل جغرافیہ، تاریخ و ماحول سے پیدا ہونے والے نفسیاتی رجحان کا مطالعہ ہے اور اس لئے گوناگوں دلچسپیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

ماہنامہ

فروغ اردو

لکھنؤ

مدیر اعزازی

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

شائع کردہ

ماہنامہ فروغ اردو

خدا نمبر

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

زرِ سالانہ	قیمت فی کاپی
دس روپے	تین روپے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکٹ کراچی ۳

اور دوسرے صفحہ کے آخری دو پیراگراف یہ ہیں :

"عہدِ قدیم سے عہدِ حاضر تک انسان نے کس کس طرح خدا کا تصور کیا ؛ اس راہ میں اُس نے کتنی ٹھوکریں کھائیں اور پھر کس طرح آہستہ آہستہ وہ کائنات پر چھا گیا، یہ داستان بہت منتشر و طویل ہے لیکن ہے بے انتہا دلچسپ اور انھیں منتشر اجزا کو اس خاص نمبر میں یکجا کیا گیا ہے ۔"

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کا علمی ادبی تنقیدی رسالہ

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

اپریل ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ
دو روپئے
فی پرچہ ۲۵ پیسے

خط و کتابت کا پتہ

(۱) ۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ (ہندوستان)

(۲) مبارک بک ڈپو۔ بندر روڈ
متصل ڈینسو ہال کراچی (پاکستان)

اسی طرح اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے بھی راہیں کھلیں گی مگر ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ کئی ریاستوں میں اردو زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا ہے اور اس کے چلنے کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ڈالی گئی ہیں۔ ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ روش نہ صرف قومی مقاصد کے خلاف ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصہ کی شخصیت کی نشو و نما پوری طرح نہیں ہو سکتی اور نہ یہ طبقہ ملک کی ترقی اور تعمیر میں بھرپور حصہ لے سکتا ہے جس کی وجہ سے پوری قوم کا نقصان ہوتا ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد ہمارے سامنے ہیں اور اگرچہ ہمارے یہ کہنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ اردو کے سلسلے میں جو اعداد و شمار شائع کیے گئے ہیں وہ حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتے لیکن ان اعداد و شمار کے مطابق بھی ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۲،۳۳،۲۳،۰۰۰ ہے جس میں ۷۸ لاکھ اتر پردیش میں اور ۴۱ لاکھ بہار میں ہیں۔

اردو زبان جدید ہندوستانی زبان ہے جو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اس کی ابتدائی تحریریں پندرھویں صدی سے ملتی ہیں اور تقریباً پانچ سو برس سے اس میں بول چال اور تصنیف کا سلسلہ ہے۔ اس زبان کا ایک شاندار ادب ہے جس میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے لوگوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم بھی دی جا چکی ہے۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں یہ آج بھی سمجھی جاتی ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں کے بولنے والوں میں اس کے بولنے والے پانچویں نمبر پر ہیں۔ اس کے

دستخط کرانا ہوگا جس کا مسودہ درج ذیل ہے۔ آسام، گجرات، اڑیسہ اور کیرل کے ناموں کا اعلان بعد میں ہوگا۔ کنوینر صاحبان کو علیحدہ خط بھی جاری کئے گئے ہیں۔ دستخطوں کے بعد ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ایک وفد صدر جمہوریہ سے ملیگا۔

کنوینر صاحبان کے نام یہ ہیں:۔

۱۔	اتر پردیش	آنند نراین ملا	۷۔	دہلی	گوپی ناتھ امن
۲۔	بہار	غلام سرور	۸۔	کشمیر	غلام رسول نازکی
۳۔	بنگال	پرویز شاہدی	۹۔	راجستھان	احترام الدین شاغل
۴۔	آندھرا	مخدوم محی الدین	۱۰۔	میسور	محمود ایاز
۵۔	مہاراشٹر	سکندر علی وجد	۱۱۔	مدراس	عبدالوہاب بخاری
۶۔	پنجاب	جوش ملسیانی	۱۲۔	مدھیہ پردیش	کوثر چاند پوری

اپیل کا مسودہ درج ذیل ہے:۔

ہم اُردو کے مصنف، ادیب اور شاعر قومی یکجہتی جمہوریت کے اعلیٰ مقاصد اور مشترک تہذیب کے نام پر صدر جمہوریہ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اُردو کو جو ہندوستان کی چودہ قومی زبانوں میں ہے اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی کے علاقے میں دستور کی دفعہ ۳۴۷ کی رو سے سرکاری زبان قرار دیں اور دوسری ریاستوں میں بھی جہاں اُردو بولنے والوں کی خاصی تعداد ہو ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دیے جانے کی ہدایت کریں۔ اور اُردو کے چلن میں سہولتیں بہم پہونچائیں۔

آزادی کے بعد ہمارا خیال تھا کہ جس طرح اور قومی زبانوں کو فروغ ہوگا۔

ادبی تراشہ
محمد حسین آزاد

آل احمد سرور

پروفیسر سلیم کے مکان میں دو مرد اور ایک عورت داخل ہوتے ہیں اور آواز دیتے ہیں۔

مردانی آواز۔ ارے بھئی پروفیسر صاحب ہیں؟ دروازہ کھلنے کی آواز۔

پروفیسر۔ کون حامد۔ آؤ اندر آجاؤ۔ یہ تمھارے ساتھ شرما جی کیسے آگئے اور یہ شریمتی جی کون ہیں؟

حامد: بھئی یہ ہیں مس زبیدہ جمال۔ ہمارے کالج میں اردو پڑھاتی ہیں سوچا ذرا یونیورسٹی کے پروفیسروں سے بھی ان کا تعارف کرادیں (آداب عرض کی آواز) سلیم صاحب ہم لوگ ایک جلسے میں گئے تھے۔ حالی کے متعلق ایک مضمون پڑھا گیا تھا۔ جلسہ تو یونہی سا تھا، مگر مس زبیدہ حالی کی بڑی پرستار ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ حالی نے چپ کی داد اور مناجات بیوہ لکھ کر صنف نازک کے حقوق کی اہمیت جتائی تھی۔ (ہلکے قہقہے کی آواز)

سلیم: بھئی آپ لوگ بیٹھئے تو باتیں ہوں۔ (سب بیٹھتے ہیں) سردی ہے چائے منگواؤں۔ گھنٹی بجاتا ہے۔ بھئی ذرا چائے لاؤ۔

ادب نے زندگی کے ہر موڑ کا ساتھ دیا ہے اور اس میں ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، معاشرت اور مزاج کا ہر رنگ ملتا ہے۔ اس نے جنگ آزادی میں بھی ایک ایسا رول ادا کیا ہے جو کسی زبان سے کم نہیں۔ افسوس ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ایک ایسی قومی زبان کو اس کے قدرتی حق سے محروم کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ صدر جمہوریہ ہماری درخواست پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے اور جلد سے جلد دفعہ ۳۴۵ کے تحت اردو کو اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی میں سرکاری زبان قرار دیں گے۔ اور دوسری ریاستوں میں ضروری ہدایتیں دیئے جانے کی بھی ہدایت کریں گے۔

یادگارِ جگر

محمد اسلام ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی نے اس مجموعہ میں جگر مرحوم کے قریب قریب ایسا جملہ کلام فراہم کر دیا ہے جو منتشر صورت میں تھا اور جس کا بیشتر حصہ جگر مرحوم نے قلم زد کر دیا تھا۔ مرتب کی محنت قابل داد ہے اس کتاب کے مطالعہ سے جگر کی شاعری کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ادب کے شیدائیوں کے لیئے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔

کی وجہ سے آپ اُن کے ادبی مرتبے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

شرما:۔ آزاد کا ادبی مرتبہ کیا ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔

سلیم :۔ آپ نے آبِ حیات تو پڑھی ہوگی۔

زبیدہ :۔ وہی آبِ حیات جس کا قصہ اب افسانۂ پارینہ ہو کر رہ گیا ہے۔ (قہقہہ)

سلیم :۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آبِ حیات کا قصہ افسانۂ پارینہ ہو کر رہ گیا ہے اور کتاب ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہے۔ آبِ حیات اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں ایک تاریخی شعور ملتا ہے جس میں اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق لسانیاتی مواد فراہم کیا گیا ہے جس میں شعرا کو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کے خصوصیات علیٰحدہ علیٰحدہ بیان کئے گئے ہیں جن میں شعرا کے حالات اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ماضی کی پرچھائیاں ہمارے سامنے جیتے جاگتے اشخاص کی صورت میں آتی ہیں جس میں شعرا کا نمائندہ انتخاب ہے جس میں تنقید تو نہیں لیکن بہت گہرے اور معنی خیز تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ آبِ حیات کی سیکڑوں لغزشیں مسلم، لیکن کتاب زندۂ جاوید ہے اور اُردو کی بہترین تصانیف میں اس کا شمار یقیناً کرنا چاہیئے۔

شرما :۔ بھئی سلیم صاحب معاف کیجئے گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آزاد آپ کا ہیں۔ (قہقہہ)

حامد :۔ شرما، مذاق نہ کرو۔ سلیم صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں آبِ حیات قطعی غیر فانی ہے۔ مہدی افادی نے ٹھیک کہا تھا "اسکے پڑھنے میں افسانے کا لطف آتا ہے اور وہ بھی افسانۂ یارانِ کہن۔"

شرما۔ معاف کیجئے گا مس جمال آپ کچھ ذرا اسی قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ حالی کے یہاں ہے کیا، وہی اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن۔

زبیدہ جمال۔ جناب میں تو سمجھتی ہوں کہ جدید اُردو شاعری، نثر اور تنقید میں جو کچھ ہے وہ حالی کا طفیل ہے۔ حالی نہ ہوتے تو یہ حال کچھ اور ہوتا۔ نہ اکبر ہوتے نہ اقبال، نہ چکبست، نہ پریم چند۔

حامد:۔ اور نہ یہ ترقی پسند ـــ قہقہے کی آواز

سلیم۔ حالی کی اہمیت میں کسے کلام ہے مگر آپ لوگ عقیدت کے جوش میں انصاف سے کام نہیں لیتے۔ جدید شاعری اور نثر میں اولیت آزاد کی ہے۔

شرما:۔ یہ پروفیسر لوگ بڑے دقیانوسی ہوتے ہیں۔ آزاد کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

زبیدہ:۔ آزاد تو محض انشا پرداز ہیں اور وہ بھی ایک محدود قسم کے۔ ان کا رنگ زندہ رہنے والا ہی نہیں تھا۔ کچھ دنوں حسن نظامی نے ان کی تقلید کی۔ پھر نصیر حسین خیال اور آغا طاہر نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ مگر اس رنگ میں اتنی جان ہی کب تھی کہ موجودہ ادبی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔

سلیم بھئی ادب میں یہ دھڑے بندی اچھی نہیں۔ آپ حالی کو بقا کے دوام کے دربار میں اونچی کرسی دینا چاہتے ہیں، ضرور دیجئے مگر غریب آزاد کو یوں دھکے دے کر محفل سے تو نہ نکالیے۔ آزاد جدید اُردو ادب کے رہنماؤں اور معماروں میں سے ہیں۔ انھوں نے زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کی شاعرانہ نثر

ی دنیا سے اُتار کر گرد و پیش پر نظر ڈالنی سکھائی۔ حالی پر سرسید کا احسان تو سب
مانتے ہیں مگر آزاد کا بھی کم احسان نہیں ہے۔ سرسید کے اثر کے لیے زمین آزاد
نے ہموار کی تھی۔ معلوم نہیں مس جمال مجھے معاف کریں گی یا نہیں عورتیں زود رنج بھی
زیادہ ہوتی ہیں۔

زبیدہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ ہرجائی پن کے قائل ہیں (قہقہہ)۔

سلیم۔ کے لیے ہرجائی ہونا ضروری ہے۔ اسے ہر جوہر کو پرکھنا
چاہیئے۔ اسے ہر تجربے کی قدر و قیمت سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ نقاد کے لئے
تاریخی شعور بہت ضروری ہے۔ آزاد کے رنگ کو آج ہم پسند نہ کریں لیکن
آزاد نے انیسویں صدی کے ادبی رجحانات پر جو اثر ڈالا ہے اسکا اعتراف ضروری
ہے۔ خیر آب حیات کی اہمیت سے تو کون کافر انکار کرے گا لیکن نیرنگ خیال
کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شرما۔ نیرنگ خیال میں خیالی پلاؤ کے سوا اور کیا ہے۔ اور اسکے
تمثیلی رنگ سے تو اُلجھن ہونے لگتی ہے ہمارے نقاد زیادہ تر لکیر کے فقیر ہیں
اور سوچتے نہیں جو پہلے لکھ دیا گیا ہے اسی پر حاشیہ آرائی کرتے رہتے ہیں۔

حامد:۔ تم نے بقا کے دوام کا دربار دیکھنا ہے۔ کیا اندازِ بیان
ہے شبلی بھی جو کسی کو کم خاطر میں لاتے تھے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ آزاد
اردو کے معلی کا ہیرو ہے۔

سلیم:۔ نیرنگ خیال میں دو باتیں قابل ذکر ہیں تمثیل نگاری جس
کی طرف حامد نے اشارہ کیا۔ مگر اس سے زیادہ میرے نزدیک نظم اُردو

زبیدہ۔ تاریخ میں اگر افسانے کا لطف آتا ہے تو یہ تاریخ کی خوبی ہے یا خامی۔

سلیم۔ مس جمال آپ نے بات اچھی کہی۔ آبِ حیات اچھی تاریخ نہیں ہے مگر بہت اچھا تذکرہ ہے۔ آزاد مورخ کے استدلال، غیر جانبداری، گہرائی اور بصیرت کو نہیں پہنچ سکتے۔ وہ مفکر نہیں مصور ہیں۔ وہ مورخ نہیں مرقع نگار ہیں آبِ حیات ایک نگارخانہ ہے، ایک تصویر محل ہے، ایک پکچر ہے۔ میر، سودا، مصحفی، انشا، جرأت، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، انیس، مومن کی تصویریں دیکھئے کیسی زندہ ہیں اور ان کے متعلق ان کے اشارے، لطیفے اور فقرے کیسے دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ آزاد کے یہاں صحت نہ دیکھئے زندگی پر نظر کیجئے۔ آپ ان سے اختلاف کریں گے اور کرنا چاہئے۔ مگر ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

حامد۔ اور ایک آبِ حیات پر کیا موقوف ہے۔ تحقیقی بند، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس، نگارستانِ فارس، دیوانِ ذوق، نظمِ آزاد مکتوباتِ آزاد۔ کیا کوئی معمولی کارنامے ہیں؟

زبیدہ۔ اب آپ کہیں گے کہ اُن کی دیوانگی کی تصنیف سپاک ذہن کی بھی بڑی چیز ہے۔

ثریا۔ خیر یہ دیوانے تو آخر میں ہوئے گمراہ تو ہو گئے۔ لیکن تو شروع سے تھی: ذوق کا اس درجہ پرستار ہونا کسی سمجھدار آدمی کا کام ہے؟

سلیم۔ نہیں میں ان کی شاعری کا تو بالکل قائل نہیں۔ لیکن بڑی بات ہے مثنوی شبِ قدر، زمستان، ابرِ کرم کی اتنی اہمیت ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے اردو شاعری میں حقیقت نگاری کی داغ بیل ڈالی اور شاعروں کو خواب و خیال

اچھا نمونہ آب حیات میں ہے ۔

حامد :۔ بھئی دربار اکبری کو تو آپ بھول گئے ۔ بڑے مزے کی چیز ہے ۔

زبیدہ :۔ کیا کہنے ہیں اس مزے کے ۔ حامد صاحب آپ چاشنی اور چٹخارے والے ادب کے قائل معلوم ہوتے ہیں ۔ اکبر کے دوران حکومت کے واقعات لکھے ہیں اور شوہرت کی بلبلوں اور چمنستان سیاست کے پھولوں کا ذکر ہے اور بندہ آزاد تو ہر جگہ رائے دینے کو موجود ہیں ۔ دربار اکبری کیا ہے منتخب التواریخ کا رد ہے ۔ شاید محسوس نہیں کہ میر، مصحفی، مومن، غالب، ظفر کے ساتھ کیسی بے انصافی کی ہے ۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اپنے استاد پر بھی ہاتھ صاف کر گئے ۔

حامد :۔ کیا کہتی ہیں محترمہ ۔ آزاد نے تو استاد کو عرش پر بٹھا دیا ۔ آپ کہتی ہیں ہاتھ صاف کر گئے ۔

سلیم :۔ بھئی میں مان گیا ۔ ان کی نظر بہت گہری ہے ۔ واقعی دیوان ذوق میں آزاد نے جابجا اصلاح کر دی اور انصاف یہ ہے کہ اچھے اچھے اشعار کا خون کر دیا ۔ آپ محمود شیرانی کا وہ مضمون پڑھیئے جس میں انھوں نے آزاد کی ان اصلاحوں کا ذکر کیا ہے ۔

شرما :۔ اور ظفر بیچارے کو تو بالکل طفل مکتب ثابت کیا ہے کہتے ہیں ظفر کے پاس جو کچھ ہے ذوق کا ہے ۔ اس طرح معروف کو جو اچھے خاصے بزرگ شاعر تھے ۔ اناڑی ٹھیرا دیا ہے بھئی آزاد بڑے گپی آدمی تھے ۔ خوب ہانکتے تھے ۔

اور اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات کی اہمیت ہے۔ اس میں قدیم ادب پر جس طرح تبصرہ کیا گیا ہے اور نئے میلانات کی جو ضرورت جتائی گئی ہے وہ آزاد کی بالغ نظری کا اچھا ثبوت ہے۔ غدر سے پہلے کے ادب پر ایک جملے میں تبصرہ کیا ہے "زبان اردو کا جو سرمایہ ہے وہ شعرا کی بندش کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دوکان سجائی ہے جو کچھ ہے وہ اتنا کہ ہے کہ مبالغوں کے زور سے ٹوٹی اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی ہے" نظم اردو میں ایک جگہ لکھا ہے "بے شک مبالغے کا زور، تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب ہو۔ استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو ہاتھ سے لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے بار طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔ آزاد صاحب نظر تھے انھوں نے ہماری قدیم شاعری کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو سمجھ لیا تھا اور وقت کے تقاضے سے بھی واقف تھے۔ اس لیے اس کی اصلاح ضروری سمجھتے تھے۔ نیرنگ خیال اس پہلو سے میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ ورنہ ان کی مرقع نگاری کا تو سب سے

دفعہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ تھا۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا۔
لیکچر سے ایک دن پہلے وہ آزاد سے ملنے گئے اور اخلاقاً کہا کہ کل میرا لیکچر ہے۔
مجھے جو پڑھنا ہے وہ میرے پاس لکھا ہوا ہے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ بس
کیا تھا آزاد فوراً قلم لے کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ (قہقہہ)

شرما:۔ واہ آزاد اور نذیر احمد کی اصلاح۔ یہ خوب رہی۔

سلیم:۔ بات یہ تھی کہ آزاد خود اپنی تصانیف پر بھی بار بار اصلاح کرتے
تھے۔ قلم سے اصلاح کر چکتے تو بعد میں کاغذ کی چیپیاں لگانا شروع کر دیتے۔ ان
کے ادبی مسودوں پر سات سات چیپیاں ہوتی تھیں۔

حامد۔ ان کا انتقال کب ہوا؟

سلیم:۔ سنہ ۱۹۱۰ میں استّی برس کی عمر پائی۔ تقریباً بیس سال
تک توازن دماغی ٹھیک نہیں رہا، مگر برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ کیا لوگ تھے۔
حامد حسن قادری نے ان کے مرنے کی کیا اچھی تاریخ کہی ہے ؎

کہ از غم خانۂ کون و فساد آزاد شد بیروں

حامد:۔ بھئی میں تو ان کے اسٹائل کا قائل ہوں۔ مہدی افادی کا وہ مضمون
تو آپ لوگوں نے پڑھا ہوگا جو عناصر خمسہ کے نام سے انھوں نے لکھا تھا۔ اس
میں سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد سب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں لیکن
آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنھیں کسی سہارے کی
ضرورت نہیں۔

زبیدہ۔ آزاد کا اسٹائل نثر کا اسٹائل ہی نہیں۔ انھوں نے نثر میں

سلیم :۔ بھئی شبلی کا یہ قول یاد رکھو: "آزاد تحقیق کا مرد میدان نہیں دو چار گپیں بھی ہانک دے تو وہی معلوم ہوں۔"

زبیدہ :۔ اور آخر زمانے میں تو خود ان پر وحی نازل ہوتی تھی۔ روحانیات اور خدا جانے کیسی کیسی خرافات سے شغف تھا۔ (قہقہہ)

حامد :۔ کیوں بھئی ترقی پسندی یہی ہے کہ روحانیات و الٰہیات کو خرافات کہا جائے۔

سلیم :۔ تم لوگوں کی ایک خامی یہ ہے کہ کسی ادیب کے متعلق باتیں کرتے تو اسکی زندگی کے حالات اور اسکے تجربات کو بھول جاتے ہو۔ آزاد جب پیدا ہوئے تو دہلی کی آخری بہار تھی۔ آنکھ کھولی تو ایسے ایسے ادیب اور شاعر اور عالم اور ماہر فن دیکھے کہ مشکل سے ایک عہد میں جمع ہوں۔ ان کے والد سید محمد باقر خود وہاں کے ممتاز شہریوں میں سے تھے۔ اردو اخبار انھوں نے ہی نکالا تھا۔ آزاد دہلی کالج میں داخل ہوئے اور وہاں کے بہترین طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ غدر میں ان کے باپ کو پھانسی ہوئی اور ناکردہ گناہ یہ بیچارے بھیس بدل کر ان کو دیکھنے گئے۔ مگر بات نہ ہو سکی۔ غدر کے بعد برسوں مارے مارے پھرے۔ لاہور میں میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی کی وجہ سے ذرا امن چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ اور اورنٹیل کالج میں پروفیسر ہو گئے موقع ملا تو ایران اور افغانستان کی سیر کر آئے۔ آخر عمر میں لڑکی کے مرنے سے توازن دماغ کھو بیٹھے۔ اس زمانے کے خیالات پر زیادہ سخت تنقید نہیں کرنی چاہیئے۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے ایک لیکچر میں بیان کیا تھا کہ ایک

کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا
، پھر اُبھنے کا رنگ۔ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں
ید تھا، مگر افسوس ہے کہ اسکی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں
ن نقصان پہونچایا اور زبان کو خیالی باتوں بے نقط توہمات کا سوانگ
، یہ رچی ہوئی نثر ہے۔ اس کا لکھنے والا الفاظ کا نبض شناس ہے اور
ری تہذیبی امانت کا وارث۔ آج کل ہم لوگ اپنے تہذیبی سرمائے
بے نیاز ہوگئے ہیں۔ موجودہ انقلابی دور میں لوگوں کے پاس ریاض
یا ریزی کے لیے وقت نہیں سب جلدی میں ہیں۔

آج کل جسے دیکھئے بھوکا ہے۔ طالب علم بھی بھننا اور ڈرنا نہیں چاہتے
ے جلد نگل لینا چاہتے ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر اور چبا چبا کر کھانا کسی کو نہیں آتا۔

شرما:۔ اچھا آپ بیٹھے جگالی کرتے رہیئے۔ ہم تو چلے۔

زبیدہ:۔ ذرا ٹھہرو، بات تو ختم ہو جائے۔ سلیم صاحب آپ نے یہ
ٹھیک کہی۔ آزاد کی نثر واقعی بڑی رچی ہوئی نثر ہے۔ پڑھ کر لطف ضرور
مگر یہ ہر موضوع کے لئے موزوں نہیں۔

سلیم:۔ یہ میں کب کہتا ہوں کہ ہر موضوع کے لیے موزوں ہے۔ یہ تو ہر دور
بھی موزوں نہیں ہے ہمارے زمانے میں بھی ایسی نثر کا سر انجام ہونا ناممکن
ر اسکی کوشش بھی غلط ہے۔ آزاد کے جو مخاطب تھے وہ انکا وارث نے زیر کیے
ے تھے ان کے زمانے میں جب تک شیشے کی صراحی نہ ہو۔ شراب میں تلوار کی
نہ مانی جاتی تھی اب ہم جام جم کے مقابلے میں جام سفالین کی قدر کرنی سیکھ

شاعری کرتے ہیں عجیب بات ہے ان کی شاعری اتنی پھیکی ہے اور ان کی نثر ایسی رنگین۔ دراصل آزاد میں توازن نہ تھا۔ جہاں رنگینی کی گنجائش بلکہ ضرورت ہے وہاں وہ پھیکے اور بے کیف ہیں اور جہاں سادگی اور وضاحت درکار ہے وہاں استعارات اور تشبیہات کی دوکان سجاتے ہیں۔

شرما:۔ دراصل ان کے دل و دماغ میں ایک کشاکش ہے وہ شاعری کے جس رنگ پر اعتراض کرتے ہیں اسی کو اپنی نثر میں برتتے ہیں۔ وہ نئی ضروریات پر زور دیتے ہیں اور نئے تقاضوں کے حامی ہیں، مگر بڑے قدامت پرست اور مردہ پرست ہیں۔ بزرگوں کی پرستش تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

سلیم:۔ دیکھو بزرگوں کی خوبیوں کا احساس رکھنا اور ان کی خامیوں سے بچنا ہی توازن کی پہچان ہے۔ آزاد نے قدیم اردو ادب کی اس بساط کو جو دھندلی سی تھی روشن کر دیا۔ مگر ان کے رنگ کی تقلید کرنی ضروری نہ سمجھی۔ رہی ان کے اسٹائل کی بات تو اس میں ایک لطف بیان ضرور ہے حامد حسن قادری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ "طرحدار ادیب تھے"

آبحیات میں کس مزے سے اردو شاعری میں استعارات کی کثرت پر اعتراض کرتے ہیں۔ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارے اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعار

آدبی تراشے

اصغر گونڈوی (مرحوم)

سلام مچھلی شہری

(دنیا کے اشعار ایسا منظر ہے ایک سنجیدہ آواز میں ذرا رک رک کر پڑھے جائیں)

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغر! نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

اشعار پہ اصغر کے ہے رقص اگر جاں میں   اک موج نسیم آئی کیا باغ مصلے سے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا " یہ ہے جناب اصغر کی شخصیت کی ایک ہلکی سی جھلک جسے شاعر نے خود ہی پیش کیا ہے۔ ویسے اگر مرحوم کی زندگی کے حالات معلوم کئے جائیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن عرصہ سے مستقل طور پر گونڈے میں مقیم تھے جہاں آپ کے والد ایک

گئے ہیں۔ جام جم کا ہم اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے اُسے قومی سرمایہ کا ایک جزو سمجھ کر احترام کریں گے مگر شراب جام سفالین ہی میں پئیں گے۔ محترمہ۔ حالی کے رنگ کو میں بھی نثر کا سب سے صحیح اور مفید رنگ سمجھتا ہوں، مگر اس کے معنے یہ نہیں کہ اُن کے معاصرین کے رنگوں کی اہمیت کو نہ پہچان سکوں۔ ادب ایک بت ہزار شیوہ ہے اور حسن کا سب سے اچھا پہچاننے والا وہ ہے جو اسکے ہر رنگ کو پہچانے، چاہے وہ ایمان کسی پر لائے۔

شرما:- چلیے آپ کی خاطر سے ہم آزاد پر ایمان لے آتے ہیں۔

سلیم:- نہیں میں نے شروع ہی میں کہا تھا، آزاد کی اولیت اور ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ان کی جدت پسندی، اصلاحی کوششیں، لسانی تحقیق اور ادبی مزاج کا اعتراف ضروری ہے۔ اچھی اور بڑی نثر نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی رنگین اور لطیف تحریریں قابل قدر ہیں۔ اُردو میں ادب لطیف سب سے پہلے آزاد کے یہاں ملتا ہے۔ ہم سب اُس شاہراہ پر چل رہے ہیں جو حالی کی ہے، مگر آزاد کا جو سبزہ زار ہے اُس میں کچھ دیر کے لیے تسکین اور لطف کا سامان ہمیشہ پا سکتے ہیں یہی کیا کم ہے؟

سے ذرا ہی پہلے جب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹر ہو کر چلے گئے تھے تو یہ کارخانہ بند ہو گیا تھا لیکن مرحوم کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی۔ اور وہ تمام عمر کشاکشِ روزگار ہی سے دوچار رہے۔

"سرودِ زندگی اور نشاطِ روح" آپ کے دو مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ آپ نے اپنا خاص موضوعِ سخن تغزل ہی کو قرار دیا جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ نازک اور لطیف جذبہ ہے۔

حضرت اصغر کو قدرت کی طرف سے ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس دماغ عطا ہوا تھا اسلئے ان کی نظر عامیانہ جذبات کی سطح سے گزر کر روح انسانی کی ان لطیف حقائق و معارف تک پہونچتی ہے جو در اصل عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔

(پس منظر سے ذیل کا شعر پڑھا جائے)

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

دردِ ہجر اور "لذتِ وصال" سے دور دنیائے شاعری میں اگر اصغر کی بلندیٔ نظر دیکھنی ہو تو ان کی چند غزلوں کا رنگ روپ دیکھئے۔

غزل

نہ یہ شیشہ، نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے — جانِ مستانہ تری نرگسِ مستانہ بنے
پرتوِ رخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گزار — ذرے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے
موجِ صہبا سے بھی بڑھ کر ہوں ہوا کے جھونکے — ابر یوں جھوم کے چھا جائے کہ میخانہ بنے
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال — چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ میخانہ بنے

مدت سے قانون گو کے عہدے پر مامور تھے۔ اصل نام اصغر حسین ہے۔

یکم مارچ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و ترتیب معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسہ میں تعلیم پاکر چھوڑ دیا پھر بھی اتنی استعداد تھی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے تھے یہی حال عربی اور فارسی کا بھی ہے جو کچھ قابلیت پیدا کی وہ ان کی ذاتی مطالعۂ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح الفطرت شخص کو خارجی وسائل کی رہنمائی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ خود اس کی فطرت کی تجلی اس کے دل و دماغ کو منور کرتی رہتی ہے چنانچہ باوجود اس کے حضرت اصغر نے باقاعدہ طور پر علوم و فنون کی تحصیل نہیں کی، ان کی نظر میں علمی اور ادبی حیثیت سے جو وسعت اور لطافت ہے وہ قابلِ رشک ہے۔

شاعری میں بھی حضرت اصغر نے کسی کے سامنے مستقل طور پر زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں۔

اخلاقی حیثیت سے اصغر ایک نہایت قابلِ قدر ہستی تھے باوجود زہد و تصوف کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر بہت زیادہ موجود تھا۔ بادہ تصوف کے بھی خاص طور پر ذوق شناس تھے۔

باوجود لذت شناس تصوف ہونے کے حضرت اصغر دنیاوی تعلقات سے آزاد نہ تھے چنانچہ گونڈہ میں ان کا ایک چشمہ کا کارخانہ تھا۔ عمر کی آخری منزل

سوز و گداز میں بھی حضرتِ اصغر نے اپنی امتیازی خصوصیت کی شان قائم رکھی ہے یعنی محض دردی درد نہیں ہے بلکہ اس میں ذوقِ محبت کی رنگینیاں بھی بھر دی ہیں۔

غزل میں دردِ رنگیں تو نے اصغر بھر دیا ایسا
کہ اس میدان میں روتے رہ گئے نوحہ خواں برسوں

اب ذرا اس "دردِ رنگیں" کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔

غزل

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
ہیں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کُشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
اس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھئے — جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

اصغر کے کلام میں فلسفہ، حکمت، تصوف اور سوز و گداز سب ہی کچھ ہے۔ یہ تو اصغر کے پرستار نا قدین کہتے ہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اصغر کے کلام میں ان خصوصیات کے علاوہ کچھ اور بھی ہے یا نہیں۔ وہ کون سی شے ہے جسے خود اصغر نے "دردِ رنگیں" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بھی سوچنے کو جی چاہتا ہے کہ جگر مرادآبادی جنھیں اصغر ہی سے فیضِ صحبت حاصل تھا، ان کے شعلۂ طور میں جو لپک ہے اگر وہ اصغر کے "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" ہی کی ایک

خاک پروانہ کو برباد نہ کر باد صبا ۔۔۔ یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے
جرعۂ مے تری مستی کی ادا ہو جائے ۔۔۔ موجِ صہبا تری ہر لغزشِ مستانہ بنے
زندہ جو ظرف اٹھا لیں وہ ساغر بن جائے ۔۔۔ جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

جناب اصغر حکیم مومن خاں کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں۔ ان کی شاعری میں حکیم مومن خاں کی اور شگفتی ترکیب غالب، نکتہ آفرینی شیر و شکر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

غزل

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے ۔۔۔ جنت ہے ایک خونِ تمنا کہیں جسے
اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف ۔۔۔ ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود ۔۔۔ میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں ۔۔۔ اتنا اچھال دو کہ ثریا کہیں جسے
شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے ۔۔۔ وہ ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے
اکثر رہا ہے حسنِ حقیقت بھی سامنے ۔۔۔ اک مستقل سراب تمنا کہیں جسے
میری فغانِ درد پہ اس سرو ناز کو ۔۔۔ ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے
اصغر نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر ۔۔۔ رازِ حیات ساغر و مینا کہیں جسے

مرزا احسان نے بڑی پتے کی بات کہی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت اصغر عشق و محبت کی ایک ایک منزل سے واقف ہیں اس لئے وہ جن کیفیات کو ادا کرتے ہیں، وہ خود ان کے دردآشنا قلب پر طاری ہوتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے، تاثیر میں ڈوبا ہوتا ہے۔ لیکن

اور "نشاطِ روح" کی کامیابی مولانا ابوالکلام آزاد کے ان فقروں سے بھی ظاہر ہے۔

لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے میں چونک اٹھا اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا میری تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔

اور اب اس سے پہلے کہ یہ پروگرام ختم ہو ہم اصغر کی ایک غزل اور پیش کرتے ہیں۔

غزل

یہ راز ہے میری زندگی کا — پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا
پھر رشتۂ غم سے چھیڑتے ہیں — اک طرز ہے یہ بھی دلدہی کا
پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں — کھویا ہوا لطف آگہی کا
او نقطۂ بیاں میں چھپنے والے — اب قصد ہے اور خامشی کا
عالم یہ ہے اک سکونِ بیتاب — یا عکس ہے میری خامشی کا
ہاں سینۂ گل کی طرح کر چاک — دے مر کے ثبوت زندگی کا

لے ہے تو پھر دونوں بہ ظاہر مختلف کیوں ہیں؟ سوچنے کو تو ہم جو بھی سوچیں مگر کچھ کہنے کا مجال تو بس ناقدروں ہی کو ہے۔ ہم تو اس وقت اصغر کی زندگی اور ان کے کلام کی ایک جھلک پیش کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ویسے نہ جانے کیوں اصغر کی یہ غزل آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے

غزل

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٰ تمکیں میں ہے مدہوش بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

مجھ خستہ و مہجور کی آنکھیں ہیں ترستی
کب سے تجھے اے سروِ خراماں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

بہر حال بقول اقبال سہیل۔

اگر اصغر گونڈوی کو ایک طرزِ خاص کا موجد کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

اور جیسا کہ سر تیج بہادر سپرو نے کہا تھا۔

حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات شدت اور لطافت بھی ہو۔ شعریت کے رنگین و پرکیف لباس میں پیش کرنا جناب اصغر کی امتیازی خصوصیت ہے۔

محبی عبدالحمید صاحب لکھنوی معروف بہ زائرِ حرم حمید
میرے پرانے رفقا میں اور مخلص قسم کے نیک و پرہیزگار انسان
تھے۔ موت نے جلدی کی اور محبوبِ حقیقی سے جلد واصل باللہ ہوئے
خدائے کریم ان کی مغفرت فرمائے:۔

ع ہمرہاں رفتند و ما ہم می رویم

باقی رہے نام اللہ کا جس کی ذات الاصفات سے نظام کرزمین قائم
ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ نہ بھولنا چاہیئے۔
بدقسمتی سے اکثر مسلمان بھی مادی تصور کے ماتحت ذاتِ پاک کو مانتے
ہیں۔ جو سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ کے منافی ہے

قطعۂ تعزیت عبدالحمید صاحب حمید لکھنوی مرحوم

زائرِ حرم

حمید از جہاں رفت و محمود رفت
ز دنیائے بے بود پرسود رفت

لبش زمزمہ سنج نعت آمدہ
حریم رسالت بمقصود رفت

بریں فرش و زعرش نکہت شنید
خوشا "عبدِ مومن" بہ معبود رفت

فروری ۱۹۶۵ء

احسان نکہت شاہجہانپوری

فارسی زبان کی اہمیت اور ضرورت

محمد شکیل احمد صدیقی ایم اے

اردو اور فارسی زبان کچھ عرصہ سے جس کشمکش کے دور سے گذر رہی ہے اُس کے ذکر کرنے کی چنداں حاجت نہیں تقریباً ہر شخص اس سے واقف ہے۔ آج کل عام طور پر لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اردو اور فارسی سے کیا فائدہ؟ خیر اگر ان زبانوں سے بیگانہ ایسی بات کہتے ہیں تو زیادہ شکایت کی بات یوں نہیں کہ کسی زبان کی خوبی اور اہمیت کا اندازہ وہ لوگ کر بھی کس طرح سکتے ہیں جو اس زبان سے ناآشنا ہوں لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے یگانے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب ہر طرف سے مخالفت کے کلمات کانوں میں پہونچتے ہیں تو ان زبانوں سے دلچسپی رکھنے والوں اور ان زبانوں کے طلباء تک کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اردو اور فارسی زبانیں اپنی اہمیت ختم کر چکی ہیں؟ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ادب کی اہمیت اور اس کے محاسن کو تولنے کی میزان عوام یا جہلاء کی زبان نہیں ہوتی بلکہ علماء اور ماہرین علم و ادب کے دماغ ہوتے ہیں۔ ذرا ان زبانوں کے کسی ماہر سے خواہ وہ کسی مذہب ملت

غزل

سید حرمت الاکرام

ے گئی دل کو جینے کی حرمت لگن — جس کا کوئی مداوا نہیں وہ چبھن

ہلِ محفل کا اتنا بڑھا حسنِ ظن — جل اٹھی گرمیِ شمع سے انجمن

نگ و بو کہتے ہیں جس کو اہلِ چمن — رازِ حسنِ چمن کا ہے وہ پیرہن

رچھ دل کا لئے ہم کہاں تک چلیں — مرحلے دست گئے منزلوں کی تھکن

وں عشق کو کبھی نہ بھی یہ خبر — مجھ سے بڑھ کر ترے غم میں ہے بانکپن

ظمتِ خسروی کا زمانہ گیا — وقت کو چاہیئے جرأتِ کوہکن

ر نو کیا ابھرتے ہی گہنا گیا — صبح ہو بھی گئی اور نہ پھوٹی کرن

م نے صدیوں جلایا ہے اپنا لہو — جگمگاتی ہے تاریخ کی انجمن

ندگی خود نہ بدلی کسی دور میں — زندگی کا بدلتا رہا پیرہن

سکرا کر مرا عزم آگے بڑھا — مسکراتے رہے مجھ پہ دار و رسن

ہے بہت یہ بھی خونِ جگر کا صلہ
مجھ سے حرمت پشیماں نہیں میرا فن

کہ کسی دوسرے پرندہ کی آواز میں نہیں۔ ہندوستان میں اس پرندہ کا وجود نہ ہونے کے باوجود یہاں کے چمنستان شاعری میں اس کو بلند آشیانہ دیا گیا ہے۔ جیسے فارسی زبان کی برکت و نعمت کہا جائے۔ بیچاری اردو شاعری پر یہ الزام ہی ہے کہ وہ گل و بلبل کی داستان کے سوا اور کچھ نہیں جن کے کان زاغ و زغن کی کریہہ آوازوں کے عادی ہوں اُن کو بلبل کے نغمہ میں بیشک کوئی لطف نہ آئے گا لیکن جس نے ایک بار بھی اس دلکش نغمہ کو گوش جاں سے سن لیا وہ دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو جائے گا اسلئے جو گلزار اور چمنستان واقعی میں اس کے نغمات شیریں سے گونجتے ہوں وہاں کا کیا پوچھنا؟ جس ملک کے پرندے ایسی شیریں اور دل آویز بولی رکھتے ہوں وہاں کے انسانوں کی زبان اگر شیریں ترین زبان مانی گئی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں حقائق سے انحراف بھی کہاں تک کیا جا سکتا ہے۔

اس پرندہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کوئل یا پپیہے کی طرح صرف ایک ہی دلفریب نغمہ نہیں جانتا بلکہ اس کو ہزاروں شیریں داستانیں یاد ہیں اسی لئے "ہزار داستان" کہا جاتا ہے گویا کہ یہ پرندہ اپنے ملکی زبان کی بے پناہ وسعتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ آیئے اس کے ثبوت کے لئے شعر و ادب کے گلشن کی سیر کرکے دیکھیں جس میں صد ہا گل رنگیں ایسے کھلے ہوئے ہیں جن کو لازوال خوشبو اور رنگ عطا ہوا ہے جن کی بوقلمونی رشک صد ہزار چمن بنی ہوئی ہے جن کی نکہت و عطر سارے عالم کو معطر کئے ہوئے ہے۔ اور جن کا نکھار سب پر تفوق رکھتا ہے کوئی ان

سے تعلق رکھتا ہو دریافت کر کے دیکھا جائے ساری حقیقت آئینہ ہو جائے گی جو لوگ کسی زبان کی ابجد بھی نہیں جانتے وہ اُس کی اہمیت، اُس کی خوبیاں، اس کی وسعت، اُس کی ہمہ گیری اور اُس کی لطافتوں و نزاکتوں کو کیا سمجھیں لہٰذا میں ان زبانوں کے طلباء سے یہ کہوں گا کہ وہ اس وسوسہ کو دل میں ذرا بھی جگہ نہ دیں کہ اُردو اور فارسی زبانیں اپنی اہمیت گھٹا چکی ہیں اور اس طرح احساس کمتری کا شکار ہونے سے بچیں۔

ان زبانوں کی اہمیت احاطہ تحریر میں لانے کے لیے متعدد دفتر ناکافی ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ یہ کام بھی ان زبانوں کے ماہرین کا ہے فارسی کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے مجھے فارسی زبان کی اہمیت کے بارے میں یہاں پر چند باتیں عرض کرنا ہیں۔

سب سے پہلی چیز جس کو ماہرین لسانیات اور دنیا کے بڑے بڑے ذی علم لوگوں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس زبان کی شیرینی ہے یہ دنیا کی شیریں ترین زبان مانی گئی ہے۔ اس کا لہجہ اس کا انداز اس کی لطافت اور اس کے الفاظ کا ترنم جو قوت سامعہ کو کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈبو دیتا ہے اس قول کا پورا پورا ثبوت ہے۔

بلبل کا نغمہ سارے نغموں میں بہتر مانا گیا ہے اور اس کی نغمہ سرائی کی تعریف تقریباً ہر زبان کی شاعری میں موجود ہے یہاں تک کہ وہ ممالک جہاں یہ پرندہ پایا بھی نہیں جاتا وہاں کے شعر و ادب میں بھی یہ پوری طرح جلوہ گر ہے کیونکہ جو شیرینی اور لطافت اس پرندہ کی آواز میں ہے وہ روئے زمین

باشندے اس وقت سب سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تسلیم کئے جاتے ہیں یہ بھی عجیب لطف ہے کہ فارسی شعراء کے کلام کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کا کام سب سے زیادہ ان ہی لوگوں نے کیا۔

فارسی زبان کی دوسری سب سے اہم خصوصیت علم الاخلاق کا وہ بے پناہ ذخیرہ ہے جس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ ہماری زندگی کے لیے اخلاقی تعلیم کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں اخلاق ہی ہم کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے اور انسان کو انسان بناتا ہے۔ موجودہ دور میں جو ایک عالمگیر کشمکش، بے چینی انتشار اور بے راہ روی پھیلی ہوئی ہے وہ اخلاقی تعلیم سے بیگانگی کا واحد سبب ہے ہمارا ملک ہندوستان علم الاخلاق کا شروع ہی سے بہترین معلم رہا ہے جب مسلمانوں کے ساتھ یہاں فارسی زبان کا بیش بہا خزانہ آیا تو یہ لے اور زیادہ تیز ہو گئی لیکن یورپ کی اندھی تقلید میں یہ اخلاقی نغمہ اب ہمارے یہاں سے بھی دم توڑ رہا ہے اور بداخلاقی کی سیاہی افق عالم پر گہری ہوتی جا رہی ہے جس کا واحد علاج انھیں اخلاقی شمعوں کو پھر سے روشن کرنا ہے۔

فارسی زبان نے ہندوستان میں آکر اپنے گنج ہائے گرانمایہ سے یہاں کی زبانوں بہت کچھ عطا کیا اور انھیں مالا مال کر دیا۔ یہ لسانیات کا ایک اٹل اصول بھی ہے کہ ہر   دوسری تہی دست زبانوں کے دامن کو بھر دیا کرتی ہے اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہاں کی زبانوں پر فارسی زبان نے اپنا اثر نہیں ڈالا اور اپنے الفاظ کے خزانوں کی بارش ان پر نہیں کی۔ پھر معقولیت پسند کو اسے تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہیں کہ ملک محمد جائسی کی پدماوت

میں فردوسی ہے تو کوئی نظامی کوئی سنائی، کوئی عطار کوئی خیام کوئی عارف
کوئی انوری کوئی خاقانی کوئی سعدی کوئی حافظ کوئی جامی کوئی نظیری
کوئی عرفی کوئی طالب کوئی کلیم کوئی قاآنی یہ تو بطور مثال طوالت کے خوف
سے چند نام پیش کئے گئے اور یہ بھی وہ ہیں جنھوں نے عروس شاعری کے
گیسوؤں کو سنوارا جن لوگوں نے نثر کی زلفوں میں شانہ کیا ان کی تعداد
بھی بے شمار ہے۔ قدرت نے اس زبان کے پودے میں کچھ اس قدر زیادہ
قوت نمو رکھی ہے کہ جب ایران سے لاکر ہندوستان میں لگایا گیا تو یہاں
بھی ایسے ایسے نظر فریب اور دل آویز پھول پیدا کئے کہ دیکھنے والے حیرت
میں پڑ جاتے ہیں ان میں سے خسرو، حسن، فیضی، ابوالفضل، غالب اور اقبال
بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

وہ کون سی زبان ہے جو اپنے ادبی خزانوں سے فردوسی، مولانا روم،
عمر خیام، حکیم خاقانی، شیخ سعدی، امیر خسرو، حافظ اور عرفی شیرازی جیسے
دُرہائے شہوار کے مقابل کے موتی پیش کر سکے جن کا ہر ہر شعر اقبال کے الفاظ
میں یہ کیفیت رکھتا ہے ؎

صد نالۂ شبگیرے صد صبح بلاخیزے
صد آہ شرر ریزے یک شعر دلآویزے

ہاں یہ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی ایک یا دو کی ٹکر کا کوئی نکل آئے۔ اگر
ایسا نہ ہوتا تو دوسرے ملک والے کیوں ان کے کلام کو اپنے سینوں سے
لگاتے اور اپنی زبانوں میں کیوں ان کے کلام کے ترجمے کرتے مغربی ملکوں کے

زبان پر اس ملک کا بھی بہت احسان ہے کہ یہاں کی خاک پاک سے ایسے ایسے جوہر قابل اُٹھے جنھوں نے اس زبان کو اپنی آتش نوائی سے "سحن دادی" بنانے میں کافی حصہ لیا جن میں ہندوؤں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے اسکے رُخ زیبا کو حسن ملیح اور نمک زیادہ تر اسی ملک سے عطا ہوا۔

فارسی ادب کا مطالعہ اپنے ملک ہندوستان سے بے انتہا عقیدت و ارادت پیدا کرتا ہے اور دنیا کے تمام دوسرے ممالک میں اس کی اہمیت اور برتری معلوم ہوتی ہے جس کی ایک عمدہ مثال امیر خسرو اور فیضی کا کلام ہے۔ امیر خسرو کو ہندوستان سے والہانہ عشق تھا وہ یہاں کی ایک ایک چیز کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں یہاں کے پھولوں کی خوشبو اور مہک یہاں کے پھلوں کا ذائقہ اور شیرینی یہاں کے موسموں کی خوشگواری یہاں کے رسم و رواج کی خوبی یہاں کے تہواروں کی اہمیت و برتری یہاں کے لوگوں کی ذہانت و فراست یہاں کے سورماؤں کی بہادری، یہاں کے حُسن کی عالم آشوبی یہاں کی عورتوں کا ساری دنیا کی حسیناؤں پر تفوق غرضکہ ہر ہر چیز کو بڑی تفصیل سے ان کے قلم نے جھوم جھوم کر لکھا ہے یہاں کے ذکر میں اُن پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اُن کے جادو نگار قلم نے یہاں کی تصویر بے رنگ میں بھی دلآویز اور دلفریب رنگ بھر دیا ہے اُنھوں نے اس ملک کی معمولی سے معمولی تصویر کے سامنے سارے عالم کے مرقعے رکھ کر تصویر کے ایک ایک خط و خال کا موازنہ ان مرقعوں سے کیا ہے۔ اور اس کی فضیلت و برتری کو دلائل سے ثابت کیا ہے ان کی حقیقت نگاری اس تصویر کو اور زیادہ حسین و دلکش بنا دیتی ہے۔ اس طرح اس ملک کی جتنی اچھی

میں جو سوز اور پریم کی اگن، کبیر اور رحیم کے دوہوں میں جو آفاقیت اور اخلاق درس ہے وہ اسی مقدس زبان کا فیض ہے یہی کہ تلسی داس اور سور داس جو ہندی شاعری کے ستونِ اعظم ہیں اس شیریں زبان کے الفاظ سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

ابھی بات کچھ بہت پرانی نہیں ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی بلا تفریق مذہب و ملت فارسی زبان کے سیکھنے کا بیحد ذوق رہا ہے ہر طالب علم کے لیے فارسی جاننا ضروری تھا کیونکہ علمیت کا معیار یہی زبان سمجھی جاتی تھی اگر کوئی شخص اس زبان سے بالکل نابلد ہوتا تو اس کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں نہ ہوتا تھا یہ جو فارسی کے سلسلہ میں ایک مثل ہم لوگ سنتے چلے آرہے ہیں۔

پڑھیں فارسی بیچیں تیل   دیکھو یہ قدرت کے کھیل

اور جسے مخالفین بطور طنز اور تمسخر استعمال کرتے ہیں اس ذم سے بھی مدح کا پہلو نکلتا ہے اور فارسی کی اہمیت گھٹنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے یعنی قدرت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ فارسی جیسی اعلیٰ اور گرانقدر زبان پڑھنے کے بعد شومئی قسمت سے کسی کو تیل بیچنے کا کام انجام دینا پڑا۔

کسی پڑھے لکھے کا معمولی پیشہ اختیار کرلینا زبان کی اہمیت کو نہیں گھٹاتا خاقانی کا باپ بڑھئی گیری کرتا تھا کیا اس کے قصائد کا جواب کوئی دے سکتا ہے خیام کا آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا کیا اس کی رباعیوں کی کوئی نظیر ہے حافظ نے خمیر سازی کا کام انجام دیا کیا اس کی غزلوں کی مثال کوئی زبان پیش کرسکتی ہے؟

اسلئے جو زبان ہمارے ملک میں کچھ دنوں پہلے تک قابلیت کا واحد معیار سمجھی جاتی رہی ہے اس کی اہمیت سے کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے فارسی

ارسی شعر کسی ایسے کے سامنے پڑھا جائے جو فارسی بالکل نہیں جانتا اور اس خص کو شعر کا مطلب ہندی یا اُردو میں سمجھایا جائے تو معنی کی نزاکت اور خیالات ل رفعت کی وجہ سے وہ بھی جھومنے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ دن بھر کام ا سخت مصروفیت اور محنت شاقہ کے بعد شام کو جب تھکن سے چور ہو کر بستر پہونچا اور خیام، حافظ یا خسرو کے اشعار کا مطالعہ کرنے لگا تو ساری تھکن ور ساری کلفت دور ہو گئی جس کا اندازہ بہت سے لوگوں نے کیا ہوگا۔

غرضکہ جو جو خوبیاں تمام خوباں میں منفرداً پائی جاتی ہیں وہ سب اس نگار میں اکٹھا ہو گئی ہیں۔

تصویریں فارسی ادب میں ملتی ہیں یہاں کی مقامی زبانوں میں بھی
ملیں گی اسوقت جب کہ ہم لوگ دُنیا کے سامنے احساس کمتری
اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ اپنے ملک کی فضیلت اور برتری کو جا
میں اس کے رُخ زیبا کو دیکھیں جس سے احساس کمتری یقیناً فخرا
بدل جاتا ہے ۔

دنیا کی چند ہی زبانیں ایسی ہیں جن کا خزانہ ہر قسم کے جواہ
ان میں فارسی سب سے نمایاں ہے ۔ ہر طرح کے لعل و جواہر اور دُ
میں موجود ہیں اس میں رزم بھی ہے بزم بھی تصوف بھی ہے اخلاق
ستائش بھی فلسفہ و حکمت بھی پند و موعظت بھی اور حسن و عشق
چیز اپنے معراج کمال پر ہے پھر یہ کہ ہر ہر چیز میں وہ ندرت ہیں ا
کہ اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ فردوسی کی رزمیہ شاعری ، نظامی و سعدی
شاعری ، انوری و خاقانی کی مدحیہ شاعری عطار ، سنائی اور
متصوفانہ شاعری خیام ، غالب اور اقبال کی فلسفیانہ شاعری
حافظ خسرو نظیری اور عرفی کی عشقیہ شاعری اس کی روشن مثال .

موجودہ دور میں اس زبان کو سیکھنے کی اہمیت یوں زیادہ بڑھ
اس دور میں ہم دنیا کے ممالک سے بہت زیادہ نزدیک ہو گئے ہیں
آپس میں دوستانہ تعلقات قائم ہوتے جاتے ہیں یہ زبان
بین الاقوامی تعلقات میں بھی معین و مددگار ثابت ہوتی ہے ۔

ایک اور سب سے بڑی خوبی جس کا متعدد بار مجھے خود تجربہ ہوا

"رام جانے بابا کو کبھی نیند بھی آتی ہے یا نہیں!"

"میں تو جب بھی رات کو اٹھتی ہوں، اس بھوت کو گھومتے ہی دیکھتی ہوں"

"نہ جانے کس مٹی کا بنا ہے بڈھا! ایسی ٹانگیں پائی ہیں کہ تھکتی ہی نہیں"

"میں کہتی ہوں بہن، اسے بخار بھی نہیں آتا؟"

"ہاں، جاڑے میں ایک قمیض پہنے جس طرح وہ گھومتا رہتا ہے، کوئی اور ہو تو نمونیا ہو جائے!"

نمونیا؟ — یہ سنتے ہی پاروتی کا دل کانپ اٹھتا اور وہ فوراً ان عورتوں کو جھڑک دیتی "یوں نہ کہو بہن! ایسی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہیئے۔ بھلا بابوجی کسی کا کیا بگاڑتے ہیں؟" "بابوجی!" ان کھنڈروں میں پاروتی کو کئی بار ایک شاندار عمارت نظر آنے لگتی اور ایسے موقعوں پر وہ اکثر یہی کہا کرتی۔ بابوجی ہمارے ناتے دار ہیں۔ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اگر تم نے انھیں ان دنوں دیکھا ہوتا تو آج ان پر اس طرح نہ ہنستیں! ان دنوں کیسا بھرا بھرا شدید اور لال لال چہرہ ہوتا تھا ان کا! اور ابھی چار سال کی بات ہے۔ وہ سوٹ بوٹ پہنا کرتے تھے۔ اور میز کرسی پر کھانا کھاتے تھے۔ بھگوان جانے اب کیا ہو گیا ہے انھیں!" یہ کہتے کہتے پاروتی کی نگاہیں اکثر خلا میں کھو جاتیں۔ چہرے پر درد کی باریک لکیریں سی دوڑنے لگتیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور اس کی ہر سانس گویا پکار پکار کر کہنے لگتا۔ بابوجی! بابوجی!!،

بابوجی، ان تمام باتوں سے بے خبر گلی میں دیوانہ وار ٹہلتا رہتا۔ صرف راتوں کو نہیں، بلکہ دن کے وقت بھی وہ بے کار اور بے فکروں کی طرح گلی ہی میں چکر کاٹتا

دھرتی، پھول، اور تارے

چندر کانت

گلی کی دھندلی روشنی میں وہ اکثر راتوں کو تنہا دیوانہ وار ٹہلتا۔ کبھی گلی کی کچی سڑک پر اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا کبھی گلی کے نکڑ پر، پھولوں کی کیاری کے پاس پہونچ کر پھولوں کو سونگھنے لگتا اور کبھی ٹکٹکی باندھ کر آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگتا۔ تارے، پھول، دھرتی — اسی محور کے گرد وہ تین برس سے گھوم رہا تھا۔

تین برس سے گلی محلے کے لوگ اُسے اسی طرح گلی کی سڑک پر ٹہلتے پھولوں کو سونگھتے، اور تاروں کو تکتے دیکھ رہے تھے۔ اس کی بھیانک شکل وصورت اور الٹی سیدھی حرکتوں کی وجہ سے یوں تو گلی کے سبھی لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ لیکن چند ایک عورتیں اس کے تصور ہی سے کانپ جاتی تھیں۔ کئی ایک جوان لڑکیاں اسے خواب میں دیکھ کر چلا اٹھتی تھیں۔ رات کو جب بچوں کے سونے کا وقت ہوتا اور وہ رو رو کر گھر والوں کو پریشان کرنے لگتے، تو انہیں ڈرا کر سلانے کیلئے مائیں بار بار اسی کا نام لے دیتی تھیں۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ گلی کی عورتیں گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر جب دوپہر کو پاروتی کے آنگن میں جمع ہو جاتیں، تو تنہم کے گھنے سائے میں اکثر اسی کی بات چھڑ جاتی تھی —"

اچانک دیوانہ وار بل کھا کر وہ دو ایک پھولوں کو دھرتی پر مسل ڈالتا۔ پھر تڑپ کر آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتا۔ اور پھر دل میں ایک طوفان سا لئے وہ اسی طرح گلی میں چکر کاٹتے ہوئے پھر مرئی محل بنانے اور بگاڑنے لگتا۔

اُنہی محلوں میں پاروتی کا گھر تھا۔ وہ محل بناتے بناتے جب وہ پاروتی کے گھر کے سامنے پہونچتا تو اس کے پاؤں میں زنجیریں سی پڑ جاتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس سے چلنے پھرنے کی طاقت چھین لی ہو اور مسحور سا وہ لحظہ بھر کیلئے اس گھر کے سامنے ٹھہر جاتا۔ وہ اس مکان کے سلاخ دار دروازے میں سے جھانکتا زور زور سے اپنی ڈاڑھی کے بال نوچتا۔ زور زور سے دھرتی پر پاؤں پٹکتا۔ اور پھر کچھ اس طرح آگے چل دیتا جیسے اس دروازے میں سے جھانک کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ جیسے اس ایک نظر میں اس نے اپنی ساری زندگی کی داستان کہہ ڈالی ہو۔

داستان! — پاروتی اور وہ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ دور کے رشتے دار تو تھے ہی لیکن بچپن کے معصوم کھیلوں نے ان میں ایک اور رشتہ بھی قائم کر دیا تھا۔ وہ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکٹھے جوان ہوئے تھے اور جوانی تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے لیکن ابھی وہ نظریں پوری طرح سیر بھی نہ ہوئی تھیں کہ ماں باپ نے اسے ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ بھیج دیا تھا۔ گاؤں چھوڑنے کے ساتھ ہی اس کے وہ سنہری سپنے، وہ سنہری امیدیں، وہ سنہری تصورات منتشر ہو گئے تھے۔ گو اس کی پاروتی اس سے دور رہ گئی تھی مگر اس دوری نے اسے پاروتی کے ساتھ ایک ایسی زنجیر میں

گلی کی اُس کچی سڑک پر چکر کاٹتے کاٹتے اس کا چہرہ بے نور، اور بے ڈول سا ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے دیئے بجھ سے گئے تھے۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور داڑھی بڑھتے بڑھتے فرش صاف کرنے والے کسی میز پوش کی طرح میلی اور بے ترتیب ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی داڑھی کے لیے خشک بالوں کو نوچتا رہتا۔ اور بال چاہے اکھڑے یا نہ اکھڑے، وہ ہر بار اپنا بایاں ہاتھ زور سے دھرتی کی طرف جھٹک دیتا صرف ہاتھ ہی نہیں۔ بلکہ اس کے پاؤں بھی سڑک پر بکھرے ہوئے کنکروں، اور کوڑے کرکٹ وغیرہ سے ویسا ہی سلوک کرتے رہتے۔ اسے جہاں بھی کوئی چیز پڑی نظر آتی، وہیں وہ زور سے پاؤں کی ٹھوکر لگا دیتا لیکن پاؤں کی ایک ٹھوکر ہی سے اسے تسکین نہ ملتی۔ وہ بھاگ کر پھر اس چیز کو اٹھاتا۔ اس کا ہاتھ خلا میں زور سے ایک چکر کاٹتا۔ اور وہ چیز دور، سامنے والے میدان میں جا گرتی۔ اور چند لمحوں کے لئے وہ وہیں کھڑا اس میدان کی طرف دیکھتا رہتا۔

گلی کی اس کچی سڑک پر چلتے چلتے وہ اپنے کمزور ہاتھوں سے خلا میں تصورات کے غیر   محل بناتا اور بگاڑتا رہتا۔ اس سڑک سے وہ کچھ اس طرح باتیں کرتا، جیسے وہ بے جان سڑک اس کی گہری دوست ہو۔ جیسے وہ سڑک اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ جیسے وہ سڑک اس کی زندگی کے ہر راز سے واقف ہو۔ اور جب دن بھر کی تھکی ماری وہ کچی سڑک بھی سو جاتی، تو گلی کی نکڑ والی پھولوں کی کیاری اس کی تنہائی کا ساتھی بن جاتی وہ پہروں اُن پھولوں کے پاس کھڑا رہتا انہیں یوں دیکھتا رہتا آیا وہ ان پھولوں کی رنگت کو، ان کی خوشبو کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتا ہو۔ وہ کتنی دیر تک ان پھولوں کو اسی طرح دیکھتا رہتا۔ پھر

اچانک دیوانہ وار بل کھا کر وہ دو ایک پھولوں کو دھرتی پر مسل ڈالتا۔ پھر تڑپ کر آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتا۔ اور پھر دل میں ایک طوفان سا لئے وہ اسی طرح گلی میں چکر کاٹتے ہوئے پھر مٹی کے محل بنانے اور بگاڑنے لگتا۔

اُنہی محلوں میں پاروتی کا گھر تھا۔ وہ محل بناتے بناتے جب وہ پاروتی کے گھر کے سامنے پہونچتا تو اس کے پاؤں میں زنجیریں سی پڑ جاتیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس کے چلنے پھرنے کی طاقت چھین لی ہو اور مسحور سا وہ لحظہ بھر کے لئے اس گھر کے سامنے ٹھہر جاتا۔ وہ اس مکان کے سلاخ دار دروازے میں سے جھانکتا زور زور سے اپنی ڈاڑھی کے بال نوچتا۔ زور زور سے دھرتی پر پاؤں پٹکتا۔ اور پھر کچھ اس طرح آگے چل دیتا جیسے اس دروازے میں سے جھانک کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ جیسے اس ایک نظر میں اس نے اپنی ساری زندگی کی داستان کہہ ڈالی ہو۔

داستان! — پاروتی اور وہ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ دور کے رشتے دار تو تھے ہی لیکن بچپن کے معصوم کھیلوں نے ان میں ایک اور رشتہ بھی قائم کر دیا تھا۔ وہ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکٹھے جوان ہوئے تھے اور جوانی تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے لیکن ابھی وہ نظریں پوری طرح سیر بھی نہ ہوئی تھیں کہ ماں باپ نے اسے ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ بھیج دیا تھا۔ گاؤں چھوڑنے کے ساتھ ہی اس کے وہ سنہری سپنے، وہ سنہری امیدیں، وہ سنہری تصورات منتشر ہو گئے تھے۔ گو اس کی پاروتی اس سے دور رہ گئی تھی مگر اس دوری نے اسے پاروتی کے ساتھ ایک ایسی زنجیر میں

گلی کی اُس کچی سڑک پر چکر کاٹتے کاٹتے اس کا چہرہ بے نور، اور بے ڈول سا ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے دیئے بجھ سے گئے تھے جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور داڑھی بڑھتے بڑھتے فرش صاف کرنے والے کسی میز پوش کی طرح میلی اور بے ترتیب ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی داڑھی کے لیے خشک بالوں کو نوچتا رہتا۔ اور بال چاہے اکھڑے یا نہ اکھڑے، وہ ہر بار اپنا بایاں ہاتھ زور سے دھرتی کی طرف جھٹک دیتا صرف ہاتھ ہی نہیں۔ بلکہ اس کے پاؤں بھی سڑک پر بکھرے ہوئے کنکروں، اور کوڑے کرکٹ وغیرہ سے ویسا ہی سلوک کرتے رہتے۔ اسے جہاں بھی کوئی چیز پڑی نظر آتی، وہیں وہ زور سے پاؤں کی ٹھوکر لگا دیتا لیکن پاؤں کی ایک ٹھوکر ہی سے اسے تسکین نہ ملتی۔ وہ بھاگ کر پھر اس چیز کو اٹھاتا۔ اس کا ہاتھ خلا میں زور سے ایک چکر کاٹتا۔ اور وہ چیز دور، سامنے والے میدان میں جا گرتی۔ اور چند لمحوں کے لئے وہ وہیں کھڑا اس میدان کی طرف دیکھتا رہتا۔

گلی کی اس کچی سڑک پر چلتے چلتے وہ اپنے کمزور ہاتھوں سے خلا میں تصورات کے غیر مکمل بناتا اور بگاڑتا رہتا۔ اس سڑک سے وہ کچھ اس طرح باتیں کرتا، جیسے وہ بے جان سڑک اس کی گہری دوست ہو۔ جیسے وہ سڑک اس کے دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ جیسے وہ سڑک اس کی زندگی کے ہر راز سے واقف ہو۔ اور جب دن بھر کی تھکی ماری وہ کچی سڑک بھی سو جاتی، تو گلی کی نکڑ والی پھولوں کی کیاری اس کی تنہائی کا ساتھی بن جاتی وہ پہروں اُن پھولوں کے پاس کھڑا رہتا انہیں یوں دیکھتا رہتا آیا وہ ان پھولوں کی رنگت کو، ان کی خوشبو کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتا ہو۔ وہ کتنی دیر تک ان پھولوں کو اسی طرح دیکھتا رہتا۔ پھر

تھی۔ اور پھر اپنی شدتوں کے ساتھ وہ چنگاری دہک اٹھی تھی ۔۔۔ بیوہ ہو جانے پر پاروتی نے سوچا تھا کہ اگر وہ اپنے لڑکے کو لکھنؤ بھیج دے، تو بابوجی اسے ضرور نوکری دلا دیں گے۔ اس کے لڑکے کو نوکری مل گئی تھی جس سے وہ خود بھی گاؤں چھوڑ کر لکھنؤ چلی آئی تھی۔ اور وہاں بٹیا اسی گلی میں جس میں بابوجی کا گھر تھا ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے تھے۔

محبت کی نئی بساط بچھ گئی تھی۔ اور اس پر ایک نئی بازی لگانے کے لئے پاروتی اور اس کے دل میں وہی پرانی چاہتیں کروٹیں لینے لگی تھیں۔ اگرچہ ان دنوں دونوں کی عمر ڈھل رہی تھی، دونوں کے گھروں میں پوتے پوتیاں کھیلنے لگے تھے، پھر بھی ان کے دلوں میں وہی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ان کے دل اڑنے لگے تھے۔ دلوں میں آرزوئیں تڑپنے لگی تھیں۔ آرزوؤں میں سپنے لہرانے لگے تھے۔ اور جوانی کے بیتے دنوں کی طرح وہ پھر کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔

جب کبھی اُن کا آمنا سامنا ہو جاتا تھا تو اُدھر پاروتی کا گھونگھٹ خود بخود چہرے پر ڈھلک جاتا۔ اور ادھر اس کی نظریں خود بخود دھرتی پر جھک جاتیں۔ بڑھاپے نے ان کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی، جو کبھی تو پاروتی کی نظروں سے غائب ہو جاتی، اور کبھی اُس کی نظروں سے! لیکن وہ دیوار دونوں کی طرف سے ایک ساتھ کبھی نہ گرتی تھی۔ دونوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں وہ بڑھاپے میں اُسی طرح مل جانا چاہتے تھے جس طرح جوانی نے انہیں علیحدہ کیا تھا لیکن بڑھاپا

باندھ دیا تھا جس کی کڑیاں زنگ آلود ہو جانے کے باوجود مضبوط رہی تھیں
پاروتی سے سینکڑوں میل دور ہو جانے پر بھی وہ زندگی کے اداس لمحوں میں
پاروتی کی یادوں سے لگاتار کھیلتا رہا تھا۔

ملازمت ملنے کے ایک سال بعد ہی ماں باپ نے اسے، گرہست
میں دھکیل دیا تھا لیکن بیوی کی آمد بھی اس کے دل سے پاروتی کی یاد کو جدا
نہ کر پائی تھی۔ اس نے دل کی اس دولت کو جوں کا توں سنبھال کر رکھا تھا۔ ہاں
البتہ ماں باپ اور بیوی کے جھوٹے سکھ کے لیے اس نے اس یاد کو اپنے دل کی
گہرائیوں میں چھپا رکھا لیا تھا۔

ازدواجی زندگی کے اس سفر میں اس نے طرح طرح کے مناظر دیکھے تھے۔
بیوی کی رفاقت، بال بچوں کی رونق ۔۔۔ لڑکے لڑکیوں کی بیاہ شادیاں!
اس نے سبھی کچھ دیکھا تھا، لیکن کبھی کسی چیز میں دلچسپی نہ لی تھی وہ سب چیزیں اس
کے لیے ملمع کیے ہوئے پیتل کی مانند تھیں۔ اور وہ "پیتل" اس کی نظر میں کبھی نہ
بچ سکا تھا۔ آہستہ آہستہ لڑکیاں اپنے گھروں میں چلی گئی تھیں۔ لڑکے اپنے
پاؤں پر کھڑے ہو جانے کے بعد باہر ہی رہنے لگے تھے۔ صرف سب سے چھوٹا
لڑکا تھا، جو اسی شہر میں نوکر ہونے کی وجہ سے اس کے پاس رہتا تھا لیکن
اس لڑکے سے بھی اسے اتنی ہی محبت تھی کہ اس سے تو کیا، وہ پوتے پوتیوں سے
بھی کبھی بات نہ کرتا تھا۔ باقی رہی بیوی! سو وہ بے چاری اسی غم میں گھل گھل
کر مر گئی تھی کہ اس سے کبھی کسی نے ہنس کر بات نہ کی!

بیوی کی موت کے بعد بھی اس کے دل میں دبی ہوئی چنگاری بدستور سلگتی رہی

اپنے پوتے سے کہتی "جاؤ ۔ باپوجی تمہیں بلا رہے ہیں ۔ جاؤ، وہ دیکھو ۔ باپوجی کے پاس جاؤ بیٹا! اور وہ نادان بچہ عادت پڑ جانے کی وجہ سے فوراً اس کے پاس چلا جاتا ۔

اگرچہ اس نے اپنے پوتے کو کبھی گود میں نہ لیا تھا لیکن پاروتی کے پوتے کے ساتھ وہ بچہ تک بن جاتا ۔ وہ اسے گود میں لے کر جھولا جھلاتا ۔ اس کی ننھی سی انگلی پکڑ کر اسے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ دوڑاتا ۔ اسے ساتھ لے کر پھولوں کی کیاری کے پاس جا بیٹھتا ۔ وہ اس سے توتلی باتیں کرتا ۔ اسے گانے اور کہانیاں سناتا ۔ اسے لوریاں دیتا ۔ اسے چندا ماما اور تارے دکھاتا ۔ وہ دھرم وتی کے تصور میں کھو کر اس نادان بچے سے اپنے دل کا دکھڑا کہتا رہتا ۔ اور پاروتی اپنے پوتے کو دیکھنے کے بہانے سے بار بار گلی میں آ کر اسے دیکھتی رہتی ۔

اُسے دیکھنے کے اور موقعے پیدا کرنے کے لئے پاروتی اپنی گائے اس کے مکان کے سامنے والے میدان میں باندھ دیتی ۔ اور وہ گرمیوں میں اسی میدان میں کھاٹ ڈال لیتا ۔ صبح سویرے جب پاروتی دودھ دوہنے کو آتی، تو وہ اسی طرح لیٹے ہوئے، نیم باز آنکھوں سے پاروتی کو دیکھ دیکھ کر ارمانوں کے دیئے جلاتا رہتا ۔ پاروتی اسے محوِ خواب سمجھ کر کئی بار لحظہ بھر کے لیے اس کی چارپائی سے اٹک جاتی ۔ کئی بار پاروتی کا ہاتھ اس کے جسم سے ٹکرا جاتا ۔ کئی بار دودھ دوہنے والے مٹکے میں سے پانی کی دو چار بوندیں اس پر گر جاتیں ۔ اور ایسے موقعوں پر کبھی تو پاروتی کے لمس سے اس کے جسم میں ایک آگ سی سلگ اٹھتی ۔ اور کبھی

جوانی کی بہ نسبت کہیں زیادہ کمزور اور بے بس تھا۔

اسی ناکامی میں پاروتی اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا کر رہ گئی تھی کہ وہ دن رات اسی کے خیال میں مستغرق رہنے لگا تھا۔ اور پھر جلد ہی اس خیال نے ایک بھیانک غم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جس سے کھانا، سونا جاگنا چلنا پھرنا، اس کے سبھی طور طریقے بدل گئے تھے۔ یہاں تک کہ اسی تبدیلی میں اس نے سات سو روپے ماہانہ کی ملازمت چھوڑ دی تھی اس نے سب کچھ کر تصورات کی ایک چھوٹی سی دنیا بسالی تھی۔ اس نے پاروتی کی ناکام محبت کو اپنی زندگی کا سہارا بنالیا تھا۔ اور اسی سہارے پر وہ گلی میں دیوانہ وار چکر کاٹنے اور تصورات کے غیر مرئی محل بنانے لگا تھا۔

وہ دن رات تصورات کے غیر مرئی محل بناتا اور بگاڑتا رہتا۔ اسی کیفیت میں جب وہ پاروتی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا تو اندر بیٹھی ہوئی پاروتی کو دیکھ کر اس کے دل میں ہلچل سی مچ جاتی۔ ڈھلی ہوئی عمر، دبلا پتلا بوڑھا جسم چھوٹے چھوٹے کھچڑی بال، سوکھے ہوئے زرد گال۔ موٹی موٹی تھکی ہوئی آنکھیں — پاروتی کو دیکھ کر اس کے دل میں طوفان سے اٹھنے لگتے۔ اور وہ اسی مکان کے سامنے ایک بے نشان سے دائرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ وہ کبھی داڑھی کے بال نوچتا کبھی زور زور سے دھرتی پر پاؤں پٹکتا کبھی خلا میں ہاتھ مارتا — اور پاروتی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتی۔

شام کے وقت جب پاروتی کا لڑکا دفتر سے واپس آتا تو پاروتی اکثر اپنے پوتے کو گود میں لے کر باہر گلی میں چلی آتی۔ اور وہ بابوجی کو گلی میں گھومتے دیکھ کر

وہ کوڑے کرکٹ کو ٹھوکریں لگاتا۔ خلا میں ہاتھ مارتا یہاں تک کہ گلی میں پھر وہی دھندلی روشنی پھیل جاتی اور اس دھندلی روشنی میں وہ کبھی گلی کی اس کبھی سڑک پر ادھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا۔ کبھی گلی کی نکڑ پر پھولوں کے پاس پہونچ کر پھولوں کو سونگھنے لگتا۔ اور کبھی ٹکٹکی باندھ کر آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگتا۔ وہ اسی محور کے گرد گھومتا رہتا اس کی زندگی کا یہی محور تھا — دھرتی، پھول اور تارے۔

ان دو چار بوندوں کی اہرت ورشا سے اس کے دل کی پھلواری پھول اٹھتی۔
پاروتی دودھ دوہ کر واپس چلی جاتی اور وہ گاؤں میں بیتے ہوئے دنوں کے سنہری سپنوں میں کھو جاتا۔ اور جب وہ ان سپنوں سے جاگتا، تو بھوکے شیر کی طرح اٹھ کر گلی میں دیوانہ وار چکر کاٹنا شروع کر دیتا۔

پاروتی بارہا اس کی بہو کے پاس بھی جا بیٹھتی۔ وہ ایسے موقعوں پر کئی بار باپوجی کے ساتھ والے کمرے میں دیوار کے ساتھ کان لگا کر کھڑے دیکھ چکی تھی چنانچہ وہ اکثر اس کی بہو سے کچھ یوں کہا کرتی۔ " شانتا" باپوجی کا اچھی طرح دھیان رکھا کرو۔ بڑھاپے میں بہو بیٹے ہی بڑوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا پن ہوتا ہے بیٹی! تم ان کا خیال نہیں کرو گی تو ان کی کون اپنی بیٹھی ہے!

اپنی! ــ پاروتی کی اس بات میں کچھ ایسا اپنا پن ہوتا کہ پاروتی کے تصور سے اس کا جسم جلنے سا لگتا۔ اسے اپنی تھکی ہوئی، بوڑھی رگوں میں گرم اور جوان لہو دوڑتے ہوئے محسوس ہوتا اور وہ اپنے کمرے میں تیزی سے چکر کاٹنے لگتا۔ لگاتار چکر کاٹتا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر نڈھال سا چارپائی پر گر جاتا اور لیٹے لیٹے کسی دوسری دنیا میں جا پہونچتا۔ وہ دنیا جس میں کوئی اس کی اپنی ہوتی! جس میں وہ کسی کا اپنا ہوتا!! لیکن جلد ہی اس دنیا میں بھی اس کا دل چیخ اٹھتا اور وہ یکایک اٹھ کر پھر باہر گلی میں چلا جاتا۔
پھر وہی گلی ہوتی، اور وہی اس کے چکر! وہی پاروتی کا دروازہ، اور وہی غیر مرئی محل!! وہ پھر اسی طرح ڈاڑھی کے بال نوچتا زمین پر پاؤں پٹکتا گنگنا...

ماہنامہ درگاہ لکھنؤ

کی

عظیم اور ناقابلِ فراموش پیش کش

زائرِ حرم حمید صدیقی نمبر

عہدِ حاضر کے ممتاز اور مقبول ترین نعت گو شاعر زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی مرحوم کی زندگی شخصیت اور ان کے فن پر نامور ادیبوں اور شاعروں کے بصیرت افروز مقالے اور نظمیں زائرِ حرم کے ادبی و تنقیدی مضامین خطوط اور ان کے کلام کا انتخاب۔

ماہنامہ درگاہ کا یہ خاص نمبر مستقل خریداروں کو مفت پیش کیا جائے گا

۱۵ مئی ۱۹۶۵ عیسوی کو حسین کتابت و طباعت اور مختلف تصاویر سے مزین ہو کر منظرِ عام پر آرہا ہے

سالانہ چندہ۔ چار روپیہ

منیجر۔ ماہنامہ درگاہ ۔ ۶۳ قصائی باڑہ ۔ امین آباد لکھنؤ

غزل

انجم قریشی

تبسم سے بجلی گراؤ تو جانیں
دلِ مضطرب کو جلاؤ تو جانیں

نگاہوں سے دامن بچا لو
تصور سے بچ کر بھی جاؤ

قدم راہ میں ڈگمگانے لگے ہیں
ذرا آگے ہمت بڑھاؤ تو جانیں

ابھی خام ہے ذوقِ ر
نگاہوں سے مستی لٹاؤ ت

جفاؤں کی چلتی ہوئی آندھیوں میں
چراغِ محبت جلاؤ تو جانیں

ہوں آنکھوں میں ویرانیاں
تم اس حال میں مسکراؤ

اگر اپنی بزمِ مسرت میں اک دن
تم انجم کو اپنے بلاؤ تو جانیں

ہمارے شائع کردہ مندرجہ ذیل ناول

فرصت کے لمحات میں پڑھ کر دل کی کوفت دور کیجئے

خان محبوب طرزی مرحوم

۱۔ اُلفت 5/50
۲۔ ایک جان تین قالب 4/-
۳۔ آغاز سحر 4/-
۴۔ امین آباد 4/-
۵۔ مجبور 4/50
۶۔ جمیلہ لوائری 4/50
۷۔ شہید محبت بڑھانگہ 4/-
۸۔ دوشیزۂ قاف 5/-
۹۔ دلربا 3/-

طرزی نمبر خان محبوب طرزی کی

۱۰۔ سوانح حیات 2/-
۱۱۔ فریدہ 2/-
۱۲۔ مصنوعی چاند 4/-
۱۳۔ نیا راستہ 3/50
۱۴۔ یاقوتی 3/50
۱۵۔ قیامت صغریٰ 3/-
۱۶۔ نغمۂ کوہسار 4/-

مائل ملیح آبادی

۱۷۔ فلسفی ابن رشد 3/50
۱۸۔ سفر 3/50
۱۹۔ معمار 4/50
۲۰۔ غزنی دروازہ 4/50
۲۱۔ لال قلعہ 6/-
۲۲۔ نوروز 4/50

وحشی محمود آبادی

۲۳۔ سید سالار مسعود غازی
۲۴۔ زینب ساحرہ 3/-

سید علی عباس حسینی

۲۵۔ زینٹوں کا بادشاہ یعنی حکیم بانا (ناول) 3/-
۲۶۔ ہمارا گاؤں 3/-

	عادل رشید			ڈاکٹر اختر اورینوی	
۲۷-	لب بام	5/-	۳۹-	حسرت تعمیر	4/50
۲۸-	موسم گل	6/-		منظر سلیم	
	صالحہ عابد حسین		۴۰-	پھولوں کا انبار	4/50
۲۹-	قطرے سے گہر ہونے تک	7/-		آوارہ	
۳۰-	عذرا	5/-	۴۱-	اپنی موج میں	2/-
	صادق حسین			محمد علی واحدی	
۳۱-	اسپین کی شہزادی	4/50		معہ دیباچہ شوکت تھانوی	
۳۲-	معرکہ روم و یونان	6/-	۴۲-	خبطی	1/50
	جرجی زیدان			قیصر تمکین	
۳۳-	محبوبۂ کربلا	3/50	۴۳-	جگ ہنسائی	2/50
۳۴-	حجاج بن یوسف	4/50		مسیح الحسن رضوی	
	غلام احمد فرقت		۴۴-	چوتھی بہن	2/75
۳۵-	صید و ہدف	2/50		ڈاکٹر اثر بلگرامی	
۳۶-	کف گلفروش	3/-	۴۵-	جادو کی آنکھ جاسوسی ناول	3/50
۳۷-	مزاحیہ شرح دیوان غالب	8/-	۴۶-	صدیقہ بیگم سیوہاروی	
۳۸-	طنز و مزاح کامل	10/-	۴۷-	ٹھیکرے کی مانگ	2/-

ملنے کا پتہ
ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳ - امین آباد پارک لکھنؤ

غالب کے کلام میں الحاقی عناصر

ایک چونکا دینے والی کتاب

غالبیات میں اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب

جسے پڑھے بغیر کوئی بھی غالب کے اصلی اور نقلی کلام میں امتیاز نہیں کر سکتا؟

مشہور محقق

نادم سیتاپوری نے

پہلی بار تحقیقی طور پر اس تمام کلام کو یکجا کر دیا ہے جو تقریباً ایک صدی سے غلط طور پر غالب کے نام سے منسوب و مشہور کر دیا ہے۔ حالانکہ اس الحاقی کلام سے غالب کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں یہ پہلی اور بالکل پہلی کتاب ہے جسے نادم سیتاپوری جیسے محقق نے مضبوط دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

غالبیات کے "مطالعہ کاروں" کو غالب شناسی، غالب فہمی اور غالب پسندی کے صحیح ماحول کی سازگاری پیدا کرنے کیلئے اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے

قیمت :۔ چار روپیہ پچاس پیسے

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت

۱۔	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳/۵۰
۲۔	ایرانی ادب	آفتاب اختر علی تلہری	۰/۷۵
۳۔	امیر خسرو اور اُن کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/۵۰
۴۔	انارکلی	امتیاز علی تاج	۲/۲۵
۵۔	اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدید	پروفیسر کلیم الدین احمد	۵/۰
۶۔	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۳/۰
۷۔	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا لکھنوی	۳/۰
۸۔	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	۱/۵۰
۹۔	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبد الشکور	۴/۰
۱۰۔	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۴/۰
۱۱۔	ادبی نقوش	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵/۰
۱۲۔	اقبال	مرتبہ فروغ اردو	۰/۵۰
۱۳۔	البرامکہ اور اُن کا عروج و زوال	حبیب حسین ایم اے	۲/۰
۱۴۔	انتخاب کلام میر مع مقدمہ	ناظر کاکوروی	۱/۰
۱۵۔	انتخاب مثنوی مولانا روم (فارسی)		۲/۰
۱۶۔	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبد الماجد دریابادی	۳/۰
۱۷۔	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد علوی	۱/۰

شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی یاد میں

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ نے

جگر نمبر (مصوّر)

حصۂ اوّل اور حصۂ دوم

شائع کیا ہے

ریسرچ اسکالر کیلئے یہ انمول تحفہ ہے

جس کو پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے ترتیب دیا۔ جس میں ہندو پاک کے ان مشاہیر ادب نے حصہ لیا ہے جو حضرات جگر مرحوم سے کسی نہ کسی حیثیت سے قربت رکھتے تھے، اسلئے یہ نمبر جگر مرحوم کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے فن پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اسکے علاوہ ان کی حیات و شخصیت ان کے شمائل و خصائل کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ نمبر ادبی دنیا کا انمول تحفہ تسلیم کیا گیا ہے۔

قیمت: حصہ اول چھ روپیہ حصہ دوم ایک روپیہ پچاس پیسے جو حضرات ماہنامہ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہوں وہ یہ انمول تحفہ مع سالانہ چندہ کے نو روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ رقم ادا کرکے حاصل کر سکتے ہیں۔

"مینیجر"

ماہنامہ فروغ اردو۔ لکھنؤ

۳۷	اپنی پہچان (یعنی پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب)	اعجاز احمد فاروقی	۱/۲۵
۳۸	اللہ کے پیارے	امیر حسن نورانی	۰/۵۰
۳۹	ادبی معرکہ نمبر	مرتبہ نقوش اردو	۰/۷۵
۴۰	ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی	عبد الماجد دریابادی	۱/۲۵
۴۱	اسپین کی شہزادی	صادق سردھنوی	۴/۵۰
۴۲	اسپین کا مرد مجاہد	مائل ملیح آبادی	۲/۷۵
۴۳	ایک جان تین قالب	خان محبوب طرزی	۴/۰
۴۴	اُلفت	" " "	۵/۵۰
۴۵	آغاز سحر	" " "	۴/۰
۴۶	امین آباد	" " "	۴/۰
۴۷	اپنی موج میں	آوارہ	۲/۰
۴۸	ایجادوں کی باتیں	مصطفےٰ حسن رضوی	۲/۰
۴۹	اچھی کہانیاں (حصہ اول)	شمس الدین نوری	۰/۲۵
۵۰	" " حصہ دوم	" " "	۰/۳۱
۵۱	" " حصہ سوم	" " "	۰/۴۴
۵۲	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۳/۰

(ب)

۵۳	بابائے اردو عبدالحق	عبد اللطیف اعظمی	۴/۵۰
۵۴	بستان حرم (حمدیہ نعتیہ کلام)	زائر حرم حمید صدیقی	۱/۵۰
۵۵	بڈھا سگھڑ	خان محبوب طرزی	۴/۰

۱۸	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۰
۱۹	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۰/۲۵
۲۰	ایک نادر روزنامچہ	" " "	۲/۵۰
۲۱	ابوالخمر	مجنوں گورکھپوری	۰/۳۷
۲۲	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	۴/۵۰
۲۳	اُردو کی کہانی	سید احتشام حسین	۱/۰
۲۴	ادب پارے حصہ نثر و نظم	" " "	۴/۷۵
۲۵	انتخاب نثر جدید	" " "	۲/۵۰
۲۶	ابوالکلام آزاد (نظم)	جگناتھ آزاد	۰/۲۵
۲۷	۱۹۵۱ء کا بہترین ادب	امداد صابری	۵/۵۰
۲۸	۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا	" "	۶/۹۴
۲۹	ارمغان نثر و نظم	عبدالاحد خان خلیل	۳/۷۵
۳۰	آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	۳/۷۵
۳۱	افسانہ نمبر	مرتبہ فروغ اُردو	۱/۵۰
۳۲	اچھی نظمیں	اخگر مشتاق	۰/۳۱
۳۳	اُردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن، غلام احمد فرقت		۱۰/۰
۳۴	اُردو شاعری	امیر احمد علوی	۱/۵۰
۳۵	آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ اُردو		۱/۲۵
۳۶	انتخاب غزلیات حافظ، صائب، غالب، فارسی		۲/۰

٧٥.	تاجدار مدینہ	اقبال صدیقی	۰/۱۲
٧٦.	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	۳/۰
٧٧.	تلوک چند محروم	جگناتھ آزاد	۴/۰
٧٨.	تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی	۳/۰
٧٩.	تنقیدی جائزے (جدید اڈیشن)	سید احتشام حسین	۳/۵۰
٨٠.	تنقیدی نظریات	" " "	۵/۰
٨١.	تنقید اور عملی تنقید	" " "	۴/۰
٨٢.	تاریخ ادب اردو	عبدالشکور	(زیر طبع)
٨٣.	تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن ۱۹۶۴ء)	آل احمد سرور	۳/۵۰
٨٤.	تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	۲/۵۰
٨٥.	تاریخ ایران	پالکم فارسی	۳/۵۰
	(ٹ)		
٨٦.	ٹیگور	نادم سیتاپوری	۲/۰
٨٧.	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۲/۰
	(ث)		
٨٨.	ثنائے حبیب (نعتیہ کلام)	بہزاد لکھنوی	۱/۷۵

(ج)

٨٩.	جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۰
٩٠.	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء)	(رسالہ فروغ اردو)	۱/۵۰
٩١.	جنگ آزادی نمبر ۲	(" ")	۱/۵۰
٩٢.	جوئے روان (مجموعہ کلام)	حامد اللہ افسر	۲/۵۰
٩٣.	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بگرامی	۳/۵۰

۵۶۔ بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲/۵۰
۵۷۔ دستۂ گل	شبلی نعمانی	۰/۴۰
۵۸۔ باقیاتِ فانی	فانی بدایونی	۳/۰
۵۹۔ بہادر شاہ	امیر احمد علوی کاکوروی	۴/۵۰
۶۰۔ بہشتی ثمر (اول و دوم یعنی خلاصہ بہشتی زیور)	مولانا تھانوی	۲/۷۵
۶۱۔ بانیِ اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ)		۰/۷۵
۶۲۔ بے ساختہ اور بے ضابطہ	وجاہت علی سندیلوی	۲/۷۵
(پ)		
۶۳۔ پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۱/۲۵
۶۴۔ پیاری باتیں	محسن کاکوروی	۰/۱۹
۶۵۔ پتھر کی دیوار	علی سردار جعفری	۴/۵۰
۶۶۔ پھولوں کا انبار (ناول)	منظر سلیم	۴/۵۰
۶۷۔ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ)	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۵۰
۶۸۔ پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۲۵
۶۹۔ پیغام (ناول)	ڈاکٹر طاہر دیالپوری	۳/۰
۷۰۔ پردیسی کے خطوط (حصہ اول)	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
۷۱۔ پنجاب میں اُردو	حافظ محمود شیرانی	۴/۵۰
۷۲۔ تصویرِ درد مع تشریحات و ترجمہ	خلیل احمد علوی	۰/۶۲
۷۳۔ تاریکی جاگ اُٹھے	ڈاکٹر محمد یٰسین	۳/۰
۷۴۔ تعارفِ تاریخ اُردو (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۰

۱۱۲۔	دیوانِ صفی (حصہ اول)	صفی لکھنوی	۳/۰
۱۱۳۔	دہلی کا یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۰
۱۱۴۔	دستۂ گل	شبلی نعمانی	/۴۰
۱۱۵۔	دوشیزۂ قات	خان محبوب طرزی	۵/۰
۱۱۶۔	دلربا	" "	۳/۰
	(ڈ)		
۱۱۷۔	ڈاکٹر نذیر احمد	انوار الحسن	/۳۰
۱۱۸۔	ڈھائی ہفتہ پاکستان میں	عبد الماجد دریابادی	۲/۰
	(ذ)		
۱۱۹۔	ذوقِ ادب و شعور	پروفیسر احتشام حسین	۳/۵۰
۱۲۰۔	ذوقِ جنوں مجموعہ کلام	آل احمد سرور	۳/۵۰
	(ر)		
۱۲۱۔	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۴/۰
۱۲۲۔	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	/۳۰
۱۲۳۔	رخسارِ سحر	انصر کریم قدوائی	/۵۰
۱۲۴۔	روحِ آزاد	یونس خالدی	۲/۰
۱۲۵۔	رفتار (ناول)	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۱۲۶۔	رموزِ حکمت مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۲/۰
۱۲۷۔	ریاضِ فارسی منتخب فارسی کلام		۲/۰
	(ز)		
۱۲۸۔	زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)	مولانا تھانوی	/۵۰
۱۲۹۔	حرفِ آشنا (صفیہ کے خطوط)		۶/۰
۱۳۰۔	زینب ساحرہ	وحشی محمود آبادی	/۷۵
۱۳۱۔	زمیں کا بادشاہ (حکیم بابا، مزاحیہ ناول)	علی عباس حسینی	/۷۵

۹۴۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ)	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹۵۔ جلوے	معین الدین دردائی	۱/۷۵
۹۶۔ جمیلہ بوائری (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۹۷۔ جگر نمبر اول و دوم	سید احتشام حسین	۷/۵۰
(چ)		
۹۸۔ چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۲/۷۵
(ح)		
۹۹۔ حرف آشنا (صفیہ اختر کے خطوط)		۴/۰
۱۰۰۔ حالی بحیثیت شاعر	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۸/۵۰
۱۰۱۔ حسرت موہانی	عبدالشکور	۳/۰
۱۰۲۔ حسرت کبیر	ڈاکٹر اختر اورینوی	۴/۵۰
۱۰۳۔ حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۴/۵۰
(خ)		
۱۰۴۔ خلاصہ شریف زادہ	مرزا رسوا	۱/۰
۱۰۵۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد دریابادی	۲/۷۵
۱۰۶۔ خضر راہ		۰/۵۰
۱۰۷۔ خلاصہ روح تنقید		۱/۰
۱۰۸۔ خلاصہ حیات جاوید		۱/۰
۱۰۹۔ خلاصہ المیزان		۰/۷۵
۱۱۰۔ خبطی (مزاحیہ)	محمد علی واحدی مع مقدمہ شوکت تھانوی	۱/۵۰
(د)		
۱۱۱۔ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ مرزا فارسی)	عبدالاحد خان خلیل	۲/۵۰

۱۴۸۔ شکست کی آواز (ناول) قاضی عبدالستار ۳/۰

۱۴۹۔ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ امیر احمد علوی ۱/۵۰

۱۵۰۔ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم۔ شبلی نعمانی ۲۰/۰

۱۵۱۔ شمع و شاعر علامہ اقبال ۰/۲۵

(ص)

۱۵۲۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۲/۵۰

(ط)

۱۵۳۔ طوفان کی کلیاں کرشن چندر ۴/۲۵

۱۵۴۔ طنزی نمبر (خان محبوب طرزی) (مرتبہ فروغ اردو) ۲/۰

۱۵۵۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ غلام الثقلین ۰/۳۷

۱۵۶۔ طلسم اسرار (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۲۵

۱۵۷۔ طرۂ امیر (امیر مینائی کا منتخب کلام امیر احمد علوی ۱/۵۰

(ع)

۱۶۰۔ عملی تنقید کلیم الدین احمد ۷/۵۰

۱۶۱۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۴/۵۰

۱۶۲۔ عذرا (ناول) صالحہ عابد حسین ۵/۰

۱۶۳۔ عرب ″ مائل ملیح آبادی (زیر طبع)

(غ)

۱۶۴۔ غالب نام آورم غالب کی نادر تحریرات نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۶۵۔ غزنی دروازہ مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۱۶۶۔ غزلیات نظیری ۱/۰

(ف)

۱۶۷۔	فن خطابت (یعنی استاد تقریر)	کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ	۵/۰
۱۶۸۔	فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	۴/۵۰
۱۶۹۔	فریدہ	خان محبوب طرزی	۲/۰
۱۷۰۔	فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۲/۵۰
۱۷۱۔	فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۱۷۲۔	فروغ جام مجموعہ کلام	شور راحدی	۲/۵۰
۱۷۳۔	فغان محسن	محسن کاکوروی	۰/۱۹
۱۷۴۔	فنون لطیفہ اور جمالیات	مظہر حسین	۵/۵۰
۱۷۵۔	فارسی آموز	مشیر احمد علوی	۱/۰

(ق)

۱۷۶۔	قصائد مومن مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
۱۷۷۔	قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۴/۰
۱۷۸۔	قدر و نظر	اختر اورینوی	۴/۰
۱۷۹۔	قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۲/۰
۱۸۰۔	قصائد قاآنی (فارسی)		۰/۷۵
۱۸۱۔	قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	۳/۲۵
۱۸۲۔	قیامت صغریٰ (سائنسی ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۰

(ک)

۱۸۳۔	کف گلفروش (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۳/۰
۱۸۴۔	کائنات تبسم	شوکت تھانوی	۳/۵۰
۱۸۵۔	کعبہ میں صنم خانہ	سلام سندیلوی	۳/۰

۲۰۵	حیاتِ حالی	ڈاکٹر شجاعت سندیلوی	۵۰/
۲۰۶	مطالعۂ حالی	ناظر کاکوروی	۱/۰
۲۰۷	میٹھے بول	"	۱/۲۵
۲۰۸	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۰
۲۰۹	معرکۂ روم و یونان	صادق سردھنوی	۹/۰
۲۱۰	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۲/۰
۲۱۱	مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی اے)	حالی	۱/۲۵
۲۱۲	مرثیۂ غالب	"	۰/۲۵
۲۱۳	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۱۴	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۱۵	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۲۱۶	مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۰
۲۱۷	مسٹر ٹلا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۰/۷۵
۲۱۸	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۱۹	مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو)	محمد شریف	۲/۵۰

(ن)

۲۲۰	نقش حالی اول و دوم	احتشام حسین، نور الحسن، شجاعت علی سندیلوی	۱۱/۰
۲۲۱	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۰
۲۲۲	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/۰
۲۲۳	نغمات الہند مع مقدمہ (اردو)	محمد شریف	۲/۵۰

ستھری اور بامحاورہ زبان زندہ ہے۔

جس طرح اثر صاحب کا کلام ہمارے لئے ایک تبرک ہے اسی طرح ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان کی غزل انہیں کی زبان سے سنیں اور زبان وادا دونوں کا لطف اٹھائیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس نے مٹائے دل سے نقش غلط خودی کے — ٹوٹے غرور سارے ہی نے کچھ درد عاشقی کے
زیب لب یہ اسکے دیکھو اگر تبسم — انداز بھول جاؤ کھلتی ہوئی کلی کے
کس کی پناہ ڈھونڈیں اب کس سے لو لگائیں — مارے ہوئے غموں کے ٹوٹے ہوئے خوشی کے
کل پہلے بھی حسیں تھی اتنے کہاں حسیں تھے — تم نے سکھا دئے ہیں انداز دلبری کے

غزل کے دور کے بعد حسرت لکھنوی۔ آفتاب لکھنوی اور سید عطا حسین نے اپنا مزاحیہ کلام سنایا اور اس طرح قریب چھ بجے یہ کامیاب نشست ختم ہوئی۔

علم و ادب بھی شاید امیروں کا حصہ ہے۔ غریب اس سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق مصائب و اندوہ کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہے۔ اور ان کے افکار کا حسین پودا بارش کرم کی نایابی سے قبل از وقت مرجھا جاتا ہے اس طرح نہ جانے اس سرزمین حیات پر کتنے پودے کھلنے سے پہلے مرجھا جاتے ہیں۔ کتنے چاند ابھرنے سے پہلے ڈوبتے رہتے ہیں۔ کتنے چشمے کے سوتے بہنے سے پہلے سوکھتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور شاید اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک کہ نظام حیات میں تبدیلی نہ پیدا ہو جاتی ہے

افسوس ہے کہ ہم ایسے ادیب و شاعر کے لئے جس کی زندگی مسرت سے بالکل محروم ہے۔ اپنے دل میں کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے یا اردو زبان کی بدقسمتی ہے۔ کل جب کانگریس کی حکومت پہلی بار ہندوستان میں بنی تھی تو صوبہ بہار کی وزارت نے انھیں انعام سے نوازا تھا۔ لیکن آج اسی صوبہ کے ممبران وزارت کثیر تعداد میں زبانی اور قلمی دونوں طور پر اس غیر معروف ادیب و شاعر کی قابلیت کا اعتراف کرنے اور ان کی جسمانی و مادی زندگی پر اظہار افسوس کرنے کے باوجود اسے ضروری نہیں سمجھتے کہ کم از کم اس غریب انسان کو معاشی پریشانیوں سے بے نیاز کر کے اسے قوم و ملک کے لئے مفید خدمت انجام دینے کے قابل بنا دیں۔ کیا اس لئے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے اردو زبان میں ہے اور وہ اسے پسند نہیں کرتے ؟

اگر زندگی کی پریشانیوں سے فرصت مل سکی تو میں آئندہ قارئین

نئی دہلی ۲۵ر اکتوبر۔ وزارت دفاع کے ایک پریس نوٹ میں حکومت ہند کی طرف سے جمعہ ۲۳ر اکتوبر کو انبالہ کے قریب فلائنگ افیسر آر آر کمار کی ہوائی حادثہ کی موت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

ان کے عزیزوں کو اس امر کی اطلاع دے دی گئی ہے۔

کانپور ۲۵ر اکتوبر، مسٹر شبن لال سکسینہ ممبر پارلیمنٹ نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک تار روانہ کیا ہے جس میں انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ لداخ میں چینی حملے سے بہت نازک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس لئے حالات پر غور کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جائے۔

نئی دہلی ۲۵ر اکتوبر۔ آئندہ ۴، ۵، ۶ر اکتوبر کو دہرہ دون کے ٹیکنکل ڈیولپمنٹ اسٹیبلشمنٹ (آلات، سائنسی آلات) پر ایک سمپوزیم منعقد ہو رہا ہے جس کا انتظام وزارت دفاع کی ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے کیا ہے۔

سمپوزیم کا افتتاح ڈیفنس سکریٹری مسٹر او پی ٹارڈی کریں گے اور صدارت کے فرائض وزیر دفاع کے سائنسی مشیر ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری انجام دیں گے۔

اس سمپوزیم کے سلسلے میں ان آلات کی نمائش بھی کی جائے گی جن کی ڈیزائننگ، اصلاح اور تیاری بھارت میں ہوئی ہے۔

جب تک اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نہیں اٹھایا گیا۔

میز پر کہانی کے اوراق جا بجا منتشر پڑے ہوئے تھے جس کو اس نے خونِ جگر دے کے شاداب کیا تھا ــــ جو ایک ادیب کے قلم کا نمونہ تھی جس نے ایک مفلوج دل و دماغ کی انتھک جد و جہد روز انتہائی کاوش سے زندگی پاکر متحرک تھی جیسے وہ تخیلاتی کہانی نہ ہو کسی غمزدہ کی از ابتدا تا آخر داستان ہو ــــ یہ وہ کہانی تھی جس کو ماجد نے مثالی کہانی کا رنگ و روپ بخشا تھا ــــ یہ وہ کہانی تھی جس کے ایک ایک کردار میں تاثرات کا سمندر لہریں مار رہا تھا ــــ یہ وہ کہانی تھی جس کے ہر ہر سطر میں جذبات و احساسات سمو دیئے گئے تھے اس کہانی کا ماجد نے نام رکھا تھا "تاریکیاں" جو خود اس کی زندگی پر بھی بُری طرح مسلط تھیں۔

ماجد کو بیدار کیا گیا تو اس نے چونک کر سب سے پہلی نگاہ اپنی کہانی پر ڈالی اور انھیں یکجا کرکے لفافہ میں بند کیا ساتھ ہی ایک مختصر سا خط بھی لکھ کر اس کے اندر رکھا، پھر پتہ لکھ کر لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے کمرے سے نکلنے لگا ــــ بیوی جو اس کی ہر حرکت و سکون کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، نحیف آواز میں بولی ــــ

"منہ ہاتھ تو دھو لیجئے نیند سے اٹھتے ہی کہاں چل دیئے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا آپ کو" مگر وہ اپنے خیال میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اس نے شاید بیوی کی آواز بھی نہیں سنی اور باہر نکل کر پوسٹ آفس کی طرف لانبے لانبے قدموں سے بڑھنے لگا۔